بسم اللہ الرحمن الرحیم

مذہب شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب قدس سرہ العزیز

مع

تحفہ حسینیہ

علامہ ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ

زمر ۱۸-۱۷

کتابخانه عقیده

www.aqeedeh.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲﴾ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳﴾

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۵﴾

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۶﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ

عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

یہ کتاب، عقیدہ لائبریری

(www.aqeedeh.com)

سے ڈانلوڈ کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہبِ شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب مدظلہ العزیز

مع

تحفۂ حسینیہ

علامہ ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ٥ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہبِ شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب سیالوی قدس سرہ العزیز

و

تحفہ حسینیہ

علامہ ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ○ پاکستان

إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ

جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور ہو گئے مختلف گروہ۔ آپ کا ان سے ذرہ بھی تعلق نہیں ہے

مذہبِ شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب قدس سرہٗ العزیز

مع

تحفہ حسینیہ

حصہ سوم

علامہ ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ۞ پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	تحفہ حسینیہ حصہ سوم
مصنف	علامہ ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی
تعداد	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	فروری 2001ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
قیمت	-/150 روپے
پرنٹرز	LGP لائف گارڈ پرنٹرز، 4۔ٹیپ روڈ، لاہور

ملنے کا پتہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085

فیکس:۔ 042-7238010

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی۔ فون:۔ 021-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ آغاز

بندہ نے حضرت شیخ الاسلام والمسلمین حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی قدس سرہ العزیز کے رسالہ "مذہب شیعہ" کے جواب میں علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب کے رسالہ "تنزیہ الامامیہ" کا مطالعہ کیا تو بہت دُکھ ہوا کہ حضور شیخ الاسلام قدس سرہ کی سنجیدہ ومتین تحریر اور دل کش ودلربا اندازِ بیان اور سراسر خیر خواہی اور بھلائی پر مبنی رسالہ کا جواب بہت غلیظ اور غیر سنجیدہ اندازِ بیان کے ساتھ دیا گیا اور اُن کی ذات بابرکات کو بھی اور اکابرینِ اُمت کو بدکلامی اور بدزبانی کا نشانہ بنایا گیا تو مذہبی اور دینی غیرت اور اپنے پیرِ طریقت اور محسن اسلامیان وعالمیان کی عزت و حرمت اور ان کے ممدوحین ومخدومین اور مخادیم وممادیح عالمِ اسلام مہاجرین و انصار بالعموم اور خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم بالخصوص کی عزت وحرمت اور رفعت و عظمت اور شان ومقام کے تحفظ کے لیے کمرِ ہمت باندھی اور اپنے ان محسنین اور کرم فرماؤں کی رُوحانی توجہ سے صرف دو ماہ سترہ دن کے قلیل عرصہ میں اس قدر ضخیم کتاب لکھ دی، جو تین حصوں میں چھاپنا پڑی، لیکن کُلّ شیئ مرھون باوقاتہ کے تحت تصنیف کتاب کا وقت معین تھا، تو اشاعت کا بھی —— اس لیے تصنیف میں اس قدر جلدی اور سرعت کے باوجود اشاعتِ کتاب بوجوہ بسرعت تمام نہ ہوسکی۔

تاہم حصہ اوّل چار سال بعد چھپ گیا اور اب دوسرا اور تیسرا حصہ پانچ سال بعد منازلِ اشاعت طے کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خیر وخوبی کے ساتھ ان کی اشاعت

پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور ان تمام حصص سے اہل السنّت کو بالخصوص اور تمام اہلِ اسلام کو بالعموم بیش از بیش استفادہ و استفاضہ کی توفیق عطا فرمائے اور شائع کرنے والوں کو اجرِ جمیل اور جزائے جزیل عطا فرمائے اور اس احقر الخلائق کے لیے ذریعۂ نجات و خلاص بنائے اور وسیلۂ جلیلہ سُرخروئی و سرفرازی بھی اور ان مقربینِ بارگاہ ناز کی خدمت میں اس کو شرفِ قبولیت اور پذیرائی سے مشرف فرمائے اور بندہ کو ان کے عنایات و الطاف سے بیش از بیش مُستفیض و مستفید فرمائے آمین ثم آمین!

اظہارِ تشکّر

مجلسِ الدعوۃ الاسلامیہ (پاکستان) کے معزز اراکین اور سرپرست و صدرِ گرامی حضرت خواجہ الحاج الحافظ محمّد حمید الدّین سیالوی مدظلہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ سیال شریف کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے "تحفہ حسینیہ" کے دوسرے اور تیسرے حصّہ کے تاخیرِ اشاعت کو تشویش و اضطراب کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس کارِ خیر کی جلد از جلد تکمیل کے لیے مجلس کی طرف سے حصّہ دوم اور سوم کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا مستحسن فیصلہ فرمایا اور اس اہم دینی اور ملّی فریضہ کی ترویج و تکمیل میں بھرپور تعاون فرمایا۔ اللہ کریم بجاہِ نبی کریم رؤوف و رحیم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم معزز اراکین اور سرپرستِ اعلیٰ کو جزائے جزیل اور اجرِ جمیل سے نوازے۔ آمین ثم آمین یا الٰہ العالمین

احقر الانام خادم العلماء الکرام والمشائخ العظام
سمی حبیب اللہ محمّد اشرف الانام
علیہ افضل الصلوات والسلام

نذرانۂ عقیدت

ببارگاہِ خلفاء اربعہ و آلِ رسول صلی اللہ علیہ وعلیہم وسلّم

شاہنامہ فردوسی

بگفتا پیغمبرے راہ جوئی — دِل از تیرگیہا بدیں آب شوئی
چہ گفت آں خداوندِ تنزیل وحی — خداوند امر و خداوند نہی
کہ خورشید بعد از رسولانِ مہ — نتابید برکس زِ بوبکر بہ
عمر کرد اسلام را آشکار — بیاراست گیتی چوں باغ و بہار
پس از ہر دو آں بود عثمان گزیں — خداوندِ شرم و خداوندِ دیں
چہارم علی بود زوجِ بتول — کہ اُورا بخوبی ستاید رسول

بوستان ـ حضرت سعدی شیرازی

درودِ ملک بر روانِ تو باد — بر اصحاب و بر پیروانِ تو باد
نخستیں ابوبکر پیرِ مُرید — عمر پنجہ بر پیچِ دیوِ مُرید
خردمندِ عثمان شب زندہ دار — چہارم علی شاہ دلدل سوار
خدایا بحقِ بنی فاطمہ — کہ بر ایماں کنی خاتمہ
اگر دعوتم رَد کنی ور قبول — من و دست و دامانِ آلِ رسول

نوٹ: مذکورہ بالا نذرانہ عقیدت سے ایران کے پُرانے مذہب و عقیدہ کا موجودہ مذہب و عقیدہ سے فرق واضح ہو جاتا ہے جو اہل سنّت کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

فہرست مضامین تحفۂ حسینیہ حصہ سوم

حدیثِ منزلت اور شیعی استدلال کا ابطال (رسالہ مذہبِ شیعہ) ۱۳
تتمہ مبحث حدیثِ منزلت (تحفہ حسینیہ) ۱۶
حدیثِ منزلت پر ایراد اور اس کا جواب (محمد حسین ڈھکو) ۲۳
حدیثِ منزلت میں شیعی تاویلات و تسویلات کا ردِ بلیغ ۲۶
توجیہ اوّل، اور اُس کے جوابات ۲۳
توجیہ ثانی، اور اُس کے جوابات ۳۴
توجیہ ثالث، اور اُس کا جواب ۳۴
توجیہ رابع، اور اُس کے جوابات ۳۵
توجیہ خامس، اور اُس کے جوابات ۳۶
شیعہ کے قول و عمل کا تضاد ۳۷
قاعدۂ و ضابطہ سے تمسک کی حقیقت ۳۸
ضابطۂ و قاعدہ کے بیان میں دھوکہ اور فریب کاری ۳۹
مترتب ثمرہ و نتیجہ کا حال ۴۰
کیا ہر جگہ استثناء دلیل عموم ہوتا ہے؟ ۴۲
توجیہ سادس، اور اُس کے جوابات ۴۲
توجیہ سابع، اور اُس کے جوابات ۴۷
شیعی علامہ کا کتب مذہب کے حوالہ جات کے جواب سے عجز ۵۰
شیعہ کے فرقہ کاملیہ کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ کی تکفیر ۵۱
توجیہ ثامن، اور اُس کے جوابات ۵۴

عقیدۂ خلافتِ بلا فصل کے مفاسدِ لازمہ ۵۵
حدیثِ منزلت سے خلافتِ بلا فصل پر استدلال کرنے والا پہلا شخص کون تھا؟ ۵۶
مناظرۂ جھوک دایہ کا اجمالی تذکرہ اور خلافتِ بلا فصل کی انوکھی دلیل ۶۲
شیعہ کے عجیب و غریب تفسیری اقوال اور ان کا ردِ بلیغ ۶۷
علامہ ڈھکو صاحب کی خاموشی ۷۰
تکمیلِ مبحث۔ فضائلِ صحابہ و ردِ تقیہ ۷۰
تتمہ مبحث فضائلِ صحابہ کرام علیہم الرضوان ۷۲
انصار کا افتخار مصطفوی ارشادات کے ساتھ ۷۷
انصار و مہاجرین کے فضائل پر مرتضوی تصدیق ۷۹
محاربین جمل و صفین کے متعلق مرتضوی نظریہ ۸۳
صحابہ کرام علیہم الرضوان کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیوں؟ ۸۵
عبداللہ بن سبا یہودی اور مذہبِ شیعہ کی ابتداء ۸۸
ذکر پدید آمدن مذہبِ رجعت در سال سی و پنجم ہجری ۸۹
عبداللہ بن سبا' اکابرینِ اہل بیت کی نظر میں (رجال کشی) ۹۱
کیا مذہبِ شیعہ عبداللہ بن سبا یہودی کی ایجاد ہے؟ (علامہ ڈھکو کی تحقیق) ۹۶
حقائق و واقعات کا آفتاب آنکھیں بند کر لینے سے غروب نہیں ہو سکتا۔ ۹۷
یہودی سازش کا مرحلہ وار پروگرام ۱۰۰
کیا عبداللہ بن سبا افسانوی شخصیت ہے؟ ۱۰۱
آخر غالی شیعوں کا امام کون ہے؟ ۱۰۳
مجوسی سازش اور فرقہ اسماعیلیہ کی ابتداء ۱۰۷
عبداللہ بن سبا یہودی اور صاحبِ ناسخ التواریخ ۱۱۰

عبداللہ بن سبا یہودی اور عبداللہ مامقانی صاحب تنقیح المقال ۱۱۵

عقیدۂ رجعت کا بانی کون تھا؟ ۱۱۵

کس نظریہ پر اس کے قائلین عقلی و نقلی دلائل قائم نہیں کرتے؟ ۱۱۷

کس کی رجعت کا عقیدہ رکھا جاتا ہے؟ ۱۱۸

یوم الدین اور یوم الجزاء کونسا ہے؟ ۱۱۹

علامہ ڈھکو صاحب کی انوکھی منطق ۱۲۰

کیا مذہب شیعہ کے بانی سید انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں؟ ۱۲۳

مذمت شیعہ بزبان ائمہ کرام علیہم الرضوان ۱۲۵

مذمت شیعہ میں وارد روایات کا جواب (علامہ ڈھکو) ۱۳۰

شیعی تاویلات کا ابطال ۱۳۱

جھوٹے راویوں کا مقصد اصلی کیا تھا؟ ۱۳۳

مثالی شیعہ محدثین کی حالت زار ۱۳۵

شیعی محدثین پر ائمہ کرام کے لعن طعن کی حکمت، بزبان شیعہ ۱۳۶

محدثین شیعہ کا اثر حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی ذات اقدس پر ۱۳۸

قاتلان حسین کون تھے؟ رسالہ مذہب شیعہ ۱۴۳

کیا قاتلان حسین شیعہ تھے؟ (علامہ ڈھکو) ۱۴۵

قاتلان حسین وہی تھے، جنہوں نے بلا کر امداد دینے سے انکار کیا۔ ۱۴۶

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دین کیا تھا؟ ۱۴۷

کوفہ میں شیعہ کی تعداد کتنی تھی؟ نفیس بحث ۱۵۰

واقعۂ کربلا کے بعد شیعہ کی کثرت تعداد ۱۵۸

کیا امام حسین رضی اللہ عنہ سُنّی تھے یا شیعہ؟ ۱۶۱

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسند رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس نے دی؟ ۱۶۶

یزید اور امام حسین رضی اللہ عنہ کا باہمی معاملہ از روئے کتب شیعہ ۱۷۰

ائمہ اہل بیت کی شیعہ سے بیزاری اور برأت کا اظہار۔ رسالہ مذہب شیعہ ۱۷۶

مؤلف کی خیانت مجرمانہ (ڈھکو صاحب کا الزام) ۱۷۸

علامہ ڈھکو کی سینہ زوری اور غلط بیانی ۱۷۸

ائمہ کرام کی دنیا میں ہی شیعہ سے بیزاری ۱۸۲

اہل تشیع دور مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں کہاں تھے؟ ۱۸۴

کیا ائمہ کرام کے خلاف کوئی کافر بھی لب کشائی نہیں کر سکتا؟ ۱۸۵

مسئلہ فدک کی تحقیق - رسالہ مذہب شیعہ ۱۸۷

فدک کے متعلق قابل تنقیح امر کا بیان اور مقبوضات زہراء رضی اللہ عنہا ۱۹۱

صدقات زہراء رضی اللہ عنہا کے مصارف ۱۹۳

بطور منتظم زیادہ موزوں کون تھا؟ ۱۹۴

کیا ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن مصرف نہیں؟ ۱۹۵

یہودی سازش اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی کمال دیانت ۱۹۶

محاصل فدک سے اہل بیت رضی اللہ عنہم کی کفالت کا بیان ۱۹۸

کیا فدک و دیگر اموال فئی ذاتی ملکیت ہو سکتے ہیں؟ ۲۰۱

کیا وراثت انبیاء علیہم السلام کا شرعی حکم حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو معلوم نہیں تھا؟ ۲۰۲

مروت کا تقاضا کیا تھا؟ ابن ابی الحدید کا سوال ۲۰۵

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی مروت اور اخلاص کا بیان اور
عمل زہراء اور عمل مرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے اس کی تصدیق و تائید ۲۰۷

فدک کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی سخاوت ۲۱۳

شیعی روایات و اقوال میں تعارض ہی تعارض ۲۱۷

کیا ابن ابی الحدید کا سوال لاجواب تھا؟ اور مزید تائیدات ۲۱۸

از حضرت زید بن زین العابدین و امام محمد باقر رضی اللہ عنہما ۲۱۹

مسئلہ فدک کا اجمالی بیان (علامہ ڈھکو صاحب) ۲۲۱

شیعی جوابات کا رد (تحفہ حسینیہ) ۲۲۳

کیا فدک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حضرت زہرا کو ہبہ کیا گیا تھا؟ ۲۲۷

شیعہ کے دعوائے ہبہ کا ردِ بلیغ ۲۳۰

فدک کس کے سامنے ہبہ کیا گیا تھا؟ ۲۳۳

ہبۂ فدک کی شیعی دلیل اور اس کی حقیقت ۲۳۶

فدک پر عرصہ سے قابض ہونے کے باوجود نصابِ شہادت پورا کیوں نہ ہوا؟ ۲۴۴

کیا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے ہبہ سے عدول کر کے وراثت کا دعویٰ کیا؟ ۲۵۱

ملکیتِ فدک وغیرہ کی حقیقت کا بیان اور غلط فہمی کی بنیاد کا ازالہ ۲۵۲

عدمِ توریث والی حدیث پر اجماع کا بیان ۲۶۳

حضرت علی کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما سے معاملہ فدک میں موافقت اور علماء شیعہ کا اضطراب ۲۶۸

ابن بابویہ قمی کی تاویل اور اس کی لغویت ۲۶۸

سید مرتضیٰ کی توجیہ اور اس کی لغویت ۲۷۰

قاضی نور اللہ شوستری کی توجیہ اول اور اس کی لغویت ۲۷۲

〃 〃 〃 کی توجیہ دوم اور اس کی لغویت ۲۷۳

〃 〃 〃 کی توجیہ سوم اور اس کی لغویت ۲۷۴

〃 〃 〃 کی توجیہ چہارم اور اس کی لغویت ۲۷۵

ہبہ اور وراثت کے دعاوی میں سے مقدم کونسا تھا؟ ۲۷۶

ہبۂ فدک کا بطلان تعلیماتِ نبویہ اور اسوۂ مصطفویہ کی رو سے ۲۷۹

علامہ ڈھکو صاحب کا چھٹا جواب اور اس کا رد ۲۸۲

کیا حضرت ابوبکر نے حضرت زہرا (رضی اللہ عنہا) کو ناراض کیا۔ ساتویں جواب کا ردِ بلیغ ۲۸۳

حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی رضامندی کے لیے شیخین کی مساعی جمیلہ ۲۸۷

حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رضامندی ۲۹۰

حضرت زہرا کی حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہما) پر ناراضگی ۲۹۶

علمائے شیعہ کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو موردِ الزام ٹھہرانا ۳۰۰

حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی شکایت کا عند اللہ و عند الرسول ناقابلِ اعتبار قرار پانا ۳۰۴

صاحب ناسخ التواریخ کا اضطراب اور روایت کے رد و قبول سے عجز ۳۰۶

حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کے مزید حوالہ جات ۳۰۹

حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ ۳۱۴

علامہ ڈھکو صاحب کی خیانت ۳۱۹

حضرت صدیق کا حضرت زہرا (رضی اللہ عنہا) کا نمازِ جنازہ پڑھانا ۳۲۲

ادائیگیٔ نمازِ جنازہ کے وجوہ ترجیح ۲۲۴

ابن شہاب زہری کی روایات کی حیثیت۔ رسالہ مذہبِ شیعہ ۳۳۱

زہری کو شیعہ ثابت کر کے گلوخلاصی ممکن نہیں (علامہ ڈھکو) ۳۳۵

معاملہ ابن شہاب زہری کا از روئے رد و قبول ۳۳۶

سوالات علامہ ڈھکو صاحب کے اور جوابات ہمارے ۳۳۸

مضحکہ خیزیات (شیخ الاسلام کی یا علامہ ڈھکو صاحب کی) ۳۴۶

زہری کا عقیدہ از روئے روایاتِ اہلِ تشیع ۳۴۹

نمازِ جنازہ کی چار تکبیرات کا ثبوت (رسالہ مذہبِ شیعہ) ۳۵۱
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منافقین پر چار تکبیریں کہتے تھے (علامہ ڈھکو) ۳۵۳
علامہ ڈھکو کا اپنے مذہب کے دفاع سے عجزِ کامل ۳۵۴
عند الشیعہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت حکمِ باری تعالیٰ ۳۵۶
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقین پر نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کا ثبوت ۳۵۷
علامہ ڈھکو صاحب کی مخالفتِ اجماع ۳۵۹
اہل بیت کرام پر بہتانِ عظیم ۳۶۰
چار تکبیرات والی روایت کی صحیح توجیہ وتاویل ۳۶۲
حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے چار تکبیرات کو نافذ کرنے کا مطلب ۳۶۲
تکبیراتِ جنازہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کرام کا طرزِ عمل کیا تھا؟ ۳۶۴
ائمہ اہل بیت کا اولاد امجاد کے نام خلفاء راشدین کے مقدس ناموں پر رکھنا (رسالہ مذہب شیعہ) ۳۶۶
منافقین کے اسماء سے موسوم لوگوں کے ساتھ شیعہ کا سلوک ۳۶۸
بعض ناموں کی بحث۔ علامہ ڈھکو کی جوابی کارروائی ۳۷۰
علامہ ڈھکو صاحب کی ائمہ اہل بیت کے حق میں دریدہ ذہنی ۳۷۰
مؤلف رسالہ مذہبِ شیعہ کا لطیفہ یا کثیفہ (علامہ ڈھکو) ۳۷۷
عادتِ معروفہ کا انکار، صرف تقیہ کے پردہ میں ہی ہو سکتا ہے ۳۷۸
ناموں میں کچھ رکھا ہے یا نہیں؟ حقائق وواقعات کیا ہیں؟ ۳۸۱
ابولؤلؤ مجوسی کا عرس اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی توہین ۳۸۲
اہل تشیع کے سادات کرام کے ساتھ ادب ونیاز کا نمونہ
انہیں کتوں سے بدتر اور غیر ثابت النسب قرار دینا ۳۸۶
اہل السنت سادات کرام کو اولادِ ابلیس قرار دینا (العیاذ باللہ) ۳۸۹
فسقِ سادات کا اقرار د آیۂ تطہیر میں داخل کرنے سے انکار ۳۹۶

رسالہ مذہب شیعہ — از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حدیث منزلت اور شیعی استدلال کا ابطال

علیٰ ہذا القیاس حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلا فصل پر غزوہ تبوک کی روایت پیش کرنا سخت ناواقفی اور بے خبری کی دلیل ہے۔ یعنی غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمانا

اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ

یعنی اے علی! آپ اس بات پر راضی نہیں کہ جو نسبت حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھی، وہی منزلت آپ کو مجھ سے ہوتی۔

اب اس روایت سے ثابت کرنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلا فصل فرما رہے ہیں، کس قدر بے محل ہے۔ اولاً اس لیے کہ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفے نہ بلا فصل بنے اور نہ بالفصل۔ دیکھو شیعوں کے مجتہد اعظم ملا باقر مجلسی کی کتاب حیات القلوب ص ۳۶۸ اور ناسخ التواریخ اور اولڈ ٹسٹامنٹ (بائیبل) وغیرہ، جہاں صراحۃً موجود ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عین حیات میں فوت ہوئے اور یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ اتہام لگایا کہ انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو قتل کیا ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برأت نازل فرمائی، جس کا ذکر قرآن کریم میں ان کلمات طیبات کے ساتھ کیا گیا ہے:

فبرأہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیھا

پس اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس اتہام سے بری فرمایا جو کہ یہود نے ان کے متعلق باندھا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز اور محترم تھے اور تفسیر صافی

میں جو اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتاب ہے بحوالہ تفسیر مجمع البیان جو شیعوں کے مجتہدِ اعظم کی تصنیف ہے، حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے روایت تصدیق کے لیے ملاحظہ فرماویں۔

عن علی علیہ السلام ان موسٰی وھارون صعدا علی الجبل فمات ھارون فقالت بنوا سرائیل انت قتلتہ۔

یعنی حضرت موسٰی اور حضرت ہارون (علیہما السلام) ایک پہاڑ پر چڑھے پس حضرت ہارون علیہ السلام فوت ہو گئے، تو بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسٰی اتم نے ان کو قتل کیا ہے۔ حیات القلوب میں یہ واقعہ مفصّل موجود ہے۔

تو یہ مشابہت خلافت کے ساتھ قرار دینا کہ جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسٰی علیہ السلام کے خلیفہ تھے، ویسے ہی حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے، انتہا درجہ تعجب انگیز ہے۔ دلیل تو خلافتِ بلافصل پر اس مشابہت کے ذریعے سے لائی گئی مگر اس مشابہت کی وجہ سے مطلقاً خلافت نہ بلافصل اور نہ بالفصل ثابت ہو سکی۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی خارجی منحوس کے کانوں تک اہلِ تشیع کی خلافت بلافصل کے متعلق یہ دلیل نہیں پہنچی، ورنہ اہلِ تشیع حضرات کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ ہٹ دھرمی کی بھی انتہا ہے، جب حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیّدنا حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ کے متعلق ائمہ طاہرین کی سند کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح اور غیر مبہم ارشاد خود اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتابوں سے دکھایا جائے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:

ان ابابکر یلی الخلافۃ من بعدی۔ یعنی میرے بعد ابو بکر خلیفہ ہیں۔ اور اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتاب تفسیر امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ اور تفسیر صافی وغیرہ کی تصریحات پیش کی جائیں گی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد خلیفہ ابو بکر ہیں اور اُن کے بعد عمر۔ اور اہلِ تشیع کی

معتبر ترین کتاب "نہج البلاغہ" سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ان کی خلافت کو تسلیم فرمانا، ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا، ان کے ساتھ مشوروں میں شریک ہونا ثابت کیا جائے اور شیعوں کی معتبر ترین کتاب شافی اور تلخیص الشافی سے ائمہ طاہرین کی روایات کے ساتھ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا یہ ارشادِ گرامی موجود ہو کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما میرے پیارے ہیں، امام الہدٰی ہیں۔ پیشوائے وقت ہیں، ہدایت کے امام ہیں، شیخ الاسلام ہیں اور مولٰی علی کا یہ ارشاد خود ائمہ طاہرین کی سند کے ساتھ پیش کیا جائے کہ حضور کی تمام اُمت سے افضل ابو بکر ہیں اور کتاب کافی سے یہ تصریح پیش کی جائے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ صحابہ سے افضل ہے اور اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتاب تفسیر حسن عسکری اور معانی الاخبار وغیرہ میں یہ تصریحات موجود ہوں کہ ابو بکر بمنزلہ میری آنکھ کے ہیں اور عمر بمنزلہ میرے گوشِ مبارک کے ہیں اور عثمان بمنزلہ میرے دل کے ہیں۔

تو ان روایات کو دیکھ کر اہلِ تشیع کو خلافت کا یقین نہیں ہوتا۔ نہ ہی ائمہ طاہرین کی روایات پر ایمان لاتے نظر آتے ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کی مشابہت سے خلافت ثابت کرنے کی بڑی دُور کی سوجھتی ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت کرنے کا اس قدر شوق ہے، تو پہلے ان کو سچا بھی مانیں، ان کے ارشادات پر ایمان بھی لاویں اور ان کی حدیثوں کو صحیح تسلیم کر لیں۔ ان معصومین کو جھوٹ، مکر و فریب سے پاک اور منزہ یقین کریں تو ہم جانیں کہ اہلِ تشیع کو ائمہ طاہرین معصومین کے ساتھ دلی الفت و محبت ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ مشابہت ایک وقتی طور پر بہت مناسب ہے، جیسے حضرت موسٰی علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام کو طورِ سینا پر جاتے وقت اپنے گھر چھوڑ گئے تھے۔ اسی طرح حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں تشریف لے جاتے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو

مدینہ شریف کی حفاظت کے لیے افسر مقرر فرما گئے تھے، مگر حسب روایت باقر مجلسی کے جیسے کہ حیات القلوب میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف میں رہنا پسند نہ فرمایا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانا اختیار کیا اور شامل سفر باظفر ہوتے۔

مگر سوال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مشابہت حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت کے متعلق موجود ہے یا نہیں ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ نہ بنے فذالک کذالک - یعنی ایسے ہی حضرت علی بھی آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلیفہ بلافصل نہیں ہو سکتے۔

البتہ ہم اہل السنت کے اصول کے مطابق حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چوتھے خلیفہ ہیں اور شیعہ کے دعوائے خلافت بلافصل کا نمونہ آپ دیکھ چکے جو کہ صرف اور صرف تصریحات کے انکار، من گھڑت اور غلط توجیہات پر اصرار کا مجموعہ ہیں جو خلافت بلا فصل کے اثبات سے قاصر ہیں اور چوتھی جگہ بھی خلافت تسلیم کرنے کے منافی گویا کلیتہ خلافت مرتضویہ کو ختم کرنے کے مترادف اور اسی قسم کے دوستوں اور محبوں کے حق میں ہی کہا گیا ہے ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

تحفہ حسینیہ — از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

تتمہ مبحث حدیث منزلت

اقول وعلی توفیقہ اعول - سب سے پہلے مفصل حدیث ملاحظہ فرمائیں، عن مصعب بن سعد عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج الی تبوک فاستخلف علیا قال

أتخلفني في النساء والصبيان قال الا ترضى ان تكون مني بمنزلة هارون من موسى الا انه لا نبي بعدي (بخاری ج ۲ ص ۶۳۳)

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی طرف جہاد کے لیے نکلے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (مدینہ منورہ میں) خلیفہ بنایا۔ انہوں نے عرض کیا، کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہو؟ آپ نے فرمایا، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم مجھ سے اسی مرتبہ پر فائز ہو، جس مرتبہ پر حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فائز تھے، مگر یہ کہ میرے بعد نبی نہیں ہے۔

قابل غور امور: حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے سامنے ہے، اس میں بار بار غور فرمائیں اور دیکھیں کہ آیا اس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت بلافصل کا کوئی قرینہ اور اشارہ موجود ہے؟ اور وجوہ استدلال یعنی عبارت النص، اشارت النص، دلالت النص اور اقتضاء النص میں سے کوئی صورت یہاں بن سکتی ہے؟ یہ صرف اور صرف وقتی اور عارضی خلافت و نیابت تھی اور یہ پہلا موقعہ نہیں تھا کہ ایسی خلافت پر کسی کو مامور کیا گیا ہو، بلکہ جب بھی حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرکز سے کسی اہم مشن پر روانہ ہوتے، تو مرکز کے انتظام و انصرام صلوات خمسہ اور جمعہ وغیرہ کے لیے نائب اور خلیفہ کا ہر حال میں تقرر کیا جاتا۔

نیز خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کے دور حکومت اور ہر مملکت میں یہ رواج رہا ہے اور رہے گا اور جب بھی اصلی حاکم اور صاحب اقتدار و اختیار واپس لوٹتا ہے، تو وہ نیابت و خلافت خود بخود ختم ہو جاتی ہے، لہذا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اس موقعہ پر انتخاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس کو محل نزاع اور مقام اختلاف، یعنی بعد از وصال مصطفوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بلافصل ہونے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

۲- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اگر خلیفہ اور نائب بنتے وقت اس نیابت

کو اہم سمجھا ہوتا اور اس کے مقابلہ میں غزوۂ تبوک میں شمولیت اور جہاد کے لیے روانگی کو غیر اہم سمجھا ہوتا، تو یہ شکوہ کرنے کا قطعًا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں، کیونکہ صورتِ حال واقعی یہی تھی کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معمول کے برعکس بغیر کسی اخفاء اور پردہ داری کے صاف لفظوں میں قیصرِ روم کے خلاف جنگ کی تیاری کا اعلان فرمایا تھا اور ہر ایک صحابی کو اس غزوہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی اور اس غزوہ میں جو شریک نہ ہوئے تھے، وہ معذور لوگ تھے یا نفاق کے ساتھ متہم اور یا وہ تین صحابی، جن کا تذکرہ قول باری تعالیٰ، وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا الآیۃ میں کیا گیا ہے جیسے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو کہ ان تین حضرات میں سے ایک ہیں، فکنت اذا خرجت فی الناس بعد خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فطفت فیہم احزننی انی لا اریٰ الا رجلا مغموصا علیہ بالنفاق او رجلا ممن عذر اللہ من الضعفاء۔ (بخاری ج ۲، ص ۶۳۴)

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ کے لیے نکلنے کے بعد جب میں گھر سے نکلتا اور لوگوں میں پھرتا، تو مجھے یہ بات بہت غمزدہ کرتی تھی کہ میں صرف ان لوگوں کو دیکھتا جو نفاق کے ساتھ متہم تھے یا ان ضعفاء اور معذور لوگوں میں سے کسی کو دیکھتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے معذور اور مستثنیٰ قرار دیا تھا۔

لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ کسی قابلِ ذکر مجاہد کو حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں نہیں چھوڑا تھا۔ ان حالات میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسے بہادر و شجاع، مجاہدِ اسلام اور جاں نثارِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں اکیلے رہنا اور اتنے اہم غزوہ میں شریک نہ ہونا گوارا نہ ہوا، اس لیے عرض کیا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہو، گویا میں بھی ان کی طرح سمجھا جاؤں گا۔ جو میرے لیے اجر و ثواب سے محرومی کے علاوہ میری جرأت و شجاعت اور شانِ حیدری

میں بھی تنقیص و تنقید کا موجب ہے۔ اگر یہ منصبِ نیابت و خلافت نگاہ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں اس قدر اہم تھا جتنا کہ اب اس کو بنا دیا گیا ہے، تو اس شکایت کا کوئی جواز نہیں تھا، اور جب صاحبِ خلافت کو وہ معنیٰ و مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا تو روافض کو کہاں سے اس کا الہام ہو گیا ہے۔

۳۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر طویل المسافت اور اہم غزوہ میں مصروف ہونے اور مدینہ منورہ کے مجاہدینِ اسلام اور شجاعانِ صف شکن سے خالی ہونے کی صورت میں گھروں کی حفاظت علی الخصوص ازواجِ مطہرات اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر اہل بیت کے گھرانوں کی حفاظت نیز جملہ ضروریات کے مہیا کرنے کے لیے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسے ہمہ گیر ہمہ پہلو معتمد علیہ ہستی کے علاوہ کوئی ایسا موزوں شخص نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا انتہائی قریبی اور انتہائی دلیر و شجاع شخصیت کا مرکز میں موجود رہنا ضروری تھا اور آپ کے علاوہ کوئی ایسا موزوں شخص نہیں تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ انتخاب آپ پر پڑی اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس دوران کبھی نماز وغیرہ کی ذمہ داری حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جیسے نابینا اور معذور صحابی کو سونپی تھی، جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ کے تقرر کا بنیادی مقصد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کے گھروں کی نگرانی اور ان کے جملہ ضروریات کا مہیا کرنا تھا نہ کہ خلافتِ مطلقہ کا عطا کرنا۔

۴۔ صورتِ حال واقعی واضح ہونے کے بعد اس کے پس منظر میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ آپ کا ارشادِ گرامی الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لیے تھا اور اس توہم کے منشاء اور بنیاد کو کالعدم کرنے کے لیے تھا کہ آپ کو غیر اہم سمجھ کر عورتوں اور بچوں میں چھوڑا جا رہا ہے نہ کہ تمام امور میں آپ کو حضرت ہارون علیہ السلام کے مماثل اور مشابہ قرار دینا مقصود

تھا اور صرف نبوّت کا امتیاز برقرار رکھتا تھا، کیونکہ حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس پوری قوم بنی اسرائیل کی موجود تھی، جن کے آپ نبی بھی تھے اور موسیٰ علیہ السلام کے نائب کی حیثیت سے شرعی حکمران بھی، جبکہ یہاں محدود اور معدودے چند افراد موجود تھے، جن میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی تھی اور چند معذور مرد تھے یا پھر نفاق کے ساتھ متّہم لوگ اور صرف تین ایسے حضرات جو آجکل کرتے کرتے غزوہ سے رہ گئے اور سُستی و غفلت نے ان کے لیے اس سعادت کے حصول میں رکاوٹ ڈالی۔

لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ صرف دل جوئی اور تسکین دلانے کے لیے آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا اور غیر نبی کے نبی ہونے کا توہّم بھی قابلِ برداشت نہیں تھا اس لیے استثناء کو ضروری خیال فرماتے ہوئے الا انہ لا نبیّ بعدی فرمایا اور اس میں خلافت مطلقہ کا بیان مقصود ہی نہیں تھا۔

۵۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی پر حضرت ہارون علیہ السلام خلیفہ رہے یا وہ خلافت ہی ختم ہو گئی؟ جب وہ خلافت و نیابت ختم ہو گئی اور صرف وزارت اور نبوّت کا منصب رہ گیا، تو اس منسوخ خلافت کے ساتھ تمثیل و تشبیہ سے بھی اور حالات و واقعات سے بھی یہی ثابت ہوا کہ حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت و نیابت بھی حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے پر ختم ہو گئی جیسے کہ جملہ اہلِ جہان پر نائب اور قائم مقام کی یہ حیثیت واضح، اور آشکارا ہے۔

۶۔ علاوہ ازیں اس تشبیہ و تمثیل سے خلافتِ حکومت اس وقت ثابت ہو سکتی تھی، جبکہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی حکومت و سلطنت قائم ہو چکی ہوتی اور آپ کو اقتدار و اختیار اور قدرتِ تصرّف کسی ملک اور علاقہ میں تفویض ہو چکے ہوتے اور جب یہ امر ثابت نہ ہو تو اس تشبیہ و تمثیل سے محل نزاع خلافت یعنی خلافتِ حکومت پر استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ بلکہ اگر ثابت ہوتی ہے،

تو رشد و ہدایت اور تعلیم و تربیت میں نیابت اور امر و نہی اور وعظ و نصیحت والے امور میں خلافت ہی ثابت ہوتی ہے، جس کا محلِ نزاع سے کوئی تعلّق نہیں، جبکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے وقت بھی صحرائے سینائی میں حیرانی و سرگردانی میں مبتلا تھے۔ نہ ان کا کوئی مسکن تھا اور نہ ہی کوئی مُستقل ٹھکانا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: انها محرمة عليهم اربعين سنة يتيهون فی الارض۔ یعنی وہ انعاماتِ باری تعالیٰ کی ناسپاسی اور ناشکر گزاری کی پاداش میں چالیس سال تک بھٹکتے پھریں گے۔ لہٰذا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکومت و سلطنت ثابت نہیں کی جا سکتی، تو حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے بھی خلافتِ حکومت ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ان کے ساتھ تشبیہ کی وجہ سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافتِ حکومت ہی ثابت ہو سکتی ہے۔

۷۔ وہ ہزاروں صحابہ کرام، جن کی تعداد بقول بعض مؤرخین بیس ہزار تھی اور بقول بعض ستر ہزار اور بقولِ بعض ایک لاکھ تھی، وہ سبھی سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر و حکم کے پابند تھے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امر و حکم کے؟ صاف ظاہر ہے اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ سب حضرات صرف حکم نبوی کے پابند تھے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حکم سے باہر تھے، جس طرح خود رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے حکم سے باہر تھے۔ لہذا جب وہ سب مجاہدینِ اسلام اس خلافت کے زیرِ نگیں نہیں تھے، تو وصالِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی اللہ عنہ کی حکومت اس حدیث شریف کی رو سے کیسے ثابت ہو گئی؟ لہذا اس حدیث کی رُو سے اہلِ تشیع کا خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کو فاسد اور باطل قرار دینا لغو و باطل ہو گیا، کیونکہ وہ نہ آپ کی خلافت میں داخل تھے نہ آپ کا ان پر امر و حکم جاری و ساری تھا، بلکہ وہ تو اس وقت بھی صرف اور صرف رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ فرمان تھے اور حضرت

علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حلقۂ اثر اور دائرہ خلافت سے باہر تھے۔

۸- نیز دریافت طلب امر یہ ہے کہ مکہ مکرمہ اور دیگر اطراف واکناف میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور مملکت اسلامیہ کے تمام افراد آپ سے ہدایات اور احکامات حاصل کرنے کے پابند کیے گئے تھے یا نہیں؟ یقیناً ان کو اس امر کا پابند نہیں ٹھہرایا گیا تھا، تو اس نیابتِ مخصوصہ اور خلافتِ محدودہ سے عالمِ اسلام کی خلافتِ مطلقہ پر استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ کیونکہ مدینہ منورہ سے باہر تو اس کا حلقۂ اثر نہیں تھا۔

۹- نیز حدیث منزلت سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کے ابطال کی بجائے اس کی حقانیت واضح ہوتی ہے، کیونکہ جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ کے اعزاز سے نوازا جا رہا تھا۔ اس وقت سفرِ تبوک میں تینوں حضرات یعنی سیدنا ابوبکر صدیق، فاروقِ اعظم اور حضرتِ عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لہذا اگر اس حدیث شریف میں خلافتِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ بھی تسلیم کیا جائے، تو صرف اس وقت خلافت آپ کا حق بنے گی، جب سفرِ آخرت میں وہ تینوں بارگاہِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچ جائیں اور ہوا بھی اسی طرح کہ جب یہ تینوں حضرات اپنا دورِ خلافت پورا کر کے عالمِ جاودانی کو سدھارے اور بارگاہِ نبوی کی حاضری سے بہرہ ور ہو گئے تو اُس وقت خلافت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مل گئی، لہذا یہ حدیث مذہبِ اہل السنت کی اور خلفاء اربعہ کی خلافت کی دلیل ہوئی نہ کہ مذہب اہلِ تشیع کی — لہذا اس حدیث سے انہیں اپنے مذہب پر استدلال کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

۱۰- نیز فرمانِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام، انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ سے خلافتِ مرتضویہ پر استدلال اس صورت میں

درست ہوتا، جب اس جملہ سے ان کو خلیفہ بنایا جاتا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ پہلے بنایا گیا تھا اور جب آپ نے شکایت کا اظہار کیا کہ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہو تو اس کے جواب میں دل جوئی اور تسکین کے لیے آپ نے یہ جملہ زبانِ اقدس پر جاری فرمایا اگر آپ کی طرف سے وہ شکوہ سرزد نہ ہوتا، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ جواب بھی صادر نہ ہوتا تو جو خلافت اس جملہ سے قبل پائی گئی تھی، اس پر اس سے استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے اور اس پر وہ نتیجہ کیونکر مترتب ہو سکتا ہے، جو اہلِ تشیع مترتب کرنا چاہتے ہیں۔

رسالہ تنزیہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

حدیث منزلت پر ایراد اور اس کا جواب

پیر صاحب کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل پر غزوۂ تبوک والی روایت کو پیش کرنا سخت ناواقفی اور بیخبری ہے پیر صاحب کی دیدہ دلیری ہے۔

۱- شاید پیر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے فتوے کی زد صرف شیعانِ علی پر ہی نہیں پڑتی، بلکہ جنابِ امیر کی ذات بابرکات بھی اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے، کیونکہ کتبِ سیر و تواریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دربارِ خلافت میں اپنی خلافتِ حقہ کے ثبوت میں اس حدیثِ منزلت کو بھی پیش فرمایا۔ ینابیع المودت اور الدر المنظم۔

۲- حاضرینِ دربار کا اس کی صحت اور دلالت میں خدشہ نہ کرنا جہاں اس کی صحت کی قطعی دلیل ہے، وہاں اس حدیث کے دلیلِ امامت و خلافت

ہونے کا نا قابلِ انکار ثبوت ہے اور پیر صاحب کے خدشہ کے بے بنیاد ہونے کا روشن بُرہان بھی ہے۔

۳- جہاں تک اس کی صحت و صداقت کا تعلق ہے، اس پر تمام ائمۂ حدیث کا اتفاق ہے علامہ ابن عبد البر "استیعاب" جلد ثانی ص۴۵۹ پر فرماتے ہیں کہ اس کو صحابۂ کرام کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے اور یہ ثابت ترین اور صحیح ترین اخبار و آثار سے ہے۔

۴- جہاں تک اس حدیث کی جنابِ امیر علیہ السّلام کی خلافتِ مطلقہ پر دلالت کا تعلق ہے، وہ بھی روزِ روشن کی طرح واضح و آشکارہ ہے اور شکوک و شبہات سے بے غبار ہے۔

۵- اس مقصد کی مزید توضیح کے لیے یہ چیز ذہن نشین رہے:

(أ) عقلائی قاعدہ ہے کہ کسی مطلب کی عمومیت اور خصوصیت کے لیے ہمیشہ عموم الفاظ اور ان کے خصوص پر نظر کی جاتی ہے۔ نفسِ واقعہ کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا کما قیل، العبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد۔ لہذا یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ ارشاد غزوۂ تبوک کے موقعہ پر فرمایا یا کسی اور موقعہ پر بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں عموم ہے یا نہیں ہے؟

(ب) علمائے عربیت نے تصریح کی ہے کہ اسم جنس مضاف ہو یا معرف باللام ہو تو وہ جمع مضاف کی طرح عمومیت اور استغراق کا فائدہ دیتی ہے اور لفظ منزلت بھی اسم جنس ہے، جو مضاف واقع ہوا ہے، لہذا مفیدِ عموم ہوگا، یعنی سوائے نبوّت اور اس کے خصائص کے دیگر تمام منازل و مراتب میں تجھ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔

(ج) علماءِ کرام نے اس عموم کی صحت کا معیار استثناء کو قرار دیا ہے، یعنی جہاں کلام میں استثناء کرنا صحیح ہوگا، وہاں عموم ہوگا اور یہاں استثناء موجود ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام بنصِ قرآن، "قال لاخیہ ھارون اخلفنی فی

قومی" خلیفہ اور نائب موسیٰ علیہ السلام تھے، لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ اور نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۶- یہ کہنا کہ حضرت ہارون علیہ السّلام، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی زندگی میں وفات پا گئے اور انہیں مسندِ موسوی پر بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لہذا حضرت امیر کو بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) بڑے تھے، لہذا حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو بھی بڑے ہونا چاہیئے۔ یہاں ذاتی تشخصات اور شخصی کیفیات میں کلام نہیں ہے، بلکہ منازل اور مراتب میں کلام ہے، لہذا دیکھنا صرف یہ ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السّلام کے وصال کے وقت حضرت ہارون علیہ السلام موجود ہوتے، تو آپ کے جانشین وہی ہوتے یا کوئی اور؟ ظاہر ہے کہ ہر صاحب عقل و انصاف یہی جواب دے گا کہ جناب ہارون (علیہ السّلام) کی موجودگی میں کسی اور شخص کی خلافت کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا تھا۔

۷- جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے وقت حضرت امیر زندہ اور موجود تھے، لہذا ان کی موجودگی میں کسی اور شخص کی خلافت کا تصور کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

۸- مؤلفِ رسالہ نے ان دو نصوصِ صریحہ و صحیحہ پر غلط سلط طور پر تنقید و تبصرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جناب امیر کی خلافت پر اور کوئی نص موجود نہیں ہے۔ (رسالہ تنزیہہ الامامیہ ص۱۵۳ تا ۱۵۸)۔

تحفۂ حسینیہ   ازابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

حدیثِ منزلت میں شیعی تاویلات وتسویلات کا ردِ بلیغ

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے ارشادات کے جواب میں علامہ ڈھکو صاحب کی تاویلات وتسویلات آپ نے ملاحظہ فرمالیں، اب ان کے جوابات اور وجوہ بطلان ملاحظہ فرمائیں اور خود ہی انصاف کریں کہ آیا اس شیعی استدلال کی کوئی وجہ صحت موجود ہے؟

جواب الاوّل: علامہ صاحب نے فرمایا کہ پیر صاحب کا اس حدیث سے خلافت بلافصل پر استدلال کو بے خبری قرار دینا خود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ڈھکو صاحب خوابوں کی دُنیا میں بستے ہیں اور خواب وخیال کے سہارے ہی سب کچھ اُگلتے چلے جاتے ہیں۔ جب اہل السُنّت کی کسی معتبر کتاب میں موجود ہی نہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل اپنی خلافت بلافصل کی دلیل کے طور پر اس حدیث کو یا کسی دوسری ایسے مضمون کی حدیث کو پیش کیا تو آپ بےخبری والے قول کی لپیٹ میں کیونکر آسکتے ہیں۔ علامہ صاحب اگر ہمارے نزدیک کوئی ایسی صحیح حدیث موجود ہوتی تو قطعاً اس کے خلاف عقیدہ نہ رکھتے۔ اگر تم ڈھکو فیملی کے فرد ہوکر حضرت امیر کے ساتھ محبت کے دعویدار ہوسکتے ہو تو ہم حقیقی ثبوت اس محبت کا اپنے عمل اور عقیدہ سے پیش کرتے، کیونکہ بحمد اللہ تعالیٰ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مقدس طینت اور خمیر سے پیدا ہونے والے ہیں، مگر برصغیر کی صدیوں پر محیط اسلامی تاریخ بتلاتی ہے کہ آپ کی ساری اولاد امجاد سادات ہوں یا اعوان اور کھوکھر وغیرہ وہ سبھی سُنّی مذہب پر قائم رہے اور اسی کے مبلغ اور داعی رہے، جس سے صاف

ظاہر ہے کہ حضرت امیر کا اپنا مذہب اور اُن کی تعلیم وتربیت اور ان کے ارشاد و فرمان کے مطابق وموافق صرف مذہب اہل السنت ہی تھا، جیسے کہ حضرت زید بن زین العابدین رضی اللہ عنہما نے تلواروں کی چھاؤں، تیروں کی بارش اور نیزوں کی نوکوں کے سامنے اسی حقیقت اور عقیدہ کا برملا اعلان کیا اور ہر خوف وخطر سے بے نیاز ہوکر اہل بیت کا مذہب اور نظریہ علانیہ بیان کیا اور آپ نے ان ہزاروں روافض کی ہمنوائی حاصل کرنے اور اُن کی امداد واعانت کے حصول کی خاطر کسی وقتی اور عارضی مصلحت کو بھی اعلانِ حق میں حائل نہ ہونے دیا اور روافض و اہلِ تشیع اسی حق گوئی اور صداقت کی سزا دینے کے لیے ان سے الگ ہوگئے اور انہیں دشمنوں کے حوالے کرگئے اور اس فرزند مصطفےٰ اور لختِ جگر مُرتضےٰ اور نورِ نظر فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہم کو سولی پر لٹکوا دیا، لیکن حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے غیور خمیر سے پیدا ہونے والے اس غیرت مند جوان نے سُولی پر چڑھنا منظور کرلیا، مگر اپنے اور اہل بیت کے مسلک ومذہب میں کسی قسم کا ابہام اور اخفاء برداشت نہ کیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قسم کے دلائل پیش کرکے اپنی خلافت بلافصل ثابت کرتے رہے تھے، تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی برأت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی اور چالیس ہزار معاونین میں سے ساڑھے انتالیس ہزار کی امداد واعانت سے اپنے آپ کو محروم کرنے کی کیا ضرورت تھی، جو صرف اس وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ گئے کہ انہوں نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو کتابِ خدا اور سنّتِ رسول پر عمل کرنے والے اور ظلم وغضب سے منزّہ ومبرّا کیوں قرار دیا اور ان کے حق میں کلمات مدح وثناء کیوں کہے ہیں؟

الغرض اہل بیت کرام اور اولادِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا عقیدہ وعمل اور اُن کی روش وکردار اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اس مقدس خانوادہ کے مورثِ اعلیٰ کا مذہب ومسلک اور عقیدہ ونظریہ بھی یہی تھا۔

۲- ابن ابی الحدید شیعی معتزلی نے احمد بن عبد العزیز الجوہری کی کتاب السقیفہ سے بیعتِ ابی بکر کے موقعہ پر سقیفہ بنو ساعدہ میں رونما ہونے والے مکالمات و مباحثات کو مفصل طور پر بیان کرنے کے بعد کہا:

قلت هذا الحديث يدل على بطلان ما يدعى من النص على امير المومنين وغيره لانه لو كان هناك نص صريح لاحتج به ولم يجر للنص ذكر وانما كان الاحتجاج منه ومن غيره من ابي بكر ومن الانصار بالسوابق والفضائل والقرب فلو كان هناك نص على امير المومنين او على ابي بكر لاحتج به ابو بكر على الانصار ولاحتج به امير المومنين على ابي بكر (شرح حدیدی ج ۶ ص ۱۲)

میں کہتا ہوں کہ سقیفہ کی یہ حدیث حضرت علی یا حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہما) کی خلافت پر تنصیص کے دعوٰی کے بطلان پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اگر ایسی صریح نص موجود ہوتی، تو اس کو بطور حجت و دلیل پیش کیا جاتا، حالانکہ یہاں سرے سے کسی نص کا ذکر ہی نہیں پایا گیا اور جس کی طرف سے بھی خلافت کیلیے استحقاق اور موزونیت پر استدلال پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا انصار ان سب نے ایمان و اسلام میں سبقت فضائل اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قربت کو ہی بطور حجت و دلیل پیش کیا ہے۔ اگر کوئی نصِ صریح حضرت علی یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کے حق میں موجود ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے حق میں وارد نص کو انصار کے سامنے پیش کرتے۔ (اور اس کے ذریعے انھیں اپنی امارت کے دعوے سے باز رکھتے) اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے حق میں وارد نص کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کر کے انہیں اس منصب اور مسند پر متمکن ہونے سے باز رکھتے۔

ابن ابی الحدید کا تشیع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں افضلیت کا عقیدہ اور اصحابِ جمل اور اہلِ صفین کے حق میں اس کی جسارت اور بے باکی "شرح حدیدی" کے متعدد مقامات پر مشاہدہ کی جا سکتی ہے اور ہم نے دوسرے مقام پر اس کو بیان بھی کیا ہے، لیکن اس مقام پر اس کی یہ تصریح اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل پر نہ کوئی نص موجود تھی اور نہ ہی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے سقیفہ اور دیگر کسی مقام پر اس کو پیش کیا گیا ہے، تو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے اس فرمان کی لپیٹ میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ کیسے آسکتے ہیں؟ اور آپ کا یہ فتوٰی ان پر کیسے لاگو ہو سکتا ہے؟

۳- اگر ابن ابی الحدید وغیرہ کے حوالہ جات سے اس قسم کا کوئی استدلال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبانی ثابت ہوتا ہے، تو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ مجلسِ شوریٰ کے سامنے البتہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت آپ نے "من كنت مولاه فعلى مولاه"۔ "الا ترضى ان تكون منى بمنزلة هارون من موسى" اور سورۃ برأت کی ابتدائی آیات کا اہل مکہ کے سامنے تلاوت کر کے معاہدہ کو کالعدم قرار دینے کے لیے بھیجے جانے کا تذکرہ ضرور فرمایا، لیکن وہ بھی خلافتِ بلافصل یا مطلق خلافت کی نصوص کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے فضائل اور امتیازی خصوصیات گنوانے کے لیے ان کو ذکر کیا اور دوسرے حضرات پر اپنی ترجیح ثابت کرنے کے لیے۔ لہٰذا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خود اس کو نصِ خلافت تسلیم نہیں کرتے اور نہ خلافت بلافصل کی دلیل کے طور پر اس کو پیش فرماتے ہیں، تو شیعہ حضرات کو اسے نصِ خلافت قرار دینے کا کیا حق پہنچتا ہے اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ پر اعتراض کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ پھر جن کتابوں میں اس قسم کی روایات موجود ہیں، وہ بھی شیعہ کے ہی کسی نہ کسی فرقہ اور گروہ سے متعلق حضرات کی ہیں اور غیر معتبر اور غیر مستند، لہٰذا ان کو ہمارے مقابل پیش کرنے کا کیا جواز ہے؟

جواب الثانی : دوسری توجیہ وتاویل ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ حاضرینِ دربار کا اس استدلال میں خدشہ پیش نہ کرنا صحتِ حدیث کی دلیل بھی ہے اور اس کے نصِ امامت وخلافت ہونے کی بھی۔ سبحان اللہ العظیم علامہ موصوف کے نزدیک خدشہ پیش نہ کرنے کا پتہ نہیں معنیٰ ومفہوم کیا ہے؟ جب بقول ان کے حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے یہ استدلال پیش کیا تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کو قبول کر لیا گیا اور اس کے مطابق عمل کرتے ہوئے آپ کی بیعت کر لی گئی اور اگر اس استدلال کو نہ قبول کیا گیا ہو اور نہ اس کے مطابق عمل ہی کیا ہو اور صرف انصار اور عام مہاجرین کی طرف سے ہی نہیں، بلکہ قریب ترین برادری بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کی طرف سے بھی اس کو شرفِ پذیرائی نہ حاصل ہو سکا ہو تو مزید خدشہ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ محض آنکھیں بند کر کے کہہ دینا کہ خدشہ پیش نہیں کیا گیا، لہٰذا یہ نصِ خلافت ہو گئی، جہانِ عقل وخرد میں کوئی وزن نہیں رکھتا، اگر ان کا زبانی خدشہ قابلِ اعتبار تھا، تو اجماعی عملی خدشہ کیوں لائقِ اعتبار نہیں ہے؟

علاوہ ازیں یہ جواب اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ آپ نے اس کو نصِ خلافت کے طور پر پیش کیا تھا، حالانکہ یہ بھی خلافِ واقعہ ہے اور اس کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہے اور جب بنیاد ہی درست نہیں ہے، تو اس پر تعمیر شدہ محل کس طرح قائم اور برقرار رہ سکتا ہے۔ لہٰذا پیر صاحب قدس سرہ العزیز کا اس حدیث کے خلافتِ بلافصل کی نص ہونے میں خدشہ بالکل بجا اور برمحل ہے۔

جوابِ الثالث : علامہ صاحب نے فرمایا جہاں تک اس حدیث کی صحت کا تعلق ہے، تو اس پر تمام محدثین کا اجماع ہے۔ دوسری اور تیسری توجیہ میں صحتِ حدیث پر زور دیا گیا ہے، جبکہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے اس کی صحت میں کلام ہی نہیں کیا، لہٰذا سوائے بے فائدہ اور بے مقصد طوالت کے اس سے کیا حاصل ہوا؟ ہمارے نزدیک صحیح حدیث ہونے کے باوجود سرورِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت بلافصل کی نص نہیں ہے۔ اگر کوئی پہلو دلالت کا اس میں موجود تھا، تو اس کا ذکر کرنا کافی تھا، خواہ مخواہ طوالت بیان کی کیا ضرورت تھی؟

جواب الرابع : شیعی فاضل نے کہا: اس حدیث کا حضرت امیر کی خلافتِ مطلقہ پر دلیل ہونا روزِ روشن کی طرح آشکارا اور بے غبار ہے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علامہ موصوف اس کھلی حقیقت سے بھی بے خبر ہیں کہ محلِ نزاع اور مختلف فیہ امور میں بداہت کا دعویٰ قابلِ شنوائی اور لائقِ پذیرائی نہیں ہوتا، بلکہ مدعی کی عاجزی اور بے بسی کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ ایک حدیث کی متنازع اور اختلافی امر پر دلالت میں چودہ صدیوں سے اختلاف چلا آرہا ہے، مگر پندرھویں صدی میں اس کی دلالت کو واضح وآشکارا اور بالکل بے غبار قرار دے دینا صرف اسی شخص کو زیب دیتا ہے، جس میں ہوش وخرد نام کی کوئی شیئ نہ ہو اور ابن سبا کی جنت میں بستا ہو۔

حضرات اہل السنت ہوں یا معتزلہ اور غیر امامی شیعہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات والا صفات سے جو محبت اور قلبی لگاؤ ہے، وہ ان کی کتب حدیث وسیر اور تفاسیر وغیرہ سے ظاہر ہے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کرام علیہم الرضوان کے مناقب وفضائل میں روایات واحادیث کے دفاتر نقل کیے ہیں، لیکن اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل کے قائل نہیں یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت بلافصل نہ دینے پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کو بالعموم اور خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو بالخصوص مرتد اور ظالم وغاصب وغیرہ قرار نہیں دیتے، تو اس کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک ایسی کوئی نص صریح اور دلیلِ قطعی موجود نہیں ہے، جس سے آپ کی خلافت بلافصل ثابت ہو سکے اور نہ ہی ان کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ آپ نے خلافتِ بلافصل کے حصول کے لیے نصوص پیش فرمائے جو اسی مقصد کے لیے

وارد ہوتے ہوں اور اس کے حصول کے لیے جد و جہد فرمائی ہو۔ الغرض جب ہر دور کی اہلِ اسلام کی عظیم اکثریت اور سوادِ اعظم یعنی اہل السنت اور بالخصوص اصحابِ رسول، تابعین و تبع تابعین علیہم الرضوان کے ادوار میں جو امر واضح اور آشکار نہیں تھا، وہ ڈھکو صاحب کے نزدیک پندرھویں صدی میں اس قدر واضح و آشکار کیسے ہوگیا اور امامیہ اثنا عشریہ اور معدودے چند شیعہ کے علاوہ سب اسلامی فرقوں کے علماء و محدثین اور اصولیین اور متکلمین کو واضح اور آشکار امر سے بے خبر قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

نہ صرف ان حضرات پر بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی یہ الزام ہے کہ وہ اس قدر واضح اور روشن دلیل کو پیش کر کے اور آشکارا اور بے غبار نص پیش کر کے اپنے خصوم اور مدِ مقابل حضرات کو لاجواب نہ کر سکے اور تمام بنو ہاشم اور بنو عبد مناف پر بھی بلکہ تمام انصار پر بھی اعتراض ہے کہ وہ اس مہرِ نیمروز کی طرح روشن دلیل کو اور بے غبار نص کو نہ سمجھ سکے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جو روایت "الائمۃ من قریش" سنی، اس پر تو ایمان لے آئے اور اپنے دعویٰ خلافت سے دستبردار ہو گئے، لیکن حدیث منزلت، حدیث غدیر اور اس قسم کی دیگر صحیح اور روزِ روشن کی طرح واضح احادیث پر ایمان نہ لائے۔ نعوذ باللہ منہ ــــ ہے کوئی مسلمان جو ان حضرات کو ایسے روشن اور مہرِ نیمروز کی طرح بے غبار دلیل سے بے خبر اور لاعلم مان سکے؟ یہ صرف اور صرف عبداللہ بن سبا کی پارٹی اور اس کے متبعین کا ہی دل گردہ ہے۔ والعیاذ باللہ منہ

جواب الخامس: اس توجیہ میں علامہ صاحب کا سارا زور اس امر پر ہے کہ حدیثِ منزلت میں عموم ہے، لہٰذا صرف غزوۂ تبوک کے عرصہ میں نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان پایا گیا اور چونکہ

اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے، خصوصیتِ محل اور مورد کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا لہٰذا یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ اعلان چونکہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر پایا گیا، لہٰذا خلافت بھی صرف اسی عرصہ کے لیے ہوگی اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر ختم ہو جائے گی۔

علامہ موصوف الزام تو دوسروں کو دیتے ہیں کہ تعصب اور عناد نے ان کی سوچ اور عقل و فکر کو ماؤف کر دیا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس قول میں وہ دراصل اپنی حقیقتِ حال کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ ذرا اسی اندازِ استدلال اور طرزِ فکر کو دیکھیں کہ تعصب اور عناد نے کس طرح ان کی مت مار رکھی ہے، اور دعوئ عموم میں موجود واضح اور آشکارا خرابیاں ان کی نظروں سے کس طرح اوجھل اور پوشیدہ ہو گئیں۔

اوّل: جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو جو اقتدار و اختیار حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سونپ گئے تھے، وہ خود سنبھال لیا یا نہ؟ دوسری صورت کا بطلان واضح ہے، کیونکہ اگر اقتدار صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، تو حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا محرومِ اقتدار ہونا لازم آیا اور غزوۂ تبوک کے وقت سے وصال تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ماتحت ہونا لازم آگیا، جس کا کوئی مسلمان تو کجا کوئی عقلمند کافر بھی قول نہیں کر سکتا اور اگر دونوں حضرات متصرف اور مقتدر رہے، تو بیک وقت دو بادشاہ اور حاکم تسلیم کرنے لازم ٹھہرے، اس کا بطلان بھی ظاہر اور واضح ہے۔

لہٰذا پہلی صورت متعین ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے، تو تفویض کیا ہوا اقتدار و اختیار آپ نے خود سنبھال لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی طرح اور حسبِ سابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رعیت اور تابع فرمان بن گئے، اور حس و مشاہدہ نے اس عموم کو ختم کر دیا، بلکہ

اسے سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجوع تک کے ساتھ مخصوص اور مقید کر دیا۔ لہٰذا حس اور مشاہدہ کی دلالت کو نظر انداز کر کے محض عموم لفظ پر نظر رکھنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔

دوم۔ عموم الفاظ وغیرہ کا سہارا لینے کی گنجائش اس وقت ہو سکتی تھی، جب عرفِ عام میں ایسے مواقع پر کسی کو قائم مقام بناتے وقت کبھی کسی نے عموم کا ارادہ کیا ہوتا، جب ہمیشہ معمول ہی یہی ہے اور معروف طریق کار بھی یہی ہے کہ ایسی نیابت و خلافت وقتی اور عارضی ہوا کرتی ہے اور اس کا زمانہ تصرف اصلی حاکم اور صاحبِ منصب کی مراجعت تک ہی ممتد ہوتا ہے، تو معروف قاعدہ "المعروف عادۃً کالمشروط شرطاً" کے مطابق اصل کی واپسی پر نائب کی نیابت خود بخود ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا عرف و عادت اور معمول و مروج طریقہ کو نظر انداز کرنے اور محض لفظ کے عموم پر نظر کو مرکوز رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہو گئی کہ آپ کی یہ خلافت وقتی اور عارضی تھی اور اس میں قطعاً عموم نہیں تھا۔

سوم، عموم لفظ کا سہارا لینے کی گنجائش اس وقت ہوتی، جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اعلانِ خلافت ان الفاظ کے ساتھ کیا جاتا۔ جب آپ کی نیابت و خلافت پہلے پائی گئی اور آپ نے اس پر شکوہ کیا کہ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہو، مجھے بھی دوسرے مجاہدینِ اسلام میں شامل فرماتے تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسکین اور دل جوئی کے لیے فرمایا، "الا ترضٰی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور کی طرف جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو قائم مقام بنا گئے تھے اور میں تبوک کی طرف جاتے ہوئے تمہیں خلیفہ بنا رہا ہوں، لہٰذا یہ نہ دیکھو کہ کن لوگوں پر تمہیں خلیفہ بنا رہا ہوں، بلکہ یہ دیکھو کہ کس ہستی کا خلیفہ بن رہا ہوں۔ لہٰذا جب اعلان خلافت اس جملہ سے ثابت ہی نہیں ہے، بلکہ اس خلافت کی تعبیر

تو اس جملہ سے کی گئی ہے (قاستخلف علیاً)، تو آپ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ اس میں کونسا عام لفظ موجود ہے، لہٰذا اس جواب میں سراسر مغالطہ دہی سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ جو خلافت پہلے مل چکی تھی، نہ وہ خلافتِ مطلقہ عامہ تھی اور نہ ہی اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافتِ مطلقہ سمجھا، بلکہ عورتوں اور بچوں تک محدود سمجھا اور واپسی تک کے لیے، ورنہ اگر مجاہدین کے واپس آنے پر بھی آپ ہی خلیفہ تھے، تو پھر عورتوں اور بچوں میں چھوڑنے کی شکایت بے جا تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تمثیل اس شکایت کے ازالہ اور دل جوئی کے لیے دی گئی تھی نہ کہ پہلی خلافت میں عموم پیدا کرنے کے لیے۔

چہارم، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس خلافت میں زمانہ کے لحاظ سے عموم ثابت کرنا تو دور کی بات ہے، حلقۂ اثر اور دائرۂ اختیار کے لحاظ سے اس محدود وقت میں عموم ثابت کرنا بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ مدینہ منورہ کے علاوہ دیگر مواضعات اور امصار و بلاد کے عمال اور گورنر آپ کے ماتحت نہیں تھے اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں شریک غزوہ مجاہدینِ اسلام ہی آپ کے ماتحت تھے، بلکہ جس طرح دیگر بلاد و امصار میں گورنر اور عمال موجود تھے، اب مدینہ منورہ میں بھی عامل اور گورنر کا تقرر کر دیا گیا، جس کی پہلے ضرورت نہیں تھی، کیونکہ سیدِ عرب و عجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس میں تشریف فرما تھے، لہٰذا جب اس محدود وقت میں اس کا عموم ثابت کرنا ممکن نہیں ہے، تو بعد والے ادوار کو اس عموم میں داخل کرنے کا کیا امکان ہے؟ الغرض نہ یہاں عموم پر دلالت ہے اور نہ خلافتِ مطلقہ پر اس سے استدلال درست ہونے کی کوئی صورت ہی ہے۔

پنجم: شیعی کتب میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ یہ خلافت مدینہ منورّہ تک محدود تھی، بلکہ اہلِ بیت کے گھرانوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کی حفاظت اور دیکھ بھال تک۔ احتجاج طبرسی میں ہے کہ غزوۂ تبوک پر سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، لَمَ تخلفنی؟ فقال انّ المدینة لا تصلح الّا بی او بک ص۱۴۹ مطبع جدید۔ "تم مجھے کیوں پیچھے چھوڑے جا رہے ہو؟ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مدینہ منورّہ کی اصلاح اور درستگی میری موجودگی سے ہوگی یا تمہاری موجودگی سے۔"

اور اسی "احتجاج" میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، لا تخلفنی فانی لم اتخلف عنک فی غزوة قط۔ "آپ مجھے پیچھے نہ چھوڑیں، کیونکہ میں کسی بھی غزوہ میں آپ سے کبھی نہیں بیٹھا۔" تو آپ نے فرمایا: انت وصیتی وخلیفتی فی اھلی بمنزلة ھارون من موسٰی۔ ص۲۷۳ "تم میرے اہل میں میرے وصی اور خلیفہ ہو بمنزلہ حضرت ہارون علیہ السّلام کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے"

ان دونوں روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ خلافت اور نیابت مدینہ منورّہ تک محدود تھی اور بالخصوص اہل بیت کی خبر گیری کے لیے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے تھی، لہٰذا اس میں نہ زمانہ کے لحاظ سے عموم ثابت ہوتا ہے اور نہ حلقۂ اثر اور دائرۂ اختیار کے لحاظ سے۔

ششم: ہماری روایات میں بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ گزارش منقول ہے: لم تخلفنی فی النّساء والصّبیان اور شیعی کتب میں بھی لم تخلفنی اور لا تخلفنی کے الفاظ موجود ہیں، جن کا مطلب و مفہوم یہی ہے کہ مجھے عورتوں اور بچّوں میں کیوں چھوڑ رہے ہو؟ مجھے پیچھے نہ چھوڑیے، کیونکہ میں پہلے آپ کے بغیر گھر پر کبھی نہیں رہا، تو اس طرح سرے سے کسی حکومت و سلطنت اور امارت و

خلافت کے حصول کی ہی نفی ہو جاتی ہے، کیونکہ کوئی بھی عربی لغت سے واقف شخص ان جملوں کا ترجمہ یہ نہیں کر سکتا کہ تم مجھے خلیفہ اور حاکم کیوں بنا رہے ہو؟ ایسے نہ کیجیے لہٰذا اس سے اگر کوئی امر ثابت ہوا تو یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورّہ اور اہل بیت کی حفاظت و نگرانی سونپی گئی اور دشمنوں اور بدخواہوں سے تحفّظ اور نگہبانی جیسے کہ افواج اور سپاہ کی ذمّہ داری ہوا کرتی ہے، اسی لیے اس دوران امامتِ نماز کے منصب پر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ فائز رہے، ورنہ حاکم ہونے کی صورت میں امامت نماز بھی آپ کی ذمّہ داری تھی۔ جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور آپ کے فرزند ارجمند حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو یہاں سرے سے حکومت و سلطنت اور امارت نظر ہی نہ آئی اور اس کا تصوّر و تخیّل بھی پیدا نہ ہوا، تو علامہ ڈھکو صاحب ان سے بڑھ کر کس طرح اس دلالت کو سمجھ گئے اور جو حقیقت ان پر آشکار نہیں ہوئی وہ ان پر کیسے آشکار ہو گئی؟ لاحول ولا قوّة الّا باللّٰہ!

قول و عمل کا تضاد

علامہ ڈھکو صاحب کا دعویٰ اور قول تو یہ ہے کہ عمومِ الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے اور خصوصیتِ مقام اور مورد کا لحاظ نہیں ہوتا، مگر آپ کا عمل اس کے بالکل منافی و مخالف ہے، بلکہ یہ قاعدہ صرف اس وقت ملحوظ ہوگا جب خلفاء ثلاثہ کو ظالم اور غاصب ثابت کرنا ہوگا اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دینا ہوگا، لیکن خلافتِ بلا فصل کے مزعومہ عقیدہ و نظریہ کو ثابت کرنا ہو تو پھر نہ عقل سے غرض رہتی ہے اور نہ عقلائی قاعدہ سے۔ ذرا اسی قاعدہ کو مدِّ نظر رکھ کر قول باری تعالیٰ، انّما ولیکم اللّٰہ ورسولہٗ والّذین اٰمنوا الذین یقیمون الصّلٰوة ویؤتون الزّکٰوة وھم راکعون ۝ کی تلاوت کریں اور بتلائیں کہ اس میں الذین اٰمنوا عام ہے یا نہیں؟ الذین یقیمون الصّلٰوة عام ہے یا نہیں یؤتون

الزکوٰۃ عام ہے یا خاص اور ھم راکعون میں عموم ہے یا خصوص؟ پھر اس کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذاتِ اقدس سے کیوں خاص کر دیا گیا اور خصوصِ مورد اور خصوصیتِ واقعہ کو ملحوظ رکھ کر آیتِ کریمہ کے عموم الفاظ کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کے رکوع میں ایک انگوٹھی صدقہ کی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چالیس انگوٹھیاں صدقہ کی تھیں جیسے کہ تفسیر صافی ج ۱، ص ۱۶۴ پر مذکور و منقول ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیوں ان عمومات میں داخل نہ ہو سکے اور ان کا ولی المومنین ہونا کیوں کر ثابت نہ ہو سکا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی: وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصّالحات لیستخلفنھم فی الارض الآیہ کے عموم کو نظر انداز کر کے اسے صرف حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ یا صرف حضرت مہدی علیہ السلام کے ساتھ کیوں خاص کر دیا جاتا ہے اور دوسرے خلفاء راشدین جن کے دور میں اسلام کو تمکّن اور پائیداری حاصل ہوئی اور قیصر و کسریٰ کے تہ و بالا ہونے کے بعد مکمّل امن و سکون حاصل ہو گیا اور دشمنانِ اسلام کا خوف و خطر بالکل دُور ہو گیا، انہیں اس آیتِ مبارکہ کے عموم سے کیوں خارج کر دیا گیا؟

الغرض واضح ہو گیا کہ ان قواعد و ضوابط اور اصول کے استعمال میں شیعہ حضرات کے پیمانے بالکل مختلف ہیں اور وہ سراسر تضاد کا شکار ہیں اور وہ ان کے تسلیم کرنے کا صرف اہل السنّت کو ہی مکلّف سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔

قاعدہ و ضابطہ سے تمسک کی حقیقت

علامہ موصوف نے فرمایا "عقلائی قاعدہ ہے کہ ہمیشہ الفاظ کے عموم و خصوص پر ہی مطالب و مقاصد کے عموم و خصوص کا دار و مدار ہوا کرتا ہے" الخ

۱۔ قاعدہ اپنی جگہ مسلّم ہے، مگر اس کا معنیٰ سمجھنے کی تکلیف نہیں کی گئی اور

یا دیدہ دانستہ مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے، کیونکہ قاعدہ اس وقت کے لیے ہے، جب الفاظ میں عموم ہو اور موقعہ و محل اور شانِ نزول وغیرہ سے اس میں تخصیص کی کوشش کی جائے۔ جب عبارت میں ہی عموم پر دلالت موجود نہ ہو تو پھر اس قاعدہ کو درمیان میں لانے کا موقعہ و محل کیا رہ جاتا ہے۔

حدیث شریف میں وارد جملہ: "فاستخلف علیا" حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیابت پر دلالت کرتا ہے، تو اس میں عموم کیسے ثابت ہو گیا؟ ڈھکو صاحب اس کا ترجمہ یہ کریں گے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے آپ پر بھی اپنے لشکر پر بھی خلیفہ بنایا یا صرف مدینہ منورہ میں باقی رہ جانے والوں پر خلیفہ بنایا؟ نیز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اظہارِ شکایت میں جمع معرفِ باللام استعمال کرتے ہوئے النّساء والصّبیان کا ذکر فرمایا ہے، تو ان الفاظِ عموم کا ترجمہ یہی کریں گے کہ سارے جہان کی عورتوں اور بچّوں پر خلیفہ بناتے ہو؟ حالانکہ یہاں پر سارے عرب کی عورتوں اور بچّوں والا معنیٰ بھی مراد نہیں ہے، بلکہ صرف مدینہ منوّرہ کی عورتوں اور بچّوں والا معنیٰ مراد ہے، تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ یہاں کلام میں قطعاً عموم نہیں ہے، بلکہ کلام ہی مخصوص حالت میں ہے اور اوّل تا آخر اسی کا بیان ہے، تو اس کو مقصدِ متکلّم اور سیاق و سباق سے الگ کر کے عموم پر کس طرح محمول کیا جا سکتا ہے؟

ضابطہ و قاعدہ کے بیان میں دھوکہ اور فریب کاری

علامہ صاحب نے کہا: علماءِ عربیت نے تصریح کی ہے کہ اسم جنس معرف باللام ہو تو جمع کی طرح عموم کا فائدہ دیتا ہے اور منزلت بھی اسم جنس مضاف ہے الخ

لیکن علامہ صاحب نے اس قاعدہ کو بیان کرتے ہوئے بھی ڈنڈی ماری ہے اور اسے غلط انداز میں بیان کیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تعریف باللام یا اضافت وغیرہ میں اصل عہدیت ہے اور بعض افراد کا ارادہ۔ ہاں اس عہدیت اور بعض افراد کے

ارادہ پر کوئی دلالت اور قرینہ نہ ہو تو پھر استغراق والا معنی مراد ہوگا، مثلاً اسی حدیث پاک میں اخلفنی فی النساء والصبیان کے الفاظ موجود ہیں اور دونوں جمع بھی ہیں اور معرف باللام بھی، مگر اس میں عموم نہیں ہے کہ سارے عرب کے بچے اور عورتیں مراد لیے جائیں یا سارے جہان کے بلکہ صرف اور صرف مدینہ منورہ کے بچے اور عورتیں مراد ہیں، لہٰذا اس قاعدہ کو غلط انداز میں پیش کرنا فریب کاری اور مکاری ہے یا بدترین جہالت۔ اگر ایک شخص کے اپنے اقرار سے یا شہادت سے ارتکاب زنا ثابت ہو جائے اور حاکم وقت جلاد کو کہے: اَقِمْ عَلَيْهِ الْحَدَّ یا اَقِمْ عَلَيْهِ حَدَّهٗ۔ تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اس پر زنا کی حد قائم کرے نہ کہ تمام حدود خواہ زنا سے متعلق ہوں یا چوری اور شراب خوری وغیرہ سے اور محصن کی ہو یا غیر محصن کی، سبھی اس پر نافذ کر دے۔

ثمرہ و نتیجہ کا حال

جب ڈھکو صاحب کی بنیاد و اساس اور مبنیٰ و مدار کا حال معلوم ہوگیا، تو اب اس پر متفرع نتیجہ اور مترتب ثمرہ کا حال معلوم کریں۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ منزلت بھی مضاف ہے، لہٰذا اس میں عموم تسلیم کرنا ضروری ہے لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں نبوت اور اس کے خصائص کے علاوہ جملہ امور میں اشتراک ثابت ہوگیا، جیسے کہ حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام میں اشتراک تھا، لیکن ادھر استثناء موجود نہیں اور ادھر نبوت کا استثناء کیا گیا ہے۔

لیکن یہاں بھی سراسر دھوکہ دہی اور فریب کاری سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ جاہل سے جاہل آدمی پر بھی یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام جملہ کمالات میں شریک نہیں تھے اور نہ مراتب و کمالات میں برابر، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اصل نبی تھے اور حضرت ہارون

علیہ السلام تابع، وہ حقیقی حاکم تھے اور صاحب اختیار و تصرف اور حضرت ہارون علیہ السلام اُن کے وزیر۔ وہ کلیم اللہ کے منصب پر فائز تھے اور یہ اس منصب پر فائز نہ تھے، لہٰذا جب مقیس علیہ میں ہی تمام مراتب و منازل میں اشتراک اور مساوات ثابت نہ ہوئی، تو مقیس میں یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کس طرح برابری اور اشتراک ثابت ہو سکتا ہے؟

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قول مصطفوی: "بمنزلۃ ہارون من موسیٰ" تو حکایت ہے اس منزلت کی جو قول موسیٰ علیہ السلام: اخلفنی فی قومی سے ثابت ہو رہی تھی، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قول سے اپنے کمالات اور منازل و مراتب میں حضرت ہارون علیہ السلام کی شرکت اور مساوات بیان فرمانا چاہتے تھے یا آپ اپنی طور پر سے واپسی تک ان کو قوم کی دیکھ بھال اور نگرانی و نگہبانی سونپ رہے تھے۔ کوئی معمولی عقل و دانش کا مالک بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا اس قول سے انہیں عارضی طور پر اور محدود وقت کے لیے قائم مقام بنانا مقصود تھا نہ کہ نبوت اور دیگر منازل و مراتب میں ان کی مساوات بیان کرنا تو جب نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے "بمنزلۃ ہارون من موسیٰ" فرمایا تو لامحالہ اس میں بھی وہی عارضی اور محدود نیابت اور قائم مقامی مراد ہوئی۔ ورنہ توجیہ الکلام بما لا یرضیٰ بہ القائل لازم آئے گی، جبکہ کلام قائل کو اس کی مرضی کے برعکس معنی پر محمول کرنا اور اپنی مرضی سے اس میں تصرف کر دینا عام آدمی کو زیب نہیں دیتا، چہ جائیکہ خاتم الانبیاء والمرسلین اور امین خدا اور امین خلق کو زیب دے۔ لہٰذا جب ثابت ہوگیا کہ منزلت وہاں بھی عام نہیں ہے تو یہاں بھی عام نہیں ہوگی، بلکہ صرف تبوک سے واپسی تک کے لیے عارضی نیابت اور نگرانی و نگہبانی میں قائم مقام ہونے کے معنی میں ہوگی، جس کا وصال مصطفوی کے بعد والی خلافت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کیا ہر جگہ استثناء دلیلِ عموم ہوتا ہے

علامہ موصوف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ کمالات ثابت کرنے کے لیے الا انہ لا نبی بعدی کے استثناء کا سہارا لیا ہے کہ استثناء دلیلِ عموم ہوا کرتا ہے، لہذا نبوت اور اس کے خصائص کے علاوہ تمام مراتب ومنازل میں اشتراک اور مشارکت ثابت ہو گئی، لیکن یہاں بھی موصوف نے دھوکہ دہی سے کام لیا ہے، کیونکہ ہر جگہ استثناء کو عموم کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ جہاں مستثنیٰ منہ میں عموم کی صلاحیت موجود ہو، صرف وہاں استثناء کو دلیلِ عموم سمجھیں گے۔ مثلاً کوئی شخص کہے: لہ علی مائۃ درہم الا عشرۃ۔ یہاں استثناء تو موجود ہے، لیکن مائۃ درہم کو عام نہیں کہیں گے، کیونکہ اعداد اپنے تمام تر مراتب میں الفاظ خصوص ہوتے ہیں، ان کا تعلق دہائیوں سے ہو یا سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں سے نہ کہ الفاظِ عموم۔ ہاں البتہ قولِ باری تعالیٰ اِنّ الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا۔ الآیہ، میں الانسان میں احتمالِ خصوص اور عہدیت کا بھی تھا اور عموم کا بھی تو استثناء سے عموم ثابت ہو گیا اور عہدیت یعنی بعض معین انسان مراد ہونے کا احتمال ختم ہو گیا۔ لیکن جب مستثنیٰ منہ کا لفظ پہلے ہی متعین اور مخصوص معنی میں ہو تو پھر استثناء دلیلِ عموم نہیں ہو گا اور ہم ثابت کر چکے کہ منزلت کے لفظ میں عموم نہیں ہے۔ نہ مقیس علیہ میں اور نہ ہی مقیس میں۔ لہٰذا یہ خود فریبی کا مظاہرہ بھی ہے اور عوام فریبی کا بھی اور حقائق وواقعات سے آنکھیں بند کر کے ہی علامہ موصوف نے یہ سب کچھ سپردِ قرطاس کیا ہے اور اس کو کہتے ہیں تعصب اور عناد جو انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیتا ہے۔

جواب السادس: چھٹی توجیہ حدیثِ منزلت کی علامہ صاحب نے

یہ ذکر کی تھی کہ یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کون پہلے فوت ہوا اور کون بعد میں؟ بس صرف یہ دیکھا جائے گا کہ اگر حضرت ہارون علیہ السلام زندہ ہوتے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہوا تھا، تو آپ کا خلیفہ کون ہوتا؟ پہلے وفات پانا یا بعد میں اور چھوٹا ہونا یا بڑا ہونا تشخصات اور شخصی کیفیات میں داخل ہے اور محلِ کلام سے خارج۔

علامہ صاحب کی یہ توجیہ بھی خیالی دُنیا میں بسنے والوں کے تخیلِ فاسد اور توہم باطل کی طرح ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات پہلے نہ ہوتی، تو وہ خلیفہ ہوتے، لیکن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تو موجود تھے، لہٰذا وہ خلیفہ بن گئے۔ بحث اس میں نہیں تھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام اگر پہلے فوت نہ ہوتے تو حضرت موسیٰ کلیم علیہ السلام کے خلیفہ ہوتے یا نہ؟ بلکہ اس میں بحث اور کلام ہے کہ انہیں حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے "اُخلفنی فی قومی" کہہ کر اپنے وصال کے بعد منصبِ خلافت تفویض فرمایا یا صرف طُور سے واپسی تک کے لیے یہ ذمہ داری سونپی تھی اور اگر آپ ان کو "اخلفنی فی قومی" نہ فرماتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد زندہ ہونے کی صورت میں وہی خلیفہ ہوتے، یا کوئی دوسرا شخص؟ لہذا اس اگر اور بالفرض زندہ ہونے اور خلیفہ بن جانے میں بحث نہیں۔ بحث ہے اس جملہ کی دلالت میں کہ اس میں کس دور کی خلافت مراد ہو سکتی ہے اور ہمارا یہی دعویٰ ہے کہ اس جملہ کو بعد از وصال خلافت سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کی وجوہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت ہارون علیہ السلام شیعی تصریحات کے مطابق پہلے وصال فرما گئے جیسے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ اور دیگر اکابر نے تصریح کی ہے اور اگر ان کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے وصال کے بعد خلیفہ ہونے کا اعلان فرمایا تھا اور ظاہر ہے کہ پیغمبرِ وقت کا ایسا اعلان اذنِ خداوند تعالیٰ کے بغیر نہیں ہو سکتا، تو ایسی صورت میں اس اعلان کا عبث اور بے فائدہ ہونا لازم آئے گا اور یا اللہ تعالیٰ اور

حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کا بے علم اور بے خبر ہونا نعوذ باللہ! کیونکہ یہ علم تھا کہ وہ پہلے وفات پا جائیں گے، تو یہ اعلان بے فائدہ اور بے مقصد ہو گیا اور علم نہیں تھا، تو جہالت لازم آگئی اور یہ دونوں لازم باطل ہیں، لہٰذا اس جملہ میں بعد از وصال خلافت کا اعلان مراد ہونا بھی باطل ہو گیا بلکہ صرف اور صرف وقتی اور عارضی نیابت اور خلافت ثابت ہوئی اور جب مقیس علیہ میں بعد از وصال خلافت مراد نہیں، تو مقیس یعنی منزلت علی میں یہی عارضی اور وقتی خلافت ہی مراد ہوگی، اس کو بھی وصالِ مصطفوی والی خلافت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

۲۔ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے "اخلفنی فی قومی" فرما کر مکمل اختیارات سونپ دیئے اور خود ہمیشہ کے لیے ان سے دستبردار ہو گئے یا اپنی موت کے بعد اختیارات سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔ دوسری صورت میں وہ گوسالہ پرستی وغیرہ کے معاملات کے جواب دہ نہ تھے، پھر ان کو سرزنش کرنا اور ان کے سر اور ڈاڑھی مبارک کے بال پکڑ کر گھسیٹنے کا کیا مطلب؟ کیونکہ ابھی تو ان کو یہ ذمہ داری سونپی ہی نہیں گئی تھی۔ اور پہلی صورت میں اگر حضرت کلیم اللہ علیہ السلام دستبردار ہو چکے تھے، تو وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی رعایا تھے اور زیرِ فرمان پھر اُن کا اپنے حاکم اور فرماں روا کے ساتھ یہ سلوک کرنا کیسے روا تھا اور اگر یہ روا تھا، تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اصلی اقتدار و اختیار اب بھی اُن کے پاس تھا اور جب وہ طور سے واپس ہوئے تو انہوں نے اپنے اصلی اور بنیادی اختیارات خود سنبھال لیے اور حضرت کلیم علیہ السلام کے نظریہ کے مطابق قائم مقامی کا حق ادا نہ کرنے پر حضرت ہارون علیہ السلام ان کے عتاب کے مستحق ٹھہرے۔ لہٰذا واضح ہو گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بعد از وصال خلافت کا منصب نہیں دیا، بلکہ اپنی زندگی کے ان ایام میں، جن میں وہ قوم کے اندر موجود نہیں رہنے تھے،

اور یہی صورتِ حال حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں بھی ملحوظ اور مقصود تھی اور یہی معنیٰ و مفہوم صحابہ کرام اور مہاجرین و انصار نے سمجھا اور اس کے مطابق عمل فرمایا۔

۳۔ حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مراتب و منازل میں مکمل مماثلت اور مساوات تھی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سلوک ان کے ساتھ کیوں کیا؟ اور حضرت ہارون علیہ السلام ان کے سامنے جواب دہ کیونکر ہو گئے اور وہ مؤاخذہ و عتاب کے حقدار کیسے بن گئے؟ اور اگر استثنائی صورت موجود نہ ہونے کے باوجود فرقِ مراتب موجود تھا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی جملہ مراتب و کمالات اور مقامات و منازل میں رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کیسے ہو گئے کہ حکومت علی الاطلاق کا مرتبہ و مقام بھی ان کے لیے مُسلّم ہو جاتے۔

۴۔ شیعہ علماء کا خیال ہے کہ اگر موت واقع نہ ہوتی، تو چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام ہی خلیفہ ہوتے۔ لہٰذا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ موجود ہونے کی وجہ سے خلافت کے لیے متعین ہو گئے، کیونکہ دونوں کی منزلت ایک جیسی تھی، مگر جیسے قبل ازیں بھی بتا چکا ہوں کہ واقعہ میں کس نے خلیفہ بننا تھا، اس میں کلام ہی نہیں، کیونکہ حضرت کلیم علیہ السلام یہ نہ بھی فرماتے کہ تم میری قوم میں میرے قائم مقام بنو، پھر بھی حضرت کلیم علیہ السلام کی وفات کے وقت حضرت ہارون علیہ السلام موجود ہوتے، تو وہ خلیفہ بن جاتے، لہٰذا اس خلافت کا دار و مدار اس حکم پر نہیں ہے، بلکہ اس حکم سے اگر خلافت ثابت ہوئی تو وہی جو طور پر جانے کے بعد شروع ہوئی، اور واپسی پر ختم ہو گئی اور حسبِ سابق حضرت کلیم علیہ السلام کے وزیر اور مشیر بن گئے اور ہر دور میں حکام و سلاطین اور امراء و خلفاء اس طرح کے نائب اور قائم مقام بناتے رہے ہیں اور اس کی حقیقت و حیثیت ہر خاص و عام کو معلوم ہے اور یہی کچھ صحابہ کرام نے سمجھا اور اسی کے مطابق عمل کیا، لہٰذا ہم بھی اس خلافت کو اسی معنیٰ و مفہوم میں منحصر اور محدود ماننے کے پابند ہیں اور دلالتِ حس اور عرف و عادت کے برعکس کسی معنی پر اس کا محمول کرنا قطعاً درست نہیں ہے۔

۵۔ علامہ صاحب نے کہا پہلے فوت ہونا یا بعد میں، اور بڑا ہونا یا چھوٹا محلِ کلام سے خارج ہے، کیونکہ یہ تشخصات اور شخصی کیفیات ہیں اور ان میں کلام نہیں ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ پہلے فوت ہونے سے اس خلافت کا وقت اور اس کی جہت متعین ہو گئی اور واضح ہو گیا کہ آپ کا مقصد مشروط اعلان نہیں تھا کہ اگر میرے فوت ہونے کے بعد تم زندہ رہے، تو میرے خلیفہ بن جانا، بلکہ اب میری عدم موجودگی میں تم میرے خلیفہ بنو اور طور سے واپسی تک میری ذمہ داریوں کو سنبھال لو۔ لہذا اس کھلی اور روشن حقیقت کو تشخص اور شخصی کیفیت کہہ کر محلِ کلام سے خارج قرار دینا لغو اور باطل ہے۔

۶۔ علاوہ ازیں یہ دعوٰی بھی محلِ نظر ہے کہ حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ اور حضرت ہارون علیہ السلام میں جو ایک جیسی منزلت ثابت کی گئی ہے، اس میں تشخصات اور شخصی کیفیات بالکل ملحوظ نہیں ہیں۔ معانی الاخبار میں منقول ہے کہ حضراتِ حسنینِ کریمین رضی اللہ عنہما کے تولد پر اللہ تعالٰی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ علی چونکہ بمنزلہ ہارون ہیں، لہذا ان کے بیٹوں کے نام بھی ان کے ناموں پر ہونے چاہئیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ ان کے نام کیا تھے، تو حضرت جبرئیل نے عرض کیا، شبّر اور شبیّر۔ آپ نے فرمایا، میری زبان تو عربی ہے اور یہ نام عربی نہیں ہیں؟ تو انہوں نے عرض کیا: عربی میں ان کا ترجمہ و تعبیر حسن اور حسین ہے، لہذا یہ نام رکھ دیں۔ (معانی الاخبار ص۲۱)

کیا اولاد کے اسماء میں یکسانیت شخصی کیفیات سے نہیں تھی۔ پھر اللہ تعالٰی نے اس کو محلِ کلام سے خارج کیوں نہ قرار دیا اور کیوں نہ اسے نظر انداز فرمایا اور جب یہ تشخصات اور شخصی کیفیات اللہ تعالٰی نے اس تشبیہ و تمثیل سے خارج نہیں فرمائے اور نظر انداز نہیں کیے ہیں، تو ڈھکو صاحب کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ان سب کیفیاتِ مشخصہ کو نظر انداز کریں اور علی الخصوص خلافتِ عامہ کے زعم اور مفروضہ میں آپ کی وفات جیسے فیصلہ کن امر کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے جیسے کہ

اصحابِ رسول علیہ الصلٰوۃ والسلام اور مہاجرین و انصار علیہم الرضوان نے اس کو محلِ کلام سے خارج اور غرضِ مصطفوی سے بے تعلق نہیں گردانا اور نہ ہی اہل بیت کرام نے اور مرتضوی اقرباء نے اسے خارج تسلیم کیا، بلکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کو ملحوظ رکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی خلافت صرف حضرت کلیم علیہ السلام کی واپسی تک تھی۔

جواب السابع : علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا تو پہلے وصال ہو گیا تھا، لہذا خلیفہ نہ بن سکے، مگر حضرت امیر علیہ السلام تو زندہ موجود تھے، لہٰذا ان کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کی خلافت کا تصوّر کس طرح کیا جا سکتا تھا؟

مقامِ حیرت ہے کہ ڈھکو صاحب کو پندرھویں صدی میں جو چیز ناقابلِ تصور معلوم ہو رہی ہے، وہی چیز یعنی دوسرے حضرات کی خلافت، مہاجرین و انصار، بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب اور بنو عبد مناف، بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتفاق اور اجماع کے ساتھ موجود اور متحقق ہو گئی، لہذا انہیں اپنی چشم تصوّر سے بغض و عناد کا سیاہ موتیا اتار کر اس حقیقت کا بغور جائزہ لینا چاہیے کہ ان سب صحابہ اور قرابتدارانِ رسولِ معظّم نے حدیثِ منزلت کا جو معنیٰ و مفہوم سمجھا تھا، ہم بھی وہی معنیٰ و مفہوم کیوں نہ درست تسلیم کر لیں اور اپنے خود ساختہ معنی کو ہی کیوں نہ ترک کر دیں۔

۲۔ نیز یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں ہے کہ جن حضرات کے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں رہنے کا حکم دیا اور اُن کی شکایت پر فرمایا: "الا ترضٰی ان تکون منّی بمنزلة هارون من موسٰی"۔ انہوں نے حالات و واقعات، پیش منظر اور پس منظر اور اس کے ماله اور ما علیه کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی معنی سمجھا تھا کہ یہ خلافت اور نیابت عارضی ہے اور یہ جملہ شیرِ خدا رضی اللہ عنہ کی دلجوئی اور تسکین قلب کے لیے ہے اور وقتی

اور محدود وقت کی نیابت کے لیے نہ کہ دائمی یا بعد از وصال خلیفہ بنانے کے لیے ہے۔

قبل ازیں متعدد دفعہ اس امر کی طرف متوجہ کر چکا ہوں کہ سب سے پہلے خلافت کا معاملہ انصار نے چھیڑا تھا اور مدینہ منورہ میں اپنی حکومت و سلطنت قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور جب انہیں اس سے روکا گیا، تو انہوں نے کہا تم ہمارے ہاں پناہ حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ اب ہمارا حق امارت و حکومت بھی غصب کرتے ہو جیسے کہ ابن ابی الحدید شارح "نہج البلاغۃ" نے خطیب انصار کا خطبہ نقل کیا ہے: اما بعد فنحن الانصار وکتیبۃ الاسلام وانتم رهط نبینا دفت الینا دافة من قومکم فاذا انتم تریدون ان تغصبونا الامر۔ شرح حدیدی جلد ۲ ص ۲۴

بعد حمد و ثناء کے واضح ہو کہ ہم انصار ہیں اور لشکر اسلام اور تم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت ہو، تمہاری قوم میں سے ایک جماعت حالات سے مجبور اور تنگ آکر ہمارے پاس پناہ حاصل کرنے آئی اور اب تم یہ ارادہ بھی رکھتے ہو کہ ہم سے امر حکومت سلب کر لو۔

لیکن جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنا کہ ائمہ اور فرماں روایان اسلام قریش سے ہی ہوں گے، تو انہوں نے اس کو تسلیم کیا اور اپنے سابقہ نظریہ کو ترک کر دیا، اور اپنے دعوے سے دستبردار ہو گئے، تو یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ براہ راست حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث منزلت اور حدیث غدیر کو سنیں مگر اس کو نظر انداز کر دیں، جبکہ قرآن مجید نے ان کی شان ہی یہ بیان کی ہے: یؤثرون علی انفسہم کہ وہ مہاجرین کو اپنوں پر ترجیح دیتے ہیں اور انہیں سبھی مہاجرین محبوب اور پیارے لگتے ہیں: یحبون من هاجر الیهم تو مہاجرین کے اہم ترین فرد اخ الرسول، زوج البتول، منزلت ہارونی کے مالک اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ کی شان والے کے لیے یہ ایثار نہ کریں

اور مسند رسول علیہ السلام پر ان کے حقیقی وارث کو بٹھانے کی بجائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بٹھا دیں اور اپنے دین کو اور دنیاوی مقام کو بھی تباہ کر دیں نعوذ باللہ! قطعاً یہ امر ممکن نہیں ہے۔

۳۔ شیعی کتب اور اہل السنت کی روایات سے ثابت ہے کہ انصار کا راستہ درحقیقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ، جیسے کہ احتجاج طبرسی میں اس کی تصریح موجود ہے تفصیل اس کی یوں ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں مسجد نبوی میں دو سو سے زائد مہاجرین و انصار بیٹھے ہوئے تھے، جن میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ اس مجلس میں قریش نے اپنے فضائل و مناقب بیان کیے اور انصار نے اپنے حق میں وارد ارشادات نبوی بیان کیے جن میں سے انصار کی شان میں وارد سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی تھا: لو سلک الناس شعبا لسلکت شعب الانصار۔ یعنی اگر لوگ ایک گھاٹی اور پہاڑی راستہ پر چلیں (اور انصار دوسری گھاٹی اور پہاڑی راستہ پر چلیں) تو میں انصار والے راستہ پر چلوں گا۔ پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے مناقب بیان کرنے سے قبل مہاجرین و انصار کے بیان کردہ فضائل اور مناقب کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: ما من الحیین احد الا وقد ذکر فضلا وقال حقا ان دونوں جماعتوں اور قبیلوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی فضیلت بیان کی اور جو کہا حق اور سچ کہا۔

تو اس طرح اہل السنت اور اہل التشیع کے نزدیک یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ انصار کی راہ، راہ نبوت ہے اور یہی راہ نجات اور صراط فوز و فلاح ہے اور انہوں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رسول معظم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند خلافت دے دی، تو واضح ہو گیا کہ یہی روش اور طریقہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ روش اور طریقہ ہے اور جو عمل و کردار ان

کا اہلِ اسلام کے سامنے آیا، اس میں دُنیاوی اغراض کو اور ذاتی مصالح و منافع کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ اپنی دنیا تو قربان کر دی، لہٰذا یہ عمل سراسر اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی تھا اور انصار کو قرآنِ مجید نے فاولئک ھم المفلحون ہ کی سندِ فوز و فلاح عطا کی ہے، لہٰذا ہماری فلاح و نجات بھی اسی میں ہے کہ ان کی اتباع کریں اور جو کچھ انہوں نے حدیثِ منزلت اور حدیثِ غدیر کے معانی سمجھے، ہم بھی انہیں معانی کو مرادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیں اور اپنے توہم و تخیل کے مطابق نئے معانی گھڑ کر ان مقدس ہستیوں کو اس کا پابند نہ ٹھہرائیں اور مخالفت کی وجہ سے ان پر ارتداد وغیرہ کے فتوے نہ لگائیں، بلکہ اپنی اصلاح کریں۔ الغرض واضح ہو گیا کہ حدیثِ منزلت کا وہ مفہوم نہیں، جو ابن سبا اینڈ کمپنی نے تیار کیا تھا۔

۴۔ نیز حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے شیعی کتب کے حوالہ سے ثابت کیا تھا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مدینہ میں ٹھہرے نہیں تھے، بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے تھے اور غزوۂ تبوک میں شامل ہو گئے تھے، لہٰذا یہ مماثلت تو اس وقت ہوتی جب آپ قیامِ مدینہ پر رضامند ہوتے اور حضرت ہارون کی طرح ٹھہرے رہتے، لیکن آپ نے مدینہ منورہ میں قیام نہ کر کے اور بنفسِ نفیس غزوہ میں شریک ہو کر وہ منزلت قبول نہ کی، جس کے متعلق حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ میری نسبت سے وہ منزلت تمہارے لیے ثابت ہو جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہما السلام سے حاصل تھی، جس طرح وہ قوم بنی اسرائیل میں رہے، تم مدینہ میں رہو۔ مگر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جب نہ رہے، تو ثابت ہو گیا کہ آپ نے غزوہ میں شامل ہونے کو اس منزلت پر ترجیح دی۔ تو اگر آپ اس کو دائمی اور علی الاطلاق خلافت سمجھتے اور نبوت کی مانند امتیازی مرتبہ و مقام تو پھر اس سے اعراض کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا ڈھکو صاحب نے اس حدیث کا گویا وہ معنیٰ گھڑا ہے، جو بابِ مدینۃ العلم کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا۔

نوٹ: ملا باقر مجلسی کی "حیات القلوب" کے اس حوالے سے شیعہ مذہب کا سارا تانا بانا ادھڑ جاتا تھا، اس لیے علامہ صاحب یہاں سے یوں خاموشی کے ساتھ

نکل گئے گویا کہ یہ حوالہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر ہی نہیں کیا تھا اور موصوف کا ہر اُس حوالے کے متعلق یہی معمول ہے جس کا جواب نہ بن سکتا ہو۔

۵۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں دوسرے کسی شخص کی خلافت کا تصور بھی کیسے کیا جا سکتا تھا، لیکن حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے تاثر یہ دیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوتے دوسرے کسی بھی شخص کی خلافت کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے جناب ابوسفیان کی افواج و سپاہ مہیا کرنے کی پیش کشوں اور حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے بار بار مشوروں کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس خلافت کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا، بلکہ اس خلافت کے خلاف کارروائی کو منافرتِ جاہلیہ اور تعصبِ بےجا سے تعبیر کیا، اور کچے پھل توڑنے اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے مماثل قرار دیا، اور آپ نے حضرت ابوبکر، پھر حضرت عمر اور بعد ازاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے مکمل موافقت فرمائی اور مقدور بھر معاونت بھی کی۔

اس پس منظر میں دو ہی راستے رہ جاتے ہیں کہ حدیثِ منزلت وغیرہ کے وہ معانی تسلیم نہ کیے جائیں، جو روافض اور اہلِ تشیع نے بیان کیے ہیں یا پھر تمام صحابہ کرام کو بمع حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مجرم اور گناہ گار اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف اور باغی تسلیم کیا جائے۔ حضرات صحابہ اس لیے مجرم ہو گئے کہ انہوں نے حقدارِ خلافت کو اس کا حق نہ دیا اور فرمانِ نبوی کی مخالفت کی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس لیے مجرم ٹھہریں گے کہ انہوں نے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کوئی سعی اور جدوجہد نہ کی اور ابوسفیان کی پیشکش کے ساتھ ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مشورے اور تعاون کو بھی ٹھکرا دیا اور یہی وجہ ہے کہ شیعہ فرقوں میں سے کاملیہ فرقہ نے سب مہاجرین و انصار کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی کافر قرار دے دیا۔ ولھذا اکفرته الکاملیۃ واکفرت الصحابۃ لترکھم بیعتہ وکفر ھو بترک

المنازعة لهم۔ شرح حدیدی ص۲۵۴، جلد ۱۰

یعنی انہوں نے اس تکفیرِ صحابہ کا سبب یہ بیان کیا کہ انہوں نے بیعتِ مرتضےٰ رضی اللہ عنہ کو ترک کیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کفر کا سبب یہ بیان کیا کہ آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ نزاع و خلاف کو ترک کر دیا (حالانکہ آپ کو بنو ہاشم بنو عبدالمطلب اور بنو عبدمناف کی امداد و اعانت بھی حاصل تھی)

گویا کاملیہ فرقہ نے اس ظلم میں تفریق اور امتیازی سلوک روا نہ رکھا بلکہ دونوں فریق کو ایک ہی فتوے سے نوازا اور حبِّ علی کا بھی اور حق گوئی کا بھی حق ادا کر دیا، لیکن امامیہ نے اس ظلم کے ساتھ ساتھ دوسرا ظلم یہ بھی کر دیا کہ اس فتوائے کفر و ارتداد میں تفریق اور امتیاز کو روا رکھا اور عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے مہاجرین سابقین اور انصار اوّلین اور تمام صحابہ کرام پر فتوی لگایا، لیکن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ کر دیا، حالانکہ جب نبی و رسول کے لیے دعوائے نبوّت و رسالت لازم ہے، تو امامت جو اس کی مانند ہے، اس میں بھی دعویٰ ضروری ہوگا۔

لیکن دوسرا راستہ اختیار کرنے میں قرآن مجید کی بیسیوں آیات اور حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی و منقول سینکڑوں احادیث کی خلاف ورزی ہے، جن میں صحابہ کرام مہاجرین و انصار، تابعین بالاحسان اور فتحِ مکہ کے بعد حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کے جنتی ہونے کی تصریح ہے، لہٰذا صرف پہلا راستہ ہی رہ گیا کہ درحقیقت حدیثِ منزلت وغیرہ کا معنیٰ و مفہوم ہی وہ نہیں ہے، جو تراشا گیا ہے۔

۶- یہاں پر پھر یاد دہانی کرا دوں کہ اس حدیث سے بعد از وصال خلافت کا اعلان مقصود ہو تو حدیثِ غدیر میں اس خلافت کے اعلان سے تکرار لازم آئے گا اور بقول ڈھکو صاحب یہ تحصیل حاصل ہے اور محال۔ لہٰذا وہ جواب صحیح ہے تو یہ استدلال غلط ہے اور یہ استدلال صحیح ہے، تو پھر وہ جواب غلط ہے

کہ محبتِ مرتضوی کے وجوب و لازم کا تو پہلے اعلان ہو چکا تھا۔ غدیر خم میں بھی وہی اعلان کیا جانا، تکرار محض ہے اور تحصیل حاصل اور محال ہے

عجب مشکل میں ہے سینے والا جیب و داماں کا!
اِدھر ٹانکا اُدھر اُدھڑا، اُدھر ٹانکا اِدھر اُدھڑا

۷- علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ حدیثِ منزلت میں منزلتِ علویہ کو منزلتِ ہارونیہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور عقلائی قاعدہ یہ ہے کہ تشبیہ کے لیے مشبہ اور مشبہ بہ میں تمام وجوہ میں اشتراک اور مماثلت ضروری نہیں ہوتی، بلکہ کسی ایک وجہ میں بھی مشارکت پائی جائے، تو تشبیہ درست ہو جائے گی۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اسد اللہ اور شیرِ خدا کہا جاتا ہے اور یہاں صرف شجاعت و بسالت اور جرأت و دلیری کی صفت میں تشبیہ دینا مقصود ہے نہ کہ تمام اوصاف میں، لہٰذا حضرت ہارون علیہ السلام اگر زندہ ہوتے اور وہ خلیفہ ہو بھی جاتے، تو اس سے یہ کیسے لازم آتا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ ہوتے، کیونکہ مرکز سے بظاہر غیر حاضری اور عدم موجودگی کی صورت میں نیابت اور قائم مقامی میں جب اشتراک پا یا گیا تو تشبیہ و تمثیل درست ہو گئی۔ علاوہ ازیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام سے قریب تر کوئی نہیں تھا اور نہ کوئی قربت میں ان کے برابر جبکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نسبت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے اور اسی اقربیت کی وجہ سے بعض لوگ ان کی خلافت کے قائل ہو گئے کما صرح به ابو جعفر الطوسی فی التلخیص اور آپ کے بھائی عقیل اور دیگر مُطلبی حضرات چچا زاد ہونے میں برابر تھے۔ لہٰذا حضرت ہارون علیہ السلام خلیفہ بن جاتے تو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اس حدیثِ منزلت سے آپ کی خلافت بلا فصل پر استدلال مفید یقین نہیں ہو سکتا تھا، چہ جائیکہ جب وہ خلافت حضرت ہارون علیہ السلام کے حق میں ثابت ہی نہ ہو۔

تیز یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ وجہ شبہ دونوں جگہ متحقق ہونی چاہیے۔ علی الخصوص کلام انبیاء کرام علیہم السلام میں جو اپنے ارشادات کو فرض اور تخیل پر موقوف نہیں ٹھہراتے اور بالخصوص ایسے واقعہ میں جو گزر چکا ہو اور اس کی صورتِ واقعیہ سے سبھی واقف ہوں اور یہاں پر حضرت ہارون علیہ السلام میں جب خلافت بلافصل نہ موجود و متحقق ہوئی اور نہ اس کے فرضی و تقدیری وجود پر اس تشبیہ و تمثیل کے موقوف ہونے پر کوئی قرینہ اور اشارہ ہے تو بغیر دلیل و قرینہ کے متحقق وجہ شبہ میں تشبیہ کی بجائے غیر متحقق وجہ شبہ میں تشبیہ اعتبار کرنا خلافِ قاعدہ اور خلافِ اصل ہونے کے علاوہ خلافِ عرف و عادت بھی ہے۔ لہذا اس کا قطعاً اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ علی الخصوص جبکہ از روئے قرآن، جنت اور رضوان باری تعالیٰ کی بشارات سے مشرف اور بہرہ ور حضراتِ صحابہ اس فرضی تشبیہ کا اعتبار نہ کریں، جو براہِ راست اس فرمانِ مصطفوی کے سننے والے بھی تھے اور مقاصدِ نبویہ کو سمجھنے والے بھی۔

جواب الثامن: علامہ ڈھکو صاحب نے کہا کہ پیر صاحب سیالوی نے ان دو حدیثوں پر غلط سلط تنقید و تبصرہ کرنے کے بعد لکھا کہ ان کے علاوہ اور کوئی دلیل اور نص خلافتِ امیر پر موجود نہیں۔ پھر انہوں نے بیسیوں آیات اور سینکڑوں احادیث مفید مدعا کے موجود ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

علامہ موصوف کے اس تبصرہ پر ہم آیتِ معلومہ پڑھنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں، مگر سرِ دست اسے استعمال نہیں کرتے۔ البتہ اصل عبارت قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر کے طالب انصاف ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمایا: "اہل تشیع کے دلائلِ خلافتِ بلافصل کا نمونہ تو آپ دیکھ چکے جو تصریحات کا انکار۔ من گھڑت اور غلط توجیہات پر اصرار کا مجموعہ ہوتی ہیں" ص ۸۳

اب فرمائیں کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے شیعہ کے مفروضہ اور مزعومہ دلائل کا ان دو حدیثوں میں حصر کیا ہے یا ان دو کو ان کا نمونہ قرار دیا ہے۔ ڈھکو صاحب نے

شاید مشہور محاورہ "مشتے نمونہ از خروارے" نہیں سنا ہوا۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے علمائے شیعہ کے اسی خروار سے یہ نمونہ اہل اسلام کو دکھلا دیا ہے کہ جب ان کے نزدیک امامتِ مرتضوی اور خلافت بلافصل کی انتہائی وزنی اور بزعمِ خویش قطعی دلائل کا حال یہ ہے تو دوسرے دلائل کا حال انہیں سے معلوم کر لیں۔ آپ نے قطعاً حصر کا دعویٰ نہیں کیا۔ افسوس ہے کہ جس شخص کو اردو عبارت بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی، وہ قرآن و سنت کے عرفان کا مدعی بن بیٹھا ہے اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دانش و حکمت پر اعتراض کرنے پر تلا ہوا ہے اور یہ تو مقتدایانِ قوم کا حال ہے، تو اس کے آئینہ میں ہی مقتدیوں کا حال معلوم کر لیں۔ ع قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

عقیدۂ خلافت بلافصل کے مفاسدِ لازمہ

علامہ موصوف نے بیسیوں آیات اور احادیث کے بے پایاں دفاتر کی طرف اشارہ کیا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل کی دلیل ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد کتنی ہے یا کتنی نہیں، ہمیں اس سے غرض نہیں، بلکہ ہمیں یہ بتلایا جائے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ عملی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ نہیں بنیں گے یا معلوم نہیں تھا؟ دوسری شق کا بطلان تو واضح اور آشکار ہے اور پہلی شق مراد ہونے کی صورت میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان سب آیات اور احادیث کا مقصد یہ ہے کہ اُمت پر فرض ہے کہ وہ آپ کو خلیفہ بلافصل تسلیم کریں اور انہیں خلیفہ بنائیں۔ خواہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے نفرت و کراہت کا اظہار کریں یا ان سے مقصود یہ ہے کہ ان کے دعوائے امامت کی صورت میں ان کا ساتھ دیں اور ان کی اقتداء و اتباع کریں۔ صاف ظاہر ہے کہ امت پر یہ فریضہ اسی صورت میں واجب الاداء ہوگا، جب آپ بھی اس کا دعویٰ کریں اور اس کے لیے عملی اقدام فرمائیں نہ کہ جب آپ اس سے نفرت و

کراہت کا اظہار کریں اور اسے سراب اور چھٹ جانے والا اسحاب کہیں۔ بکری کے ناک کی ریزش سے بھی حقیر۔ اپنے پرانے پیوند لگے جوتے سے بھی حقیر اور خنزیر کی اس ہڈی سے بھی حقیر قرار دیں، جو جذامی کے ہاتھ میں ہو، جبکہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے کہ آپ نے قطعاً امامت کا دعویٰ نہیں کیا، تو پھر اہلِ اسلام پر آپ کو خلیفہ بنانے کی ذمہ داری کیونکر عائد کی جاسکتی ہے؟ اور ان آیات واحادیث کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟ نیز اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو خلیفہ بنائیں اور آپ اس میں کوئی دلچسپی نہ لیں اور عملی اقدام نہ کریں، تو اس کے تین وجوہ اور اسباب ہوسکتے ہیں۔ بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے دعویٰ نہ کیا ہو یا لوگوں کے طعن وتشنیع سے خوفزدہ ہوکر یا تقیہ کی وجہ سے اور یہ تینوں وجوہ باطل اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اوّل اس لیے کہ آپ کا اعلان ہے: واللّٰہ لو کنت واحدًا وھم طلاع الارض کلھا ما بالیت ولا استوحشت۔ "بخدا میں اکیلا ہوں اور میرے مخالف پورے روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہوں، تو میں قطعاً ان کی پرواہ نہیں کروں گا اور ذرہ بھر گھبراہٹ محسوس نہیں کروں گا" وغیرذالک من الخطبات۔ اور دوسری شق اس لیے باطل ہے کہ مقبولانِ بارگاہِ خداوندی اور اس کے عبادِ مخلصین کی شان ہی یہ ہے: ولا یخافون لومة لائم۔ کہ وہ راہِ خدا میں کسی ملامت کرنے والے اور طعن وتشنیع کرنے والے کی ملامت اور طعن وتشنیع کو خاطر میں نہیں لاتے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے شخص ملامتِ خلق کے ڈر سے اعلانِ حق سے کیسے گریز کرسکتے تھے؟ اور تیسری شق اس لیے باطل ہے کہ جہاں آدمی اپنے ایمان کا اظہار نہ کرسکے اور علانیہ شریعت پر عمل نہ کرسکے، وہاں سے ہجرت کرجانا فرض ہوتا ہے جیسے کہ تقیہ کی بحث میں بیان کرچکا ہوں۔ حالانکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ کہ ہجرت نہیں فرمائی، بلکہ خلفاء وقت کی اطاعت کرتے رہے اور ان کے ساتھ معاونت کا حق ادا کرتے رہے اور ان کی پاک دامنی اور نزاہت

بیان کرتے رہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ سے کما حقہ ڈرنے والے اور اس کی اطاعت کا حق ادا کرنے والے قرار دیتے رہے اور ان کی خلافت کو خلافتِ الٰہیہ موعودہ کہتے رہے وغیرذالک اور یہ دین میں کھلی مداہنت ہے جو موجبِ عذاب وعتاب خداوند تبارک وتعالیٰ ہے۔

سید نعمت اللہ الجزائری انوارِ نعمانیہ میں رقمطراز ہیں: ان غیر الجائر من الرعیة والملوك ان قدروا علی ازالته عن الملك وسكتوا عنه مداهنة فالذی یصیبهم من قصر الاعمار والملك انما هو بسبب المداهنة وقد عذب الله فی الامم السابقة من اذنب ومن داهن وجعلهم فی العذاب سواءً۔ ومن لم یقدر علی ازالته عن الملك فكان ینبغی له ان یهرب عن بلاده ویطلب بلاد الله العریضة لان السكنی مع الظالمین ذنب حتی انه ورد فی الحدیث لو ان الجعل یبنی بیتاً فی محلة الظالمین لعذبه الله بعذابهم۔

(انوار نعمانیہ جلد ثالث ص ۳۱۸)

"رعیت اور ملوک میں سے جو جور پیشہ نہیں ہیں۔ اگر وہ ظلم اور جور کے زائل کرنے پر قادر ہوں، لیکن وہ اس پر ازروئے مداہنت اور زمانہ سازی خاموشی اختیار کریں، تو انہیں عمر میں کمی اور سلطنت وحکومت میں کمی اور کوتاہی کا سامنا اسی مداہنت کی وجہ سے کرنا پڑے گا اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے پہلی امم واقوام میں جہاں انہیں عذاب سے دوچار کیا، جو گناہگار تھے، وہیں مداہنت اور زمانہ سازی سے کام لینے والوں کو بھی عذاب دیا اور دونوں کو عذاب میں برابر کردیا اور جو جور واستبداد کو ملک سے زائل کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے علاقہ سے بھاگ جائے اور اللہ تعالیٰ کے وسیع ملک اور بلاد میں ٹھکانہ بنائے، کیونکہ ظالموں کے ساتھ رہنا بھی گناہ اور جرم ہے، حتیٰ کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر گبرونڈا اور غلاظت

کا کیڑا بھی اپنی بل اور سوراخ ظالمین کے محلّہ اور اقامت گاہ میں بنالے گا، تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا کرے گا۔

مقامِ غور ہے کہ وہ کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض جو مکلّف بھی نہیں ہیں، جب ان کا حال یہ ہے تو پھر انسانوں کا کیا حال ہوگا اور بالخصوص علماء اعلام اور ائمہ کرام جو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مکلّف ہیں۔ علی الخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسے سرچشمۂ علم اور ابو الائمہ جو مقتدائے اہلِ اسلام اور پیشوائے انام ہیں۔ ان پر تو ہجرت اہم فریضہ بن چکی تھی، کیونکہ اگر دین میں تغیر و تبدل ہو رہا تھا، اور حضرت امیر علیہ السلام خاموش رہے، تو عوام اہلِ اسلام اس وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس کو برحق سمجھ لیا، تو ان کی گمراہی اور بے راہروی کا سارا بوجھ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر آپڑے گا۔ اسی لیے سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا ظهرت البدع فی امتی فلیظهر العالم علمه ومن لم یفعل فعلیه لعنة الله۔ (انوارِ نعمانیہ جلد ۳، صفحہ ۳۴۹)

"جب میری امّت میں بدعات اور غیر شرعی امور ظاہر ہوں تو عالم پر لازم ہے کہ وہ اپنا علم ظاہر کرے اور ان بدعات کی مخالفت کرے اور جو ایسا نہیں کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی۔

لیکن یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ ہجرت فرمائی نہ خلفاء سابقین کو روکا اور نہ ان کے افعال و اعمال پر تنقید فرمائی، بلکہ اپنے دورِ خلافت میں بھی انہیں کی راہ و روش پر قائم رہے اور جس طرح ان کے دورِ خلافت میں ان کی تعریف و توصیف فرماتے تھے، اپنے دورِ خلافت میں بھی ان کی مدح و ثنا فرماتے رہے، جبکہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنا تن من دھن اور خویش و اقربا تک کو قربان کر دیا، مگر زمانہ سازی اور مداہنت سے کام نہ لیا جس سے خود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات ہی موردِ الزام بن جائے گی اور آپ کے حق میں کفر یا فسق لازم آئے گا نعوذ باللہ من ذالک اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں خلیفہ بنانے اور اس منصب کے لیے مقرر کرنے والا فعل ہی عبث اور بے فائدہ ہو کر رہ جائے گا اور جب یہ بھی باطل اور وہ بھی باطل، تو جس عقیدہ کو یہ مفاسد لازم ہیں، وہ بھی لامحالہ باطل ہوگا۔ لانّ الملزوم فی حکم اللازم کما هو المقرر عند العقلاء۔

حدیثِ منزلت سے استدلال کرنے والا پہلا شخص کون ہے؟

جب خلافتِ بلافصل کا عقیدہ متعدد مفاسد کو مستلزم ہے۔ تو پھر یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ دینِ اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا اور یہ سراسر اختراعی اور افترائی نظریہ ہے، اور اس کو بعد میں عقائدِ اسلام کا جزو بنایا گیا اور مجوس و یہود و دیگر دشمنانِ اسلام نے اہلِ اسلام کے ساتھ عداوت اور دشمنی کی وجہ سے اس کو وضع کیا اور اسے رُکنِ اسلام بنا کر اس کے ذریعے دینِ اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا یہودی نے ازراہِ نفاق اسلام کا لبادہ اوڑھا اور اپنے خاص چیلے اور شاگرد تیار کیے اور انہیں اس قسم کی تعلیم دے کر لوگوں میں اس کی اشاعت اور ترویج کا حکم دیا اور اس قسم کی احادیث جو فضائلِ مرتضویہ میں وارد تھیں، ان سے اس نظریہ و عقیدہ کا استنباط اور استخراج کیا۔ چنانچہ صاحبِ ناسخ التواریخ رقمطراز ہے کہ اس عبداللہ بن سبا نے اپنے خدامِ خاص اور شاگردانِ باخلاص سے کہا: خداوند صد و بست و چہار ہزار پیغمبر بدیں زمین فرو فرستادہ ہر پیغمبرے را وزیرے و خلیفتے بود۔ چگونہ میشود کہ پیغمبرے از جہاں بردد خاصہ وقتیکہ صاحبِ شریعت باشد و نائب و خلیفتے بخلق نگمارد و کارِ امت را مہمل بگزارد ہمانا محمد را علی علیہ السلام وصی و خلیفہ بود، چنانچہ خود فرمود "انت منّی بمنزلة هارون من موسٰی" ازیں می تواں دانست کہ علی خلیفہ محمد است و عثمان ایں منصب غصب کردہ الخ (جلد دوم کتاب دوم صفحہ ۵۲۴)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس زمین کی طرف مبعوث فرمائے جن میں سے ہر ایک کے لیے وزیر اور خلیفہ تھا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اس جہان سے کوچ فرمائیں علی الخصوص جبکہ وہ مستقل شریعت اور مستقل دین کے مالک ہوں، لیکن وہ مخلوق میں اپنا نائب اور خلیفہ مقرر نہ کریں اور امت کے معاملات کو مہمل چھوڑ دیں اور ان کی سیاست اور نگرانی و نگہبانی کا بندوبست نہ کریں۔ لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وصی اور خلیفہ ہے۔ چنانچہ آپ نے خود ارشاد فرمایا اے علی! تم مجھ سے اسی مقام پر فائز ہو، جس پر حضرت ہارون علیہ السلام بنسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فائز تھے۔ اسی فرمان سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے منصبِ خلافت غصب کیا ہوا تھا۔"

یہ ہے پہلا استنباط اور اجتہاد اس خلافتِ بلا فصل کے متعلق اور پہلی تقریر اس نظریہ و عقیدہ کے وجوب و لزوم کی اور حقیقی معنی حدیثِ منزلت کا جو صرف ایک مسلم نما یہودی کو ۳۵ھ میں بیان کرنے کا پہلی دفعہ موقعہ ملا اور اس کے ارشد تلامذہ نے اس بنہاد گروہ سے یہ سبق حاصل کر کے دیگر اہلِ اسلام میں اس کا پرچار شروع کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کو غاصبانہ قرار دینے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ مجلسِ شوریٰ پر انکار و اعتراض کی گنجائش نکال لی۔ پھر آہستہ آہستہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت نشانہ بن گئی اور بالآخر خلافتِ صدیق رضی اللہ عنہ پر بھی ظالمانہ اور غاصبانہ ہونے کا فتویٰ لگا دیا، لیکن یہ سب کارروائی بڑے طویل المیعاد منصوبہ کے تحت رُو بہ عمل لائی گئی، کیونکہ حضرت صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت پر اعتراض و انکار نہ صحابہ کے دور میں ممکن تھا اور نہ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں، لہٰذا تقیہ کی آڑ لے کر اس بدعقیدگی اور گمراہی کو آہستہ آہستہ اخص الخواص تک پہنچایا جاتا رہا اور عرصہ دراز کے بعد اس یہودی سازش نے باقاعدہ مذہب کی صورت اختیار کر لی اور اہلِ اسلام

کو افتراق و انتشار سے دوچار کر دیا اور یہ نزاع و اختلاف ختم ہونے کی بجائے روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور علامہ ڈھکو صاحب جیسے مجتہدین کی ساری اجتہادی قوتیں اسی خلیج کو مزید وسیع کرنے میں ہی صرف ہو رہی ہیں، حالانکہ اگر واقعی حدیثِ منزلت یا حدیثِ غدیر وغیرہ کے وہ معانی تھے، جو اب لیے جا رہے ہیں، تو سب سے پہلے اس کا علم اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا اور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنی مسند سونپ کر جاودانی عالم کی طرف رختِ سفر باندھتے اور مہاجرین و انصار سے عملی طور پر ان کی اطاعت و اتباع کراتے، جس طرح ابوبکر صدیق نے حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) کے لیے کرا دی اور کسی قسم کے نزاع و اختلاف کا امکان باقی نہ رہا، لیکن اگر ان احادیث کے صحیح معانی سمجھ سکا تو ایک یہودی شخص اور وہ بھی سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے پچیس سال بعد۔ یاللعجب دیگر کسی مہاجر یا انصاری کو اور ہاشمی یا مطلبی کو یہ معانی سمجھ نہ آئے اور نہ کسی نے ان کا اظہار کیا اور شیعی علماء خود اپنی کتابوں میں اس قسم کی تصریحات ذکر کرنے کے باوجود اس طرف توجہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں کہ ہم کس کی اتباع کر رہے ہیں اور جس نظریہ کو ہم جانِ اسلام اور روحِ ایمان بنائے ہوئے ہیں اس کا موجد کون ہے؟ اور نہیں تو کم از کم یہی سوچ لیا جاتا کہ سب صحابہ کرام بارگاہِ خداوندی میں پہنچ چکے ہیں۔ اگر ان میں اختلاف و نزاع تھا اور کسی کے حق کو دوسروں نے غصب کر لیا تھا، تو اُس کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ کر دے گا۔ ہمیں صرف اس فرمانِ خداوندی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے تھا: تلك أُمّة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عمّا كانوا يعملون۔ وہ اُمت گزر چکی، ان کے لیے کار آمد اور مفید وہ اعمال ہیں جو انہوں نے کیے اور تمہارے لیے وہ اعمالِ صالحہ کار آمد ہیں جو تم نے کیے اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ پہلے لوگ کیا کرتے تھے، بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو؟ لیکن یہود و مجوس اور دشمنانِ اسلام کی سازش اس قدر کامیاب رہی کہ صدیوں کے بعد بھی اہلِ اسلام میں اتحاد و اتفاق پیدا نہیں ہونے دیتی، اور مسلمان ہیں کہ اس خسرانِ مبین کا سبب معلوم کرنے کا تکلف بھی گوارا نہیں کرتے۔

مُناظرہ جھوک دایہ کا اجمالی تذکرہ اور خلافت بلافصل کی انوکھی دلیل

ایک دفعہ اہل السنّت والجماعت اور اہلِ تشیع کے درمیان مناظرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اہل تشیع کے مناظر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل ثابت کرنے کے لیے کہا کہ مَیں قرآن مجید سے ثابت کرتا ہوں۔ میں حیران ہوکر دیکھنے لگا کہ یا اللہ! یہ نیری کس آیت سے سیّدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل ثابت کرے گا، تو اس نے سورۃ زخرف کی تیسری آیت وانّہٗ فی امّ الکتاب لدینا لعلیّ حکیم خاص انداز میں پڑھی کہ علی لوحِ محفوظ میں حکیم لکھے ہوتے ہیں۔ پس پھر نعرۂ حیدری بولتے ہوئے سٹیج سے کودا اور بھاگا۔ مناظرِ اہلِ سنّت بیچارہ منہ تکتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بیچارے بے خبر اور جاہلوں کو اسی طرح خلافت بلافصل کے دلائل پیش کرکے پھسلایا جاتا ہوگا۔ میں اس مناظرہ میں بحیثیتِ حَکم بیٹھا ہوا تھا، مگر فیصلہ سنانے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ علماء کا طبقہ تو شانِ استدلال اور طرزِ قلابازی دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اب وہاں کون تھا جس کو جواب دیا جاتا اور اس دلیل کے متعلق نظر وفکر کا تجزیہ کیا جاتا۔

برادرانِ وطن! اس سخت جاہل نے جس سورۃ زخرف سے حضرت سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ کی خلافتِ بلافصل ثابت کرنے کا دعوٰی کیا تھا۔ اس کی آیات خود تلاوت فرمائیں، حٰمٓ والکتاب المبین o انّا جعلناہ قرآناً عربیاً لعلّکم تعقلون o وانّہٗ فی امّ الکتاب لدینا لعلیّ حکیم o اس کا ترجمہ خود شیعہ کے مقبول ترین مترجم مقبول احمد دہلوی کی تحریر سے دیکھیے۔

"قسم ہے واضح کتاب کی، بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن مقرر کیا تاکہ تم سمجھو اور بیشک وہ ہمارے پاس ام الکتاب میں ضرور عالی شان اور حکمت والا ہے۔"

یہ تو شروع سے لے کر آخر تک صرف قرآنِ حکیم کی تعریف ہے، مگر اس سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات مراد لینے اور پھر اپنے ذہن سے خلافت نکال کر اس کے ساتھ جوڑنے اور جب خلافت کا حلقہ جُڑ گیا، تو پھر بلافصل کا لفظ جوڑنے میں کیا تکلیف ہوسکتی ہے؛ لہذا ثابت ہوگیا کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی خلافت اور وہ بھی بلافصل قرآن مجید سے ثابت ہوگئی (نعرۂ حیدری، یا علی)

ایک طرف یہ استدلال اور طرزِ استدلال تو بھلا اس کے مقابل میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف و واضح ارشاد کہ میرے بعد ابوبکر خلیفہ ہوں گے اور پھر عمر فاروق ہوں گے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کو امام الہدیٰ اور مقتدائے امت فرمانا بھی کوئی خلافت کی دلیل ہوسکتی ہے؟ فما لھٰؤلاء القوم لایکادون یفقھون حدیثا۔ امام حسن عسکری کی تفسیر نیز تفسیر قمی اور تفسیر صافی جیسی اہلِ تشیع کی معتبر کتابیں جن میں محبوبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف ارشاد کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر ہوں گے اور ان کے بعد عمر ہوں گے اور یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ تسلیم نہ کرنا تعجب انگیز دعوائے تولّی ہے خداوند تعالیٰ کے فرمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف ارشاد اور حضرت سیّدنا علی رضی اللہ عنہ اور تمام ائمہ معصومین کی واضح اور غیر مبہم تصریحات کے بالمقابل اہلِ تشیع من گھڑت تخمینے اور ٹوٹل خلافت بلافصل کے لگائیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام ائمہ معصومین کو جھٹلائیں اور ان کے ہر قول اور فعل کو جو ان کے من گھڑت مذہب کے مخالف ہو اس کو تقیہ اور فریب کاری پر محمول کریں اور پھر محب بھی بنے رہیں، کس قدر تعجب کی بات ہے۔

تحفۂ حسینیہ

از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی عفی عنہ

یہ مناظرہ جھوک دایہ کے مقام پر غالباً ۱۹۵۶ء میں ہوا تھا اور بندہ بھی اس میں حاضر تھا، جبکہ درسِ نظامی کی ابتدائی کتب کا متعلم تھا اور دارالعلوم ضیاء شمس الاسلام، سیال شریف میں ہی زیرِ تعلیم تھا۔ خلافت بلافصل کے موضوع پر مناظرہ شروع ہوا، جس میں اہلِ تشیع مُدّعی تھے، تو اہل السُنّت کے مناظر نے بار بار مطالبہ کیا کہ خلافت بلافصل تمہارا اہم اور بنیادی عقیدہ ہے اور قطعی عقیدہ ہے۔ نیز تمہارے نزدیک خلیفہ اور امام مقرّر کرنا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے' لہٰذا اس موضوع پر لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس امر کا ابھی دو منٹ میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔

بس تم قرآن مجید سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام دکھلا دو اور اس کے ساتھ خلافتِ بلافصل کا لفظ دکھلا دو، کیونکہ دوسرے جتنے قطعی عقائد ہیں' مثلاً توحید و رسالت اور قیامت۔ تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان کا بڑی صراحت اور وضاحت سے ذکر کیا ہے، جبکہ تمہارا خلافت بلافصل کا عقیدہ سب عقائد کی رُوح اور جان ہے۔ اس کا قرآن مجید میں کہیں ذکر بھی نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ لہٰذا قرآن مجید سے علی مرتضیٰ خلیفۃ اللہ بلافصل یا اس مضمون کی کوئی آیت دکھلاؤ؟

شیعی مناظر مولوی محمّد اسماعیل گوجروی صاحب پہلے ٹال مٹول کرتے رہے، بالآخر یہ آیت پڑھی جو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے بیان فرمائی ہے جس پر عوام اہلِ تشیع کی طرف سے نعرہ ہائے حیدریہ کا وہ تسلسل قائم ہو گیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بالآخر گہنہ خان گاڈی بلوچ جس کے ڈیرے پر اور جس کے زیرِ انتظام یہ مناظرہ تھا، اُس کو مناظرِ اہلِ سنّت مولانا دوست محمد قریشی صاحب نے شیعی ترجمہ مقبول دہلوی دے کر شیعی مناظر کے پاس بھیجا کہ

یا تو اپنے اس ترجمہ کو غلط کہو اور اپنی طرف سے کوئی دوسرا ترجمہ دکھلاؤ اور یا اپنے عوام کو سمجھاؤ اور بتلاؤ کہ یہاں علی بمعنیٰ عالی شان ہے اور اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات مراد نہیں ہے تاکہ یہ نعرہ بازی بند ہو اور مناظرہ جاری رہ سکے، لیکن اس دوران شیعی علماء کتابیں باندھ کر اور لنگوٹ کس کر بھاگنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ لہٰذا گاڈی صاحب کو خود ہی یہ اعلان کرنا پڑا کہ شیعی ترجمہ مقبول میں بھی علی بمعنیٰ عالی شان ہے اور اس سے قرآنِ کریم کی توصیف مقصود ہے۔ شیعہ مولوی نے صرف دھوکہ دہی سے کام لیا ہے۔

لیکن ذرا شیعی تفاسیر پر بھی نظر ڈالتے چلیں، کیونکہ گوجروی صاحب نے یہ آیت پڑھی، جس میں نہ خلافتِ بلافصل کا ذکر نہ پہلے اور نہ پیچھے نہ کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ تو آخر اس کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی۔ اگر شیعہ کے اسلاف نے اس سے استدلال نہ کیا ہوتا، تو شیعی مناظر اس کی تلاوت کا تکلف کیوں کرتا؟ لازمی طور پر یہ انوکھی طرزِ استدلال اسلاف کی تقلید میں ہی اختیار کی ہوگی چنانچہ ہم نے شیعی تفاسیر کا مطالعہ کیا، تو اسماعیل گوجروی صاحب کی مجبوری اور معذوری سمجھ آئی۔

(۱) انہٗ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم یعنی امیرالمؤمنین علیہ السلام مکتوب فی الحمد فی قولہ تعالیٰ: اھدنا الصراط المُستقیم قال ابوعبد اللہ ھو امیرالمومنین (تفسیر قمی، جلد ثانی ص ۲۷۵)

یعنی بے شک حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ام الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ کی آیت اھدنا الصّراط المستقیم میں علی حکیم ہیں۔ حضرت امام ابوعبداللہ جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ (ذات جس کا شان علی حکیم سے بیان کیا جا رہا ہے وہ) امیرالمومنین ہیں۔

(۲) و فی المعانی عن الصادق ھو امیرالمومنین فی ام الکتاب یعنی الفاتحۃ فانہ مکتوب فیھا فی قولہ" اھدنا الصراط المستقیم

قال الصراط المستقیم هو امیر المومنین و معرفته والفمی ما فی معناه - (تفسیر صافی، ج ۲، ص ۱۶۴)

اور معانی (معانی الاخبار) میں حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قول باری تعالیٰ انہٗ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور فی امّ الکتاب سے مراد سورۃ فاتحہ ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی آیت اھدنا الصراط المستقیم میں لکھے ہوئے ہیں، کیونکہ صراطِ مستقیم سے مراد امیر المومنین کی ذات ہے اور آپ کی معرفت اور تفسیر قمی میں بھی یہی معنیٰ اور مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

فائدہ ۱: یہی دو مفسّر ہیں، جن کا دعویٰ ہے کہ صرف ہماری تفسیریں صحیح ہیں اور دیگر علماء شیعہ کی تفاسیر صحیح نہیں ہیں، کیونکہ ہم نے ہی ائمہ کرام اور اہل بیت عظام کے اقوال کے ساتھ تفسیر کی ہے اور دوسرے شیعی مفسّرین نے عامہ یعنی اہل السنّت کی روایات اور تفسیری اقوال اپنی تفاسیر میں درج کر دیئے ہیں، لہٰذا ان کا اعتبار نہیں ہے۔

فائدہ ۲: پہلے تو تمہیں اس امر پر تعجب ہوگا کہ اس آیت کے ماقبل اور مابعد میں قرآن حکیم کا ذکر ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے، تو اِنّہٗ کی ضمیر غائب ان کی طرف کیسے لوٹ گئی، حالانکہ اضمار قبل الذکر بھی ممنوع ہوتا ہے اور یہاں سرے سے اس مرجع کا ذکر نہیں ہے قبل اور بعد کا تو سوال ہی کیا؟ مگر اب یک نہ شُد دو شُد والا معاملہ ہو گیا کہ صراطِ مستقیم سے بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذاتِ اقدس مراد ہے اور حضور نبی اکرم سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بمعہ جملہ اہل بیت کرام اور خود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور تمام مہاجرین و انصار اور قیام قیامت تک کی ساری امت اس صراطِ مستقیم کی طرف اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتے رہے

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

عجائباتِ تفسیر

۱- اگر لفظِ علی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں، تو یہ سراسر دھاندلی ہے، کیونکہ خبر ہمیشہ صفت اور مفہوم کلّی ہوا کرتی ہے۔ اگر یقینی طور پر عَلَم ہونا ثابت بھی ہو تو از رُوئے قاعدہ نحویہ اس کو مسمّی بفلاں کی تاویل میں کرنا پڑتا ہے، مثلاً انا زید کو انا مسمّٰی بزید کی تاویل میں کیا جائے گا اور اس سے مراد وہ ذات لی جائے گی، جو اس مفہوم عام یعنی موسوم باسم زید سے موصوف ہو، لیکن محل بحث میں اس تاویل کی گنجائش اس وقت ہو سکتی تھی، جبکہ انّہٗ کی ضمیر غائب کا مرجع اور مصداق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات ہوتی، حالانکہ اس سے قبل کتابِ مبین کا ذکر ہے۔ پھر اسی کو ضمیر غائب سے تعبیر کر کے اسے قرآنِ عربی بنانے کا تذکرہ ہے اور پھر شیعی ترجمہ میں بھی اِسی کتابِ مبین اور قرآنِ عربی کو عالی شان اور حکمت والا قرار دیا گیا ہے تو فرمایئے کہ اس ضمیرِ غائب کو ماقبل سے قطع کر کے اور مرجع مذکور ہوئے بغیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے؟ اگر اس قسم کی تفسیر روا رکھی جائے، تو قرآنِ کریم بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

۲- ام الکتاب قرآن مجید میں لوحِ محفوظ پر اطلاق کیا گیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ یمحوا اللہ مایشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب اور اس میں آسمانی کتب مذکور و مرقوم بھی ہیں۔ اندریں صورت سیاق وسباق سے ارتباط بھی واضح ہے اور اس میں قرآن مجید کا لوحِ محفوظ میں ہونا بھی واضح اور اس آیت کا دوسری آیت سے تطابق بھی روزِ روشن کی طرح عیاں "بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ" جس میں قرآن مجید کے لوحِ محفوظ میں موجود اور محفوظ ہونے کا اعلان اور واضح بیان ہے۔ لیکن شیعی تفسیر کے مطابق اس آیت کا نہ ماقبل سے کوئی ربط و تعلق رہ جاتا ہے اور نہ دوسری آیات سے توافق ہی ثابت ہوتا ہے اور

نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سورۂ فاتحہ میں مکتوب ہونے پر لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ سے حضرت ابن ابی طالب کا علی اور حکیم والے ناموں سے موسوم ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی موزونیت ہی کسی صاحبِ بصر اور بصیرت کو سمجھ آسکتی ہے

۳- علاوہ ازیں اگر صراطِ مستقیم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں جیسے کہ آپ نے شیعی تفسیر میں ملاحظہ فرمایا، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ الذین انعمت علیھم سے کون مراد ہیں، کیونکہ المستقیم کی جگہ بطورِ بیان اور تفسیر اس کو ذکر کیا گیا ہے۔ اگر صراط بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور الذین انعمت علیھم بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، تو دو خرابیاں لازم آتی ہیں، اوّل مضاف اور مضاف الیہ کا اتحاد، حالانکہ ان میں تغایر لازم ہے، کیونکہ راستہ راہ چلنے والوں کا عین نہیں ہوسکتا۔ دوم، قرآن مجید کی مخالفت، کیونکہ قرآن کریم نے الّذین انعمت علیھم کی تفسیر اور تشریح اس طرح فرمائی ہے۔ الذین انعم اللہ علیھم من النّبیّین والصّدّیقین والشھداء والصّالحین۔ یعنی ان میں سب انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین داخل ہیں، تو اس کے برعکس صرف حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تخصیص کا کیا جواز ہے؟ جبکہ سب کے لیے اصل سرچشمہ ہدایت ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، تو پھر وہ کیوں نہ مراد لیے جائیں اور ان کو بھی جب یہ دُعا کرتے دکھایا گیا کہ ہمیں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف ہدایت دے اور اُن کی معرفت عطا فرما تو آپ کی ذاتِ اقدس پر بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی افضلیت لازم آئے گی۔ حالانکہ بظاہر اہلِ تشیع اس سے انکاری ہیں، اگرچہ دوسرے تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے قائل ہیں اور اگر صراط سے مراد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہوں اور الذین انعمت علیھم سے انبیاء وصدیقین اور شہداء وصالحین تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کا صراط اور راستہ کیسے ہوگئے؟ کیا وہ سارے حضراتِ انبیاء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تابع

تھے۔؟ اور امم سابقہ کے صدّیقین اور شہداء وصالحین بھی آپ کے تابع تھے۔؟ اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے ؎

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

بہر حال ہم نے شیعہ کے مبلّغ اعظم کا منشاء استدلال عرض کرنا تھا جو کہ صافی اور قمی میں مذکور ہے اور مقبول ترجمہ کے حاشیہ پر بھی منقول ہے اور اس طرف توجہ دلانا مقصود تھی کہ شیعہ کے صرف اخلاف نے ہی نہیں، بلکہ اسلاف نے بھی قرآن مجید کی آیات کو کھلونا بنائے رکھا اور ان سب نے آیاتِ مبارکہ کے باہمی ربط وتعلّق، سیاق و سباق اور موزونیت ومناسبت کا لحاظ کیے بغیر جو جی میں آیا، وہی معنی گھڑ لیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس من گھڑت تفسیر کو ائمہ کرام کے ذمہ لگا دیا اور دروغ بافی اور کذب بیانی کی انتہا کر دی۔

الغرض مبلّغ اعظم کے استدلال میں کسر صرف اتنی رہ گئی تھی کہ کہیں خلافتِ بلافصل کا لفظ بھی مل جاتا۔ بس دلیل مکمل تھی اور لاجواب، مگر اس کا ملنا ناممکنات سے تھا، کیونکہ اصلی قرآن مجید حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غائب کر دیا اور جو وقتی مصلحت کے تحت شیعہ حضرات سینے سے لگائے ہوتے ہیں، اس میں یہ لفظ موجود ہی نہیں، اس لیے مناظرِ اعظم نے اہلِ تشیع کی نعرہ بازی دیکھی، تو موقعہ غنیمت جانا اور بھاگنے میں عافیت دیکھی اور شیعی عوام نے مبلّغِ اعظم کی اس مشکل کو حل کر دیا، اور خود ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اپنے مناظر کو ترجمہ کرنے دیں یا دوسرے مناظر نے جو مطالبہ کیا ہے دیکھیں ہمارا مناظر اس کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ بس انہیں صرف لفظِ علی بہتیرا تھا، خواہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو یا قرآن مجید کی، انہیں اس سے غرض نہیں تھی، کیونکہ ان کا اپنا دل گواہی دیتا تھا کہ بس اس سے مراد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں اور اگر ماقبل یا مابعد کے ساتھ اس کی مناسبت نہیں تو یہ قصور اہل السنّت کا ہے اور ان کے اکابر کا جنہوں نے قرآن کریم جمع کیا۔ بس انہوں نے کوئی گڑبڑ کی ہے اور الفاظ وکلمات کو اِدھر اُدھر کر دیا ہے، ورنہ کیسے ہوسکتا ہے

کہ لفظِ علی قرآن میں ہو اور اس سے مراد امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نہ ہوں اور کیوں نہ ہو، جب خواص کی جہالت یا تجاہل یا ہٹ دھرمی کا حال یہ ہو تو عوام کالانعام کا کیا کہنا؟ ع قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

علامہ ڈھکو صاحب کی خاموشی

علامہ موصوف نے اس مقام پر مکمل خاموشی میں ہی عافیت سمجھی ورنہ مبلغِ اعظم کی طرفداری نہیں کرنی تھی، تو کم از کم اپنے مفسرین کا دفاع تو کرتے اور انہوں نے بھی ائمہ کرام کی زبانی یہ تفسیر نقل کی تھی، لہذا اس کی وجہِ صحت بیان کرتے اور بتلاتے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سورۃ زخرف کی اس آیت سے کس طرح مراد لیے جا سکتے ہیں اور آپ کی ذات والاصفات مراد لینے کا باعث اور موجب کیا ہے، جبکہ یہ عقلائی قاعدے اور تفسیری کلیات کے سراسر منافی ہے۔ نیز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ لوحِ محفوظ یا سورۃ فاتحہ میں کیسے داخل ہیں، مگر آپ بھی زیادہ تکلیف اور مشقت گوارا نہیں فرماتے۔ بس جس روایت کا جواب کسی حد تک ممکن ہو، صرف اس کو چھیڑتے ہیں، ورنہ دوسرے مقامات پر بڑی خاموشی سے گزر جاتے ہیں اور بڑے شریفانہ انداز میں ؎

ایں کار از تو می آید و مرداں چنیں کنند

رسالہ مذہب شیعہ — از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

تکمیل مبحثِ فضائلِ صحابہ و ردِ تقیہ

اہلِ تشیع نے خود ساختہ مذہب کو محفوظ رکھنے کے لیے سوچا خوب ہے کہ جو حدیث اور روایت ہو، خواہ خود اہلِ تشیع کے مصنفین نے ہی اس کو ائمہ معصومین سے سنا ہو اور ان کتابوں میں لکھا ہو اور بانیانِ مذہب نے کسی ایسی کڑی کو اپنے

مذہب کے ساتھ منسلک کرنا ضروری خیال کیا ہو جو اس روایت اور حدیث کے مخالف ہو تو پھر اس تقیہ کو کام میں لایا جا سکے کہ ائمہ معصومین نے ہماری اس خود ساختہ و پرداختہ کڑی کے خلاف جو فرمایا ہے، اگرچہ وہ روایات ہماری کتابوں میں موجود ہیں، مگر بطورِ تقیہ ان ائمہ معصومین سے سرزد ہوئی ہیں۔

پس جتنی روایات اور احادیث اس مذہب کے خلاف کوئی پیش کرتا جائے گا۔ اہلِ تشیع میاں مٹھو کی طرح ایک لفظ تقیہ بولتے چلے جائیں گے تو گویا تمام احادیث و روایات پیش کرنے والے کے مقابل اہلِ تشیع کا صرف ایک طوطا جس کو صرف تقیہ کا لفظ زبان پر چڑھا دیا گیا ہو، بطورِ مناظر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ تقیہ امورِ عامہ سے بھی عام مانا گیا ہے۔ اب اس کے بعد جو چاہیں ائمہ صادقین کی طرف منسوب مذہب کو وسعت دیتے چلے جائیں، مگر اتنا تو فرمائیں کہ جب ائمہ صادقین اپنے شیعوں کو کوئی سچی بات بتلانا ہمیشہ کفر اور بے دینی یقین فرماتے تھے (نعوذ باللہ) جیسے کہ مفصل بیان ہو چکا ہے اور تقیہ کو ایک لمحے کے لیے بھی ترک فرمانا جائز نہیں سمجھتے تھے، تو پھر یہ تقیہ کے متعلق روایات بھی انہیں ائمہ کی طرف منسوب ہیں، تو پھر ان پر ایمان لانے سے پہلے بھی تقیہ کو ذہن سے خارج نہیں کرنا چاہیے اور یا تسلسل فی التقیہ پر ایمان رکھنا چاہیے۔ کم از کم اپنے مذہب کو بچانے کے لیے اتنا تو کہتے کہ ائمہ معصومین نے جو روایتیں اپنے شیعوں کے سامنے بیان کی ہیں، وہ سچی تھیں اور صرف اہل السنت کے سامنے تقیہ فرماتے تھے مگر اس صورت میں بھی مذہبِ تشیع کی بنیاد کھوکھلی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جتنے حوالہ جات میں نے اس رسالے میں پیش کیے ہیں، وہ تمام تر اہلِ تشیع کے مذہب کی معتبر کتابوں سے دیے ہیں، وہ کتابیں بجز کافی کلینی کے تمام تر ایران یا نجفِ اشرف کی چھپی ہوئی ہیں اور کافی مطبوعہ ایران بھی مل گئی ہے۔ اس میں سے بھی کافی مطبوعہ نول کشور والے حوالے دکھانے کا ذمہ دار ہوں اور جتنے حوالے دیئے ہیں، وہ ائمہ معصومین طاہرین کی روایت سے ہیں تو پھر

خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت کا انکار اور ان کی صدیقیت کا انکار کیوں؟ مولا علی رضی اللہ عنہ کی ان کے ساتھ بیعت تسلیم کرنے سے انکار کیوں؟ ان کو امام الہدیٰ، مقتداء و پیشوا تسلیم فرمانے، ان کے حق میں سب بکنے والوں کو سزا دینے اور امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا رشتہ دینے کا انکار کیوں؟ ان کی اطاعت کرنے اور ان کے مشیروں میں شامل ہونے کا انکار کیوں؟

امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کے اس صریح ارشاد کا انکار کیوں؟ جو آپ نے ایک غالی شیعہ کے سامنے پانچ مرتبہ فرمایا کہ ابوبکر صدیق ہیں اور جو ابوبکر کو صدیق نہیں کہتا، اللہ تعالیٰ اس کو دونوں جہان میں جھوٹا کرے۔ اور حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کا خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حق میں سب بکنے والوں کو بے ایمان فرمانا اور ان کو اپنی مجلس سے نکال دینا اور یہ فرمانا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں ہلاک کرے، اس کا انکار کیوں؟

تمام حوالے عرض کر چکا ہوں، فرمایئے کوئی ایک روایت بھی کسی اہل السنت کی کتاب سے پیش کی ہے؟ کتابیں بھی اہل تشیع کی اور راوی بھی ائمہ معصومین، پھر ان کی روایات پر وہ لوگ ایمان نہ لے آئیں — جو دعویٰ تشیع کا کرتے ہیں، تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ اہلِ تشیع کے مذہب اور ائمہ طاہرین کے مذہب میں بڑا فرق ہے، بلکہ دونوں میں تخالف اور تناقض ہے۔

رسالہ مذہبِ شیعہ از شیخ الاسلام قدس سرہ
(ص ۸۵/۸۶)

تحفۂ حسینیہ: از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی عفی عنہ

تتمہ مبحث فضائل

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے سابقاً ذکر کیے ہوئے فضائلِ صحابہ کرام پر مشتمل روایات کی طرف اشارہ فرما دیا ہے اور ہم نے بھی وہاں پر مزید حوالہ جات کا اضافہ کیا ہے اور یہاں پر بھی بطورِ تتمہ چند حوالہ جات درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھے ہوئے ایک خط میں اپنے لشکر کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا:

أنا مرقل نحوك في جحفل من المهاجرين والانصار والتابعين لهم بالاحسان، شديد زحامهم، ساطع قتامهم، متسربلين سربال الموت، احب اللقاء اليهم لقاء ربهم قد صحبتهم ذرية بدرية وسيوف هاشمية۔ الخ
(نهج البلاغہ مصری جلد ثانی ص۴۵)

میں تیری طرف بڑی سرعت کے ساتھ ایک عظیم لشکر ہمراہ لے کر آرہا ہوں، جو کہ مہاجرین وانصار اور ان کے صحیح تابعداروں اور کامل متبعین پر مشتمل ہے ان کا اژدحام شدید ہے اور ان کی گرد فضا میں بلند ہونے والی ہے۔ وہ موت کی قمیص پہنے ہوئے ہیں اور ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ملاقات سب سے زیادہ محبوب ہے، تو نے ان کا شرف صحبت حاصل کیا ہے اور انہیں قریب سے دیکھا ہے۔ وہ غازیانِ بدر کی اولاد ہیں اور ہاشمی تلواریں ہیں۔

تبصرہ: (۱) شیعہ حضرات کا تو دعویٰ یہ ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد سب صحابہ مرتد ہوگئے تھے (العیاذ باللہ)

ماسوائے تین حضرات کے، لیکن حضرت امیرالمومنین رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مہاجرین و انصار کی کثیر تعداد پر مشتمل لشکر کا ذکر فرما کر اہلِ تشیع کے اس زعمِ فاسد اور دعویٰ باطل کا فساد و بطلان واضح کر دیا ہے۔

(ب) مہاجرین و انصار کے بعد ان کے صحیح تابعداروں اور کامل متبعین کا ذکر فرمایا ہے۔ اگر نگاہِ مرتضوی میں خود مہاجرین و انصار ہی قابلِ تنقیص اور لائقِ تنقید ہوتے، تو ان کی اتباع و تقلید کرنے والے کس طرح مدح و ثنا کے حقدار ہو سکتے تھے، لہذا مہر نیمروز کی طرح واضح ہو گیا کہ مہاجرین و انصار حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے نزدیک خصائلِ حمیدہ اور اخلاقِ عالیہ کے مالک تھے اور ان کے مقلد اور متبع بھی لائقِ صد تحسین و توصیف تھے۔

(ج) حضرت امیر کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا کہ میرے لشکریوں کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب امر اللہ تعالیٰ کی لقاء اور اس کی بارگاہ کی حاضری ہے اور یہ ارشاد ان حضرات کے عظیم اخلاص اور ایمانِ کامل کی دلیل ہے، جبکہ وہ لشکر مہاجرین و انصار اور ان کے صحیح پیروکاروں پر مشتمل تھا، لہذا ان سب حضرات کا ایمان و ایقان میں ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہونا واضح ہو گیا۔

(د) لشکر کے نوخیز اور نوجوان سپاہیوں کو ذُرِّيَّةٌ بَدْرِيَّةٌ سے تعبیر فرمایا کہ وہ اصحابِ بدر کی نسل اور اولاد ہیں اور ان کی رگوں میں ان اصیل اور وفا شعار غلامانِ مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خون گردش کر رہا ہے اور اصل کی طہارت و نزاہت اور اس جوہر و عنصر کی خوبی کی وجہ سے نسل و اولاد کے اندر فضیلت اور امتیازی خصوصیات ثابت کرنے مقصود تھے، لہذا اس سے تمام مجاہدینِ بدر کی افضلیت، اخلاص و للّٰہیت اور پاکیزگیٔ طینت واضح ہو گئی، جن میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حقیقت کے لحاظ سے اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ اجر و ثواب کے لحاظ سے کیونکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم

کی تیمارداری کرنے کا حکم دیا تھا اور اہلِ بدر کے ثواب اور ان کے ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت میں حصہ داری کا وعدہ فرمایا تھا۔

۲۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو جو آخری وصیت فرمائی تھی، اس میں یہ بھی فرمایا تھا:

اللّٰہ اللّٰہ فی اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فانّہ اوصٰی بہم۔ (کشف الغمہ جلد اول ص۴۳۲)

"یعنی اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی (لہذا ان کے حق میں تقصیر و تفریط سے کام نہ لینا)

اور یہ حقیقت محتاجِ وضاحت نہیں ہے کہ اس وقت حضرت سلمان، حضرت ابوذر، حضرت مقداد اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ چالیس ہجری کے وقت جو اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے، وہ سبھی لائقِ عزت اور مستحقِ تکریم تھے، اور ایمان و اخلاص نہ ہونے کی صورت میں کوئی بھی مستحقِ توقیر اور تعظیم نہیں ہو سکتا۔

۳۔ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دعوا لی اصحابی۔ (انوارِ نعمانیہ جلد اول ص۱۰)

"یعنی میری خاطر میرے صحابہ کو معاف رکھنا اور ان پر طعن و تشنیع سے گریز کرنا"

فائدہ: حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں جو واسطہ اور وسیلہ ذکر کر کے یہ حکم دیا گیا کتنا عظیم ہے، یعنی میری خاطر میرے صحابہ کو معاف رکھو۔ اگر تمہیں مجھ سے کوئی تعلق اور نسبت ہے اور کسی طرح محبت و عقیدت ہے، تو اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرے صحابہ پر جرح و قدح، طعن و تشنیع اور سب و شتم سے گریز کرو۔ کیا امتی کہلانے والوں کے لیے اس سے بڑا واسطہ و وسیلہ بھی کوئی ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص ان مقدس ہستیوں پر طعن و تشنیع

سے باز نہیں آتا، تو وہ امتی کہلانے کا قطعاً حقدار نہیں ہو سکتا۔ نیز حضور نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اس وصیت کو ملا کر دیکھو، جو ابھی ذکر کی ہے، تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ راہِ نبوت و رسالت اور طریقِ ولایت و امامت پر گامزن ہونے کی سعادت صرف اس کو حاصل ہو سکتی ہے، جو اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں تنقیص و تفریط سے اور بحث و تجبیص سے گریز کرے۔

۴۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (انوار نعمانیہ ج ا ص۱)

"میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی اقتداء کرو گے، نورِ ہدایت سے بہرہ ور ہو جاؤ گے۔"

اور یہ امر محتاجِ وضاحت نہیں کہ اصحاب کا اطلاق اہل بیت اور عترتِ رسول کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ ہر اس شخص پر صحابی کا اطلاق کیا جاتا ہے جس نے ایمان و اخلاص کے ساتھ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا شرفِ صحبت حاصل کیا ہو، خواہ ایک ساعت کے لیے اور اسی حالت ایمان و اخلاص پر اس کا وصال ہوا ہو۔ لہٰذا لفظِ اصحاب کو اس معروف معنیٰ کے علاوہ کسی دوسرے معنیٰ میں استعمال کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

نیز عقلائی قاعدہ ہے کہ الفاظ کے عموم کا لحاظ کیا جاتا ہے اور خصوصِ مورد کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، جبکہ یہاں نہ مورد اور محلِ بیان میں کوئی تخصیص ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا قرینہ تخصیص کا موجود ہے اور لفظ بھی عام ہے، لہٰذا اس میں تمام مہاجرین انصار اور ان کے کامل متبعین داخل ہوں گے اور ان سب کا ستاروں کی مانند ہونا اور موجبِ ہدایت اور باعثِ رشد ہونا واضح طور پر ثابت ہو گیا اور اس لفظ کو اہل بیت کے ساتھ خاص کرنا عقلائی قاعدہ کے بھی خلاف ہے۔ عرفِ عام کے بھی خلاف ہے اور عرفِ خاص شرعی کے بھی خلاف ہے۔

۵۔ علامہ طبرسی نے "الاحتجاج" میں سلیم بن قیس ہلالی کے واسطہ سے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں مہاجرین قریش اور انصار کا باہمی مکالمہ نقل کیا ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے فریقین کے بیان کردہ مفاخر اور فضائل و فواضل کی تصدیق و تائید نقل کی ہے، جس سے ان حضرات کی عظمتِ شان اور رفعتِ مقام بزبانِ رسالت اور بلسانِ ولایت ثابت ہوتی ہے۔ مفصل روایت ملاحظہ کریں، اور مذہب اہل السنت کی صداقت و حقانیت کتبِ اغیار سے مشاہدہ کریں۔

قریش اور مہاجرین نے اپنے مفاخر اور فضائل میں یہ ارشاداتِ مصطفوی پیش کیے: (۱) الائمۃ من قریش، سب امام اور حکمران قریش سے ہوں گے۔

(۲) الناس تبع لقریش وقریش ائمۃ العرب۔ سب لوگ قریش کے تابع ہیں اور قریش عربوں کے امام اور مقتداء ہیں۔

(۳) لا تسبقوا قریشا۔ قریش سے آگے نہ بڑھو۔

(۴) ان للقریشی مثل قوۃ رجلین من غیرھم۔ قریشی کو دوسرے لوگوں کی نسبت دوگنی قوت حاصل ہے۔

(۵) قال علیہ السلام من ابغض قریشا ابغضہ اللہ۔ جو قریش کے ساتھ بغض رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بغض رکھے گا۔

(۶) قال علیہ السلام من اراد ھوان قریش اھانہ اللہ۔ جس نے قریش کی تذلیل کا قصد اور ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل و خوار کرے گا۔

(احتجاج طبرسی، مطبع جدید ص۱۴۵)

انصار کا افتخار مصطفوی ارشادات کے ساتھ

پھر انصار نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان سے صادر ہونے والے فضائل اور مناقب ذکر فرمائے:

(۱) قولہ علیہ السلام الانصار کرشی وعیبتی

یعنی انصار میرے خواص اور میرے محلِ اسرار ہیں۔

(۲) قولہ علیہ السلام من احب الانصار احبہ اللہ تعالیٰ ومن ابغض الانصار ابغضہ اللہ تعالیٰ۔ جو انصار سے محبت رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنالے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا۔

(۳) قولہ علیہ السلام: لا یبغض الانصار رجل یؤمن باللہ ورسولہ۔ انصار کے ساتھ کوئی ایسا شخص بغض نہیں رکھے گا، جس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان ہوگا۔

(۴) قولہ علیہ السلام: لو سلک الناس شعبا سلکت شعب الانصار۔ اگر لوگ ایک راہ پر چلیں (اور انصار دوسرے راستہ پر چلیں) تو میں انصار والے راستہ پر چلوں گا۔

ان عمومی فضائل ومناقب کے ساتھ ساتھ خصوصی اور شخصی امتیازات کا تذکرہ بھی کیا گیا، چنانچہ انصار نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے جنازہ کے متعلق جو کچھ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے ذکر فرمایا اور آپ کا یہ ارشاد بھی بیان کیا: ان العرش اھتز لموتہ کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی موت پر عرش لرز گیا ہے، یا یہ کہ ان کی رُوح کی آمد پر جھوم اُٹھا ہے۔

نیز جب بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں یمن کی طرف سے رومال لائے گئے اور انصار نے جب ان پر تعجب کا اظہار کیا تو حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے جنتی رُومالوں کے متعلق جو کچھ فرمایا تھا، اس کا تذکرہ بھی کیا: لمنادیل سعد فی الجنۃ احسن منہا۔ البتہ جنت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے رومال ان سے بہتر اور خوبصورت ہیں اور اسی ضمن میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی کیا گیا، جن کو ملائکہ نے شہید ہونے کے بعد غسل دیا تھا اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا بھی، جنہیں شہید ہو جانے کے بعد

زنبوروں نے دشمنوں کی طرف سے اعضاء کاٹنے اور بے حرمتی کرنے سے محفوظ رکھا۔

جس کے مقابل قریش نے کہا اللہ تعالیٰ کے رسول ہم میں سے ہیں اور حضرت حمزہ، حضرت جعفر، حضرت عبیدہ بن حارث، حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہم) ہم میں سے ہیں اور کہا: ومنا ابوبکر وعمر اور ہم میں سے ہی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) ہیں اور حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت سالم اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہم) بھی ہم سے ہیں: فلم یدعوا من الحیین احدا من السابقۃ الاسوۃ۔ چنانچہ انصار ومہاجرین نے اپنے کسی ایسے فرد کو جس میں کوئی وجہ سبقت اور سببِ فضیلت تھا، ذکر کیے بغیر نہ چھوڑا اور اس حلقہ میں دو سو سے زائد افراد موجود تھے، جن میں حضرت علی مرتضیٰ اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کے علاوہ اکابر مہاجرین وانصار موجود تھے (جن کا تفصیلی ذکر بخوفِ طوالت نہیں کیا جاسکتا) اور صبح سے دن ڈھلنے تک یہ بحث وتمحیص جاری رہی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو اس وقت خلیفۃ المسلمین تھے، وہ اپنے مکان پر تھے، انہیں اس مباحثے کا کوئی علم نہیں تھا اور اس دوران حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت میں سے کسی آدمی نے کلام نہیں کیا تھا، تو حاضرین مجلس حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا: اے ابوالحسن! آپ کیوں نہیں بولتے، آپ کے لیے اس ضمن میں کونسی رکاوٹ ہے۔

مُرتضوی تصدیق

فقال (علی) لھم ما من الحیین احد الا وقد ذکر فضلا وقال حقا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انصار اور قریش

بیں سے ہر قبیلہ نے اپنی اپنی فضیلت اور امتیازی شان بیان کی (بالعموم بھی اور بالخصوص مختلف افراد کے لحاظ سے بھی) اور ہر ایک نے بجا کہا، اور ہر ایک نے بجا کہا اور بالکل برحق کہا۔

الغرض جب قریش و انصار کے یہ فضائل و مناقب حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حقیقت ترجمان سے ثابت ہوں اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کو برحق تسلیم کریں اور مختلف شخصیات کو ہر فریق اپنے اپنے قبیلہ کے لیے سرمایۂ فخر قرار دے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں بھی ان کی تصدیق وتائید فرمائیں تو پھر مومن کے لیے ان حضرات کے ساتھ محبت وعقیدت رکھے بغیر چارہ نہیں اور نہ ہی ان حضرات کے ساتھ بغض وعداوت رکھنے کی قطعاً کوئی گنجائش ہے اور علی الخصوص خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم جب ان سب کے محبوب اور مقتدا و پیشوا ہیں، تو ان کی محبت وعقیدت کا سب مومنین کے لیے جانِ ایمان اور روحِ ایقان ہونا واضح ہوگیا اور ان کے ساتھ بغض وعداوت کا ایمان و ایقان کے سراسر مخالف ہونا روزِ روشن کی طرح ظاہر اور واضح ہوگیا۔ والحمد للہ!

۶۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاونین کی بقول علامہ رضی مؤلف "نہج البلاغہ" مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

لیسوا من المهاجرين ولا من الذين تبوؤا الدار والايمان)

یعنی یہ لوگ نہ مہاجرین سے ہیں اور نہ ہی انصار سے، جنہوں نے دار اسلام میں سکونت اختیار کی، یعنی اسلام کو اپنے ہاں جگہ دی اور ایمان کو اپنی منزل بنایا۔

علامہ ابن میثم بحرانی نے اس قولِ مرتضوی کی شرح میں کہا:

ذكر كونهم ليسوا من المهاجرين والانصار في معرض الذم لهم لكون ذالك نقصانا لهم من تلك الجهة بالنسبة الى المهاجرين والانصار وكذالك نفى كونهم من الذين تبوؤ والدار واراد بالدار مدينة الرسول صلى الله عليه وسلم

والذين تبوءوها هم الانصار من اهلها الذين اسلموا بها قبل هجرة الرسول اليهم بسنتين وابتنوا بها المساجد واليهم اشار بقوله تعالى في كتابه العزيز واثنى عليهم فقال "والذين تبوؤا الدار والايمان من قبلهم يحبون من هاجر اليهم (الى) فاولئك هم المفلحون- و في نسخة الرضى تبوؤا الدار فقط و في سائر النسخ والايمان ووصف الايمان بكونه متبوءً لهم مستعار ملاحظة بشبهه بالمنزل باعتبار انهم تبتوا عليه واطمأنت قلوبهم به-

(نهج البلاغة مع ابن ميثم ج ص۳۳)

ترجمہ ومفہوم: یعنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ مہاجرین اور انصار میں سے نہیں ہیں، تو آپ کا یہ فرمانا ان کی مذمت اور تحقیرِ شان کے لیے ہے، کیونکہ یہ امر ان کے لیے مہاجرین و انصار کی نسبت، مقام و مرتبہ میں نقص اور کمی اور تنزل کا موجب اور باعث ہے۔ نیز آپ کا ان کے متعلق یہ فرمانا کہ اہلِ شام اور اصحابِ صفین ان لوگوں سے نہیں ہیں، جنہوں نے دارِ اسلام کو اپنا مسکن بنایا یعنی مدینۃ الرسول کو اپنا مسکن بنایا اور ایمان کو اپنی منزل ٹھہرایا۔ درآں حالیکہ وہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہیں جو ہجرت کرکے ان کی طرف آتے ہیں اور وہ اپنے صدور و قلوب میں اس چیز کی حاجت اور ضرورت نہیں پاتے جو انہیں دیا گیا ہے اور مہاجرین کو اپنے نفوس اور اقرباء پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ خود محتاج اور فقیر کیوں نہ ہوں اور جو لوگ اپنے نفوس کے بخل سے بچا لیے جائیں، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اور ایمان کو ان انصار کے لیے منزل اور ٹھکانا قرار دینا مثل دار اور شہر مدینہ کے (حالانکہ ایمان اس طرح منزل اور ٹھکانا بن نہیں سکتا) تو وہ اس مناسبت و مشابہت کے پیشِ نظر ہے کہ وہ ایمان و ایقان میں ثابت قدم اور راسخ ہیں اور

ان کے قلوب اس پر اس قدر مطمئن ہیں کہ گویا ایمان ان کی منزل اور قیام گاہ ہے اور اس کو انہوں نے مسکن بنا لیا ہے۔

فائدہ: رضی کے نسخہ میں صرف دار کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ دوسرے تمام نسخوں میں "تبوؤا الدار والایمان" وارد ہے اور قرآن مجید کے مطابق بھی وہی نسخے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں بھی انصار کے مدینۃ الرسول اور ایمان کو مسکن بنانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

الغرض حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس فرمان اور قرآن مجید کے اقتباس سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ مہاجرین و انصار میں سے ہونا عظمتِ مرتبت اور رفعتِ مقام کی دلیل ہے اور مہاجرین و انصار کے اس دور میں ہوتے ہوئے یہ صفات اور کمالات حاصل نہ کر سکنا نقص اور تنزل کی دلیل ہے وہاں پر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن مجید اور اہل بیت اور ثقلین (جن کی اتباع و اقتداء کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی)، دونوں مہاجرین اور انصار کی منقبت اور مدح و ثنا میں متفق اور متحد ہیں۔ نیز انصار کا راسخ الایمان اور ثابت قدم ہونا بھی واضح ہو گیا اور خلافتِ مرتضوی کے دور میں بھی ان حضرات کا اسی وصفِ کامل کے ساتھ موصوف ہونا اور اسی امتیاز کے ساتھ ممتاز ہونا واضح ہو گیا۔

حالانکہ اہلِ تشیع نے تین حضرات کے علاوہ سب مہاجرین و انصار کے وصالِ مصطفوی کے بعد مرتد ہونے کا قول کیا ہے اور اپنی کتب قدیمہ و جدیدہ میں تصریح کی ہے ارتد الناس الا ثلاثہ جیسے کہ رجال کشی، روضہ کافی مجالس المومنین اور انوارِ نعمانیہ وغیرہ میں ہے۔ اگر امر واقعہ اور حقیقتِ حال یہ ہوتی تو نہ مہاجرین و انصار میں سے ہونا وجہِ امتیاز اور سرمایۂ فخر و ناز ہو سکتا تھا اور نہ ہی ان سے خارج ہونا نقص و حقارت اور تنزلِ مقام کا موجب اور سبب ہو سکتا تھا۔ نیز قبل ازیں حضرت امیر کرم اللہ وجہہ الکریم کے ارشاد سے ثابت کیا

جا چکا ہے کہ ان مہاجرین و انصار کی، صحیح معنوں میں اتباع و اقتدا بھی باعثِ صد افتخار ہے، تو جب اتباع و اقتدا عظمتِ شان کا موجب ہے تو ان متبوعین اور مقتدا حضرات کی شانِ والا اور رفعتِ مقام کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا شیعہ کا یہ قول سراسر بہتان اور افترائے عظیم اور افکِ مبین ہے اور صرف اور صرف سبائی ذہنیت اور سوچ و فکر کا مظاہرہ ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک

محاربین جمل و صفین کے متعلق مرتضوی نظریہ

تمام مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کے متعلق مرتد اور کافر یا منافق ہونے کا عقیدہ رکھنا تو دُور کی بات ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے تو ان حضرات کے متعلق بھی یہ نظریہ نہ اپنایا جو آپ کے ساتھ حرب و قتال اور جنگ و جدال کے مرتکب ہوئے بلکہ فرماتے ہیں وہ ہمارے بھائی ہیں، جو اپنے خیال میں حق پر ہیں اور اس وجہ سے ہمارے خلاف برسرِ پیکار ہیں جیسے کہ حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کا صحابی اور خادم خاص ابو العباس عبداللہ بن جعفر الحمیری القمی اپنی کتاب قرب الاسناد ص۴۵ پر رقمطراز ہے:

۱۔ عن جعفر عن ابیه ان علیا علیه السلام کان یقول لاهل حربه انا لم نقاتلهم علی التکفیر لهم ولم نقاتلهم علی التکفیر لنا ولکنا رأینا انا علی حق ورأوا انهم علی حق۔

یعنی امام جعفر صادق، حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ جنگ کرنے والوں کے متعلق فرماتے تھے کہ ہم نے ان سے اس وجہ سے جنگ نہیں کی کہ ہم انہیں کافر سمجھتے ہیں اور نہ ہم نے ان سے اس وجہ سے قتال کیا کہ وہ ہمیں کافر سمجھتے ہیں، لیکن اس حرب و قتال کا موجب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور ان کا عقیدہ و نظریہ یہ ہے کہ وہ حق پر ہیں۔

۲- جعفر عن ابیه ان علیّا علیه السلام لم یکن ینسب احدا من اهل حربه الی الشرك ولا الی النفاق ولکن یقول هم اخواننا بغوا علینا - (قرب الاسناد ص۴۵)

یعنی حضرت امام جعفر صادق اپنے والدِ گرامی حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ جنگ کرنے والوں میں سے کسی کو بھی شرک یا منافقت کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے، بلکہ فرماتے کہ وہ ہمارے بھائی ہیں، جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔

اور اس بغاوت کا منشا بھی بتا دیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو حق پر سمجھا اور ہمیں خطا کا مرتکب، جبکہ ہم اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں اور اسی مضمون کو نہج البلاغہ میں مندرج خطبہ کے اندر اس طرح بیان فرمایا:

وکان بدء امرنا انا التقینا والقوم من اهل الشام والظاهر ان ربنا واحد ونبیّنا واحد ودعوتنا فی الاسلام واحدة ولا نستزیدهم فی الایمان بالله والتصدیق برسوله ولا یستزیدوننا الامر واحد الا ما اختلفنا فیه من دم عثمان ونحن منه براء - (نهج البلاغه مصری، جلد ثانی - ص۱۵۱)

ہمارے امر کی ابتداء یہ تھی کہ ہم اور اہلِ شام کی ایک قوم باہم ملاقی ہوتے اور صف آراء اور یقینی بات ہے کہ ہمارا رب ایک ہے، ہمارا نبی ایک ہے اور اسلام میں ہمارا دعویٰ ایک جیسا ہے، نہ ہم ان پر اپنے آپ کو زائد سمجھتے ہیں - ایمان باللہ اور تصدیق بالرسول میں اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو ہم سے ایمان و تصدیق میں زائد اور بلند مرتبت سمجھتے ہیں - ہمارا معاملہ بالکل ایک ہے اور جملہ امور میں متحد و متفق ہیں، ماسوائے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے جس میں ہم باہم مختلف ہو گئے ہیں اور حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہم اُن کے خون سے بری الذمّہ ہیں -

الغرض حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جب محاربین کو اپنے جیسا

مؤمن سمجھتے اور ایمان و تصدیق میں اپنے ہم پلّہ، نہ مشرک و کافر سمجھتے تھے اور نہ منافق، بلکہ صرف اور صرف خطائے اجتہادی کے مرتکب سمجھتے جو اپنے زعم اور خیال میں حق پر تھے، لیکن واقع و نفس الامر میں خطا پر اور یہ حقیقتِ مسلمہ ہے کہ خطاءِ اجتہادی کی بناء پر مؤاخذہ نہیں ہوتا، تو ان ائمہ کرام کے نزدیک جب ان حرب و قتال کے مرتکب حضرات کا مقام یہ ہے تو دوسرے حضرات مہاجرین و انصار اور تابعین بالاحسان کا شان کس قدر بلند و بالا ہوگا اور ان کا ایمان اور ایقان اور اخلاص و وفا کیونکر محلِ شک و شبہ اور موردِ طعن و تشنیع ہوگا، لہٰذا شیعہ حضرات کا تین صحابیوں کے علاوہ سب مہاجرین و انصار کو مُرتد قرار دے دینا سراسر لغو اور باطل ہے اور آیاتِ قرآن مجید، احادیثِ رسول علیہ السلام اور ارشاداتِ عالیہ ائمہ کرام علیہم الرضوان کی تکذیب ہے - العیاذ باللہ تعالیٰ! جو کسی بھی ایمان و اسلام کے دعویدار کے شایانِ شان نہیں ہے -

صحابہ کرام علیہم الرضوان کے خلاف غم و غصہ کیوں؟

سابقہ صفحات میں بڑی تفصیل سے آپ کو صحابہ کرام علیہم الرضوان کے خصائل و کمالات قرآن مجید اور ائمہ کرام کے ارشاداتِ عالیہ کی روشنی میں دکھلائے اور پیش کیے جا چکے ہیں اور اہلِ تشیع کے اعتراضات کے جوابات بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، لیکن یہ خلش باقی رہ گئی ہوگی کہ آخر اسلام کے ان محسنین اور اسلام میں نئی رُوح پھونکنے والوں اور اس کو قیصر و کسریٰ کے مقبوضات میں پھیلانے والوں اور مذاہبِ عالم پر غلبہ اور فتحیابی سے ہمکنار کرنے والوں کے خلاف خود اہلِ اسلام میں ایسے لوگ کیوں پیدا ہو گئے ہیں جو ان بزرگ شخصیات کو ظالم و غاصب اور منافق و مرتد کہنے لگے ہیں اور ان کے سب و شتم کو سب سے اہم عبادت قرار دینے لگے ہیں -

ابوجہل، ابولہب اور عتبہ و شیبہ، جیسے رؤسائے مشرکین کو اور عبداللہ

بن ابی جیسے رئیس المنافقین کو تو نظر انداز کر دیا گیا اور دیگر سلاطین اور شخصی حکومتوں کے ظالم و جابر حکمرانوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، مگر اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے انتہائی مقرب یارانِ با وفا پر بحث مباحثے اور مجادلے و مناظرے جاری ہیں، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

جن کفار و مشرکین نے حضور سیدِ عالم اور مہاجرین حضرات کو ہجرت پر مجبور کر دیا، وہ قابلِ معافی مگر جس مجسمۂ وفا نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اور بال بچوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی پرواہ نہ کرتے ہوئے رفاقت اختیار کی وہ مجرم جو لوگ اہلِ اسلام اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھروں میں آرام و سکون سے نہیں رہنے دیتے تھے، ان کے حق میں کوئی سختی اور تغلیظ و تشدید نہیں، لیکن جو لوگ اپنا دین و ایمان بچانے کے لیے کبھی حبشہ کی طرف ہجرت کر کے عیسائی بادشاہ کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور کبھی گھر بار، مال و متاع اور خویش و اقربا چھوڑ کر غریب الوطن اور فقیر و درویش بن کر مدینہ منورہ میں جا کر ڈیرے لگاتے ہیں، اور اقامت گزیں ہوتے ہیں، ان پر ہر لحظہ غم و غصے کا اظہار ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

وہ انصار جو اپنے گھر اور اموال ان مہاجرین پر نثار کرتے ہیں، وہ موردِ الزام اور محلِ طعن و تشنیع اور جو کافر کبھی بدر میں اور کبھی احد و خندق کے میدان میں پرچمِ اسلام کو سرنگوں کرنے اور شمعِ اسلام کو گل کرنے کی ناپاک کوششوں میں مصروف رہے ان کے خلاف کوئی جملہ بھی زبان پر لانے کی ضرورت نہیں ہے اور جو شخص جتنا رسولِ خدا علیہ التحیۃ والثناء کا قریبی ہے اور جس کی جانی اور مالی قربانیاں جتنی زیادہ ہیں، اتنا ہی وہ قابلِ نفرت اور حقارت ہے۔ کبھی رسولِ خدا، محبوبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر نشانہ ہیں اور کبھی ان کے دوہرے داماد اور کبھی مسندِ خلافت کے اولین وارث اور جانشین ہی ہدف ہیں۔ آخر اس کا باعث و موجب کیا ہے۔؟ لازماً اس کی کچھ وجوہات تو ضرور ہوں گی۔ بلا وجہ کون کسی کا دشمن بنتا ہے اور اتنا سخت دشمن کہ باقی دشمنوں کو بھول ہی جائے، اور صرف ایک ہی ہدف اور نشانہ اس کے سامنے رہ جاتے تو آیئے اس توہم اور

مغالطہ کا اور اس خدشہ اور شبہ کا حل تلاش کریں اور اسباب و علل کی جستجو کریں اور ان محرکات و موجبات کا جائزہ لیں، جس نے ایک مدعیٔ اسلام فرقہ کو ان غازیانِ اسلام اور محسنانِ ملت کے خلاف اس قدر برافروختہ کر دیا ہے اور غیظ و غضب سے بھر رکھا ہے۔

تو اس کے لیے آپ کو ذرا یہ سوچنے کی تکلیف کرنی پڑے گی کہ ان حضرات کی مساعیٔ جمیلہ اور شبانہ روز مجاہدات سے کس کس فریق کو نقصان پہنچا اور کسے اذیت اٹھانی پڑی اور ناقابلِ برداشت ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ سب سے پہلے مدینہ طیبہ کا حال دیکھئے بنو قریظہ اور بنو نضیر کے دونوں قبائل صدیوں سے مدینہ منورہ میں آباد تھے، مگر کس رسوائی کے ساتھ ان کے وجودِ نامسعود سے مدینہ منورہ کا خطہ پاک ہو گیا۔ خیبر میں بھی یہودیوں کی حکومت و سلطنت تھی اور متعدد قلعے اور رجواڑے موجود تھے، لیکن وہ بھی ان کی ملکیت سے نکلے، بلکہ خود ان کو بھی وہاں سے نکلنا پڑا۔ بیت المقدس اور اریحا کے علاقوں میں ان کی پشت در پشت حکومت اور سلطنت چلی آ رہی تھی، چنانچہ وہ بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ ادھر مجوسیوں کے ہاتھوں فارس کی سلطنت نکل گئی۔ لہٰذا مجوسیوں اور یہودیوں اور رومیوں نے جب میدانِ کارزار میں اہلِ اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو ایک نئے محاذ پر ان کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی، جس میں پہلے پہل خلیفۂ رسول حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا شہید کرنا سرِ فہرست تھا، کیونکہ ان دشمنانِ اسلام کے خیال میں اسلام کی ساری قوت و طاقت کا منبع اور سرچشمہ صرف آپ کی ذاتِ والا صفات تھی اور ان لوگوں کا گمان تھا کہ یہ خلیفہ اگر شہید ہو گئے تو اسلام کا نہ تھمنے والا یہ سیلاب خود بخود رک جائے گا، لیکن جب ان کی شہادت کے باوجود اہلِ اسلام کا اتحاد و اتفاق قائم رہا اور فتوحات کا تسلسل جوں کا توں رہا، تو اس سازش نے دوسرا رنگ اختیار کیا۔ ایک باہمی خلفشار اور نزاع و اختلاف برپا کرنے کا اور دوسرا نظریاتی وحدت کو پارہ کرنے کا، چنانچہ پہلے محاذ پر بنو ہاشم

اور بنو امیہ کی آویزش اور محاذ آرائی برپا کرنے میں کامیابی حاصل ہوگئی اور دوسرے محاذ پر اس آویزش اور محاذ آرائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلافت مرتضوی اور پھر فدک وغیرہ کے معاملے کو وہ رنگ دیا کہ الامان والحفیظ اور اہلِ اسلام کو صرف دو گروہوں میں نہیں، بلکہ گروہ در گروہ تقسیم کر کے رکھ دیا۔

پہلی قربانی مجوسیوں نے دی اور ابو لؤلؤ مجوسی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا، جس کی سزا کے طور پر وہ خود بھی قتل کر دیا گیا، لیکن یاد رہے کہ اس کے قتل ہونے کے بعد اس مجوسی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے شیعہ نے بابا شجاع الدین کے نام سے اس کا عرس اور میلہ منانا شروع کیا۔ (ملاحظہ ہو مجالس المومنین ج ۱ صفحہ ۸)

اس کے بعد دوسری قربانی یہود نے پیش کی اور عبداللہ بن سبا کو اسلام کا لبادہ اوڑھا کر اسلام کو خاکم بدہن تباہ کرنے کا منصوبہ سونپا۔ جس طرح پولس یہودی نے عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر عیسائیت کو ختم کر دیا۔ چنانچہ اس ابن سبا نے بھی اس طرزِ عمل کو اپناتے ہوئے اسلام پر کاری ضرب لگانے کی سکیم تیار کی۔ اگر اس اجمال کی تفصیل درکار ہو تو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے قلم حقیقت رقم سے ان تاریخی حقائق کا مشاہدہ کریں۔ جن کو اس کے دامِ تزویر اور گمراہی کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں نے خود بیان کیا ہے۔ آئیے رسالہ "مذہبِ شیعہ" کا مطالعہ کریں اور یہودی سازش اور دسیسہ کاری کا نمونہ دیکھیں اور اس فکری انتشار کی ابتدا۔ اور بنیاد کا صحیح وقت اور طریقۂ کار ملاحظہ کریں۔

رسالہ مذہب شیعہ — از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

عبداللہ بن سبا یہودی اور مذہب شیعہ کی ابتدا

اسی صورتِ حال کا کھوج بھی ملتا ہے اور اربابِ عقل و شعور تو چور کو پکڑ

بھی سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اہلِ تشیع کی معتبر کتاب ناسخ التواریخ جلد دوم کتاب دوم صفحہ ۵۲۴ سطر ۶ مطبوعہ ایران (اصفہان) سنہ ۱۳۰۵ھ کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں تاکہ آپ کو حق الیقین ہو جائے کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں، وہ تعصبِ مذہبی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ واقعات کی روشنی میں اور حق و صداقت پر مبنی معروضات ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے خلفاء راشدین کے متعلق غصبِ خلافت کا قول کیا اور حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلافصل ثابت کرنے کی کوشش کی، وہ ایک یہودی تھا جس کا نام عبداللہ بن سبا تھا، جو امیر المومنین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں تقیہ کر کے مدینہ منورہ آیا تھا اور اسلام ظاہر کیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بالخصوص خلفاء راشدین سابقین کے خلاف خفیہ طور پر سب بکنا شروع کیا۔ پھر جب مدینہ منورہ سے نکالا گیا تو مصر میں جا کر ایک گروہ اپنا ہمنوا بنا لیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا اور بالآخر ایسا فتنہ برپا کیا کہ جس میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

ذکر پدید آمدن مذہب رجعت در سال سی و پنجم ہجری

عبداللہ بن سبا مردے جہود بود در عہدِ عثمان بن عفان مسلمانی گرفت و از کتب پیشین و مصاحف سابقین نیک دانا بود چوں مسلمان شد، خلافت عثمان در نظر او پسندہ نیفتاد پس در مجالس و محافل اصحاب بنشستے و قبائح اعمال و مثالب عثمان را ہر چہ توانستے باز گفتے۔ ایں خبر بعثمان بردند گفت بارے ایں جہودی کیست و فرمان کرد تا او را از مدینہ اخراج نمودند عبداللہ بمصر آمد چوں مرد عالم و دانا بود مردم بروے گرد آمدند و کلمات او را باور داشتند۔

گفت ہاں اے مردم مگر نشنیدہ اید کہ نصاریٰ گویند کہ عیسیٰ علیہ السلام بدیں جہاں رجعت کند و باز آید۔ چنانکہ در شریعتِ ما نیز ایں امر استوار است۔ چوں عیسیٰ رجعت تواند کرد محمد کہ بے گمان فاضلتر از وست چگونہ رجعت نکند۔

وخداوند نیز در قرآن کریم میفرماید اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ۔ چوں این سخن را در خاطرہا جائے گیر ساخت گفت۔ خداوند صد وبست و چہار ہزار پیغمبر بدین زمین فرو فرستاد و ہر پیغمبرے را وزیرے و خلیفتے بود چگونہ میشود پیغمبرے از جہاں برود خاصہ وقتیکہ صاحب شریعت باشد و نائبے و خلیفتے بخلق نگمارد و کار اُمّت را مہمل بگزارد۔ ہمانا محمّد را علی علیہ السّلام وصی و خلیفہ بود چنانکہ خود فرمود: "انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" ازیں میتوان دانست کہ علی خلیفہ محمد است و عثمان این منصب را غصب کردہ و با خود بستہ عمر نیز این کار بناحق بشوری افگند و عبدالرحمٰن بن عوف بہوائے نفس دست بر دست عثمان زد و دست علی را کہ گرفتہ بود کہ با و بیعت کند رہا داد۔

اکنوں بر ما کہ در شریعت محمدیم واجب میکند کہ از امر بمعروف و نہی از منکر خویشتن داری نکنیم، چنانکہ خدائے فرماید: "کنتم خیر امّۃ اخرجت للنّاس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" پس با مردم خویش گفت ما را ہنوز آں نیرو نیست کہ بتوانیم عثمان را دفع داد۔ واجب میکند کہ چنداں کہ بتوانیم عمالِ عثمان را کہ آتشِ جور و ستم را دامن ہمی زنند ضعیف داریم و قبائح اعمال ایشان را بر عالمیان روشن سازیم و دل ہائے مردم را از عثمان و عمال او بگردانیم۔

پس نامہا نوشتند و از عبداللہ بن ابی سرح کہ امارتِ مصر داشت باطراف جہاں شکایت فرستادند و مردم را یک دل و یکجہت گردانیدند کہ در مدینہ گرد آیند و بر عثمان امر بمعروف کنند و او را از خلیفتی خلع فرمایند۔ عثمان این معنیٰ را تفرس ہمی کرد و مروان ابن الحکم جاسوسانِ بشہرہا فرستاد تا خبر باز آوردند کہ بزرگانِ ہر بلد در خلع عثمان ہمدستانند۔ لاجرم عثمان ضعیف شدہ در کار خود فرو ماند۔"

ترجمہ: ۳۵ھ میں مذہبِ رجعت کے پیدا ہونے کا بیان

عبداللہ بن سبا یہودی آدمی تھا، جس نے حضرت امیر عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں اسلام ظاہر کیا اور پہلی کتابوں اور صحیفوں کا اچھا عالم تھا۔ جب مسلمان ہوا تو امیر عثمان (رضی اللہ عنہ) کی خلافت اس کے دل کو پسند نہ آئی، لہٰذا اس نے مجالس اور محافل میں بیٹھ کر حضرت امیر عثمان (رضی اللہ عنہ) کے متعلق بدگوئیاں اور شکوہ و شکایات شروع کر دیں اور بُرے اعمال و اخلاق جو کچھ بھی اس کے بس میں تھا، حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنے لگا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ بات پہنچائی گئی، تو آپ نے فرمایا: یہ یہودی ہے کون؟ اور آپ نے حکم دیا کہ اسے مدینہ منورہ سے نکال دیں؛ چنانچہ عبداللہ بن سبا مصر میں پہنچ گیا اور چونکہ آدمی عالم اور دانا تھا، لہٰذا لوگوں کا اس پر جمگھٹا ہونے لگا اور لوگوں نے اس کی تقریروں پر یقین کرنا شروع کر دیا تو ایک دن اس نے کہا، ہاں اے لوگو! تم نے شاید سن رکھا ہوگا کہ عیسائی لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس جہان میں دوبارہ آئیں گے جیسا کہ ہماری شریعت میں بھی یہ بات متحقق ہے، تو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آسکتے ہیں، تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو ان سے مرتبہ میں بہت زیادہ ہیں کس طرح دوبارہ تشریف نہ لائیں گے اور اللہ تعالیٰ بھی قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ جس ذات نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے، وہ یقیناً آپ کو آپکے اصلی وطن کی طرف لوٹائے گی۔

جب اس عقیدہ کو لوگوں کے دلوں میں راسخ اور پختہ کر چکا تو کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں بھیجے ہیں اور ہر ایک پیغمبر کا ایک وزیر اور خلیفہ تھا، تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام دُنیا سے تشریف لے جائیں۔ علی الخصوص جبکہ وہ صاحبِ

شریعت ہوں اور اپنا نائب اور خلیفہ مقرر نہ فرمائیں اور امت کا معاملہ یوں ہی چھوڑ دیں۔

لہٰذا یقیناً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور خلیفہ علی علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے: انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ۔ یعنی تو میرے نزدیک ایسا ہے، جیسے حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک تھے، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت علی حضور محمد کریم علیہ السلام کے خلیفہ ہیں اور عثمان نے اس منصب کو غصب کر لیا ہے اور اپنی ذات کے ساتھ مخصوص ٹھہرا لیا ہے اور (حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ) عمر بن خطاب نے بھی ناحق منصبِ خلافت کو مجلسِ شوریٰ کے سپرد کر دیا۔"

یہ عبارت نقل کرنے سے چند گزارشات کرنا مقصود ہیں:

(۱) رجعی مذہب سب سے پہلے جس شخص نے دنیا میں پیدا کیا، وہ عبداللہ بن سبا یہودی ہے۔

(۲) خلفاء راشدین کے متعلق غاصب کہنا اور اُن کی خلافت کو ناحق قرار دینے کی ابتدا عبداللہ بن سبا سے ہوئی۔

(۳) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل کا سب سے پہلا علمبردار بھی یہی عبداللہ بن سبا ہے۔

عبداللہ بن سبا کے متعلق ائمہ ہدیٰ کی تصریحات کے ساتھ آئندہ سطور میں کسی قدر تبصرہ ہوگا، سردست اتنا عرض کرنا ہے کہ شیعوں کے مذہب کی بنیاد عبداللہ بن سبا نے رکھی۔ شیعہ کے مجتہدِ اعظم مُلّا باقر مجلسی نے اپنی کتاب "حق الیقین" صفحہ ۱۵ مطبوعہ ایران میں مقصد نہم اسی عقیدۂ رجعت کے ثبوت میں انتہائی زور و شور کے ساتھ لکھا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"بداں کہ از جملہ اجماعیاتِ شیعہ بلکہ ضروریاتِ مذہبِ حق فرقۂ محقہ حقیت رجعت است۔"

یعنی جاننا چاہیے کہ منجملہ ان اعتقادیات کے کہ جن پر تمام شیعوں کا اجماع ہے، بلکہ ان کے مذہب کے ضروریات میں سے ہے، وہ عقیدۂ رجعت کی حقانیت کا اعتراف و اقرار ہے۔

اب اہلِ دانش و بینش کے نزدیک یہ بات روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح ہو گئی کہ مسئلہ رجعت کا ظاہر کرنے والا، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو بلافصل کہنے والا اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ظلم اور غصب کی نسبت کرنے والا سب سے پہلا شخص عبداللہ بن سبا یہودی تھے اور باقر مجلسی کی تصریح سے یہ ثابت ہوا کہ اسی عبداللہ بن سبا کے عقیدے شیعوں کے ضروریاتِ دین میں سے ہیں اور شیعوں کے مجمع علیہ عقائد میں سے ہیں جیسے من لا یحضرہ الفقیہ میں شیعہ کے شیخ صدوق نے کہا (اور ملّا باقر مجلسی نے اس کا ترجمہ نقل کرتے ہوئے کہا)

"ہر کہ ایماں برجعت ندارد از ما نیست"

جس شخص کا عقیدۂ رجعت پر ایمان نہیں ہے، وہ ہم (شیعہ) سے نہیں ہے۔

اب ذرا عبداللہ بن سبا کا حال سُنیں: اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتاب "رجال کشی" صفحہ ۹۹ تا ۱۰۱ پر بھی عبداللہ بن سبا کا بیان موجود ہے۔ چونکہ اس کے متعلق یہ روایات ائمہ کرام امام زین العابدین اور امام ابوعبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہما سے مروی و منقول ہیں، لہٰذا انہیں بلفظہ مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں:

(۱) عن ابان بن عثمان قال سمعت اباعبد اللہ علیہ السلام یقول لعن اللہ عبد اللہ بن سبا انہ ادعی الربوبیۃ فی امیر المؤمنین وکان واللہ امیر المؤمنین عبداً للہ طائعاً الویل لمن کذب علینا وان قوماً یقولون فینا ما لا نقول فی انفسنا نبرء الی اللہ منھم۔

ترجمہ: ابان بن عثمان سے مروی ہے کہ میں نے ابو عبداللہ جعفر صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سُنا کہ اللہ تعالیٰ عبداللہ بن سبا پر لعنت فرمائے، اُس نے

حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں رب ہونے کا دعویٰ کیا اور بخدا امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ الکریم اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے تھے۔ اس شخص کے لیے جہنّم ہے، جس نے ہم پر جھوٹے بہتان باندھے اور ایک قوم ہمارے متعلق ایسی ایسی باتیں گھڑتی ہے جو ہم قطعاً اپنے متعلق نہیں کہتے۔ ہم ان سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف برأت کا اظہار کرتے ہیں۔

(۲) عن ابی حمزة الثمالی قال علی بن الحسین علیہ السلام لعن اللہ من کذب علینا انی ذکرت عبد اللہ بن سبا فقامت کل شعرة فی جسدی لقد ادّعیٰ امرًا عظیمًا ما لہ لعنہ اللہ کان علی واللہ عبدًا للہ صالحًا اخا رسول اللہ وما نال الکرامة من اللہ الا بطاعتہ للہ ولرسولہ وما نال رسول اللہ الکرامة الا بطاعتہ للہ۔

ترجمہ: ابوحمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت بھیجے، جس نے ہم پر جھوٹ بولا۔ میں نے میں نے عبداللہ بن سبا کو یاد کیا، تو میرے بدن کا ہر رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ البتہ تحقیق اس نے امر عظیم کا دعویٰ کیا ہے۔ اسے کیا ہے؟ اللہ اس پر لعنت کرے بخدا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی۔ انہوں نے بارگاہِ خداوندی سے جو عزّت اور کرامت پائی ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے ہی پائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزّت و کرامت حاصل کی ہے، تو وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ہی حاصل کی ہے۔

(۳) قال ابوعبد اللہ علیہ السلام انا اہل بیت صدیقون لانخلو من کذاب یکذب علینا ویسقط صدقنا بکذبہ

علینا عند الناس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصدق الناس لہجة واصدق البریة کلہا وکان مسیلمة یکذب علیہ وکان امیرالمومنین اصدق من برء اللہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان الذی یکذب علیہ ویعمل فی تکذیب صدقہ ویفتری علی اللہ الکذب عبد اللہ بن سبا لعنہ اللہ (رجال کشی ص۱۰۱ و تنقیح المقال مامقانی جلد ثانی ص۱۸۴)

ترجمہ: امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ہم اہل بیت بہت ہی سچّے ہیں مگر ہم ایسے کذابوں سے محفوظ نہیں ہیں، جو ہم پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ہمارے صدق کو اپنے جھوٹ اور بہتان کے ذریعے ناقابلِ اعتبار ٹھہراتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے زیادہ سچے تھے اور مسیلمہ کذّاب ان پر بہتان باندھا کرتا تھا اور امیرالمومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سچّے تھے اور جو شخص ان پر جھوٹ باندھتا تھا اور ان کے صدق کو کذب سے بدلنے کی سعی اور جدّ و جہد کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا تھا، وہ عبداللہ بن سبا ملعون تھا۔

(۴) (قال الکشی) ذکر بعض اہل العلم ان عبد اللہ بن سبا کان یہودیًا فاسلم ووالی علیًّا علیہ السلام وکان یقول وہو علیٰ یہودیتہ فی یوشع بن نون وصی موسیٰ بالغلو فقال فی اسلامہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی علی مثل ذالک وکان اوّل من اشہر القول بفرض امامة علیّ واظہر البرأة من اعدائہ وکاشف مخالفیہ وکفرہم فمن ہہنا قال من خالف الشیعة ان اصل التشیع والرفض ماخوذ من الیہودیة۔

ترجمہ: علامہ کشی نے کہا کہ بعض اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ تحقیق عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ بعد ازاں مسلمان ہو گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تولّی اور آپ کی محبّت

کا دم بھرنے لگا اور وہ جب یہودی تھا تو یوشع بن نون علیہ السلام کے متعلق غلو کرتے ہوئے وصی موسیٰ کہا کرتا تھا اور اسلام کا اظہار کرنے کے بعد کہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ وصی اور خلیفہ بلا فصل ہیں اور وہ پہلا شخص تھا جس نے امامتِ علی کی فرضیت کے قول اور عقیدۂ و نظریہ کو مشہور کیا اور ان کے اعداء اور مخالفین سے برأت کا اظہار کیا اور آپ کے مخالفین پر زبانِ طعن دراز کی اور ان کی تکفیر کی، لہٰذا اسی وجہ سے شیعہ کے مخالفین نے کہا کہ تشیع اور رافضیت کی جڑ اور اصل و اساس یہودیت ہے۔

(رسالہ مذہبِ شیعہ از صـ٩٠ تا صـ٩٦)

رسالہ تنزیہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

کیا مذہب شیعہ عبداللہ بن سبا یہودی کی ایجاد ہے؟

پیر صاحب آف سیال شریف نے دیگر ہم مسلک تعصب نواز اہل السنت کی طرح یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ مذہب شیعہ عبداللہ بن سبا یہودی کی پیداوار ہے (تا)، لیکن اربابِ بصیرت پر یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ یہ نسبت محض کذب و افترا ہے، جس کا واقعات سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

اولاً، تو عبداللہ بن سبا کے اصل وجود میں ہی اختلاف ہے اور بعض سنی و شیعہ مورخین کے نزدیک وہ ایک افسانوی شخصیت اور فرضی فرد کا نام ہے جس کا عالمِ حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے۔

ثانیاً، ہر مذہب والے اپنے بانیانِ مذہب کی تعریف کرتے ہیں اور اُن کا تذکرہ بڑی آب و تاب اور شان و شوکت سے کرتے ہیں، مگر پورا شیعی رجال کا لٹریچر پڑھ جایئے، کسی جگہ ایک جملہ بھی ابن سبا کی مدح میں نہیں ملے گا۔ صـ١٥٦ / صـ١٦٠

ثالثاً، پیر صاحب نے ہمارے عقیدۂ رجعت کی رد کرنا چاہی ہے اور اس کے ایجاد کا سہرا بھی ابنِ سبا کے سر باندھنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

ہم نے نہ صرف محولہ بالا مقام بلکہ وہ تمام مقامات و صفحات چھان مارے جہاں اس عبارت کے ملنے کا امکان تھا، مگر اس عبارت کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ صـ١٢٣ تنزیہ الامامیہ

تحفہ حسینیہ — از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

حقائق و واقعات کا آفتاب اپنی آنکھیں بند کر لینے سے غروب نہیں ہو سکتا

علامہ ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ عبداللہ بن سبا کو مذہب شیعہ کا بانی قرار دینا کذب و افترا ہے اور اس کا واقعات سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے، حالانکہ یہ جواب سراسر عجز اور بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے محض دعوٰی پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ شیعی کتب سے عبارات نقل کر کے اسے ثابت کیا اور حوالہ جات درج فرمائے تھے اور پورے پانچ صفحات پر پھیلی ہوئی ان عبارات کا جواب صرف کذب اور افترا کا لفظ بول دینے سے تو نہیں آسکتا۔ نیز یہ جھوٹ اور غلط بیانی اور کذب و دروغ بافی کرنے والا ہے کون؟ کیونکہ حضرت شیخ الاسلام نے تو شیعی مستند کتب کے حوالے سے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے اور شیعی علماء نے اپنے مذہب و مسلک کے متعلق اور اس کے بانی اور موجد کے متعلق جھوٹ کیوں بولنا تھا؟ اور افترا پردازی سے کام کیوں کر لینا تھا؟ لہٰذا علامہ ڈھکو صاحب کا یہ قول جواب نہیں ہے، بلکہ جواب سے فرار کی ناکام کوشش ہے۔

علامہ کشی نے اپنے رجال میں یہ حقیقت تسلیم کرلی ہے کہ واقعی مذہبِ تشیع کا بانی اور معمارِ اوّل عبداللہ بن سبا یہودی ہی ہے۔ ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیں اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے دعوٰی کی تصدیق فرمائیں:

۱۔ کان اوّل من اشہر القول بفرض امامۃ علی۔

وہی پہلا شخص تھا، جس نے امامتِ علی کے عقیدہ کی فرضیت و لزوم کو مشہور کیا۔

۲۔ کان یقول وھو علیٰ یہودیتہ فی یوشع بن نون وصی موسیٰ بالغلو فقال فی اسلامہ بعد وفاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی علی علیہ السلام مثل ذالک

عبداللہ بن سبا جس وقت یہودی مذہب پر تھا، تو غلو سے کام لیتے ہوئے حضرت یوشع بن نون کو وصیِ موسیٰ کہا کرتا تھا، تو جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اسلام کا اظہار کیا، تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں اسی طرح کہا، یعنی غلو سے کام لے کر انہیں وصیِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا۔

۳۔ واظھر البراءۃ من اعدائہ وکاشف مخالفیہ و کفرھم۔ یہی عبداللہ بن سبا پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مخالفین سے برأت کا اظہار کیا اور ان پر طعن و تشنیع سے کام لیا، بلکہ ان کی تکفیر کی۔

اور یہی تین امور عقیدۂ امامت کی فرضیت، وصیِ رسول ہونے کا عقیدہ اور تبرّا ٰہی اہل تشیع کے بنیادی عقیدہ ہیں۔

علاوہ ازیں بقول صاحبِ ناسخ التواریخ اس نے خلافتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام قبول کیا، مگر محبت اور تولّی کا دم بھرا تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ نہ خلیفۂ وقت سے محبت ضروری سمجھی اور نہ خلفائے سابقین سے، بلکہ امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف تو شکوہ و شکایات کا سلسلہ شروع کرلیا تھا اور تولّی بھی شیعہ مذہب کا اہم رکن ہے

اور اس کا بانی بھی یہی تھا اور جب ان اصولِ اربعہ کا موجد اور بانی عبداللہ بن سبا ہی تھا، تو پھر اہلِ علم کا یہ دعوٰی مبنی بر حقیقت ہونا روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا جو کہ علامہ کشی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ذکر بعض اہل العلم ان عبد اللہ بن سبا کان یہودیا فاسلم ووالی علیاً علیہ السلام (الیٰ) ومن ھٰھنا قال من خالف الشیعۃ ان اصل التشیع والرفض ماخوذ من الیہودیۃ۔ (رجال الکشی ص۱۰۱)

یعنی بعض اہلِ علم نے کہا کہ عبداللہ بن سبا پہلے یہودی تھا، پھر اسلام لایا اور حضرت علی علیہ السلام سے محبت و تولّی کا اظہار کیا (تا) اور اسی وجہ سے شیعہ کے مخالفین نے کہا کہ تشیع اور رافضیت کی اساس اور بنیاد یہودیت سے ماخوذ ہے۔

علامہ صاحب! "رجال کشی" ہماری کتاب نہیں، جناب کے مذہب کی مستند اور معتبر ترین کتاب ہے، جس کی کانٹ چھانٹ اور جانچ پرکھ کے بعد، اور ضعیف و موضوع روایات کو حذف کرنے کے بعد طوسی صاحب نے اس کو دوبارہ شائع کرایا اور اس معتبر اور مستند روایات و اقوال پر مشتمل کتاب میں خود اکابرینِ شیعہ نے اس حقیقت کو درج بھی کیا اور اس کی صحت و واقعیت کا اعتراف بھی کیا ہے اور ظاہر ہے کہ علامہ کشی و طوسی جیسے اہم علماءِ شیعہ جن کو اہلِ علم سمجھ کر ان کا قول نقل کریں، تو اُن کے سند اور حجت ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہ اہل السنت کا بہتان و افترا نہیں ہے اور نہ دروغ بافی اور غلط بیانی، بلکہ تمہارے اپنے اہلِ مذہب اکابر کی حقیقت بیانی اور صداقت ترجمانی ہے، اسے بہتان و افترا کہہ دینا سراسر غلط ہے اور محض بے بسی اور لاچاری کا اظہار ہے۔

یہودی سازش کا مرحلہ وار پروگرام

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی پیش کردہ عبارات اور روایات سے عبداللہ بن سبا کی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ موالات، آپ کی خلافتِ بلا فصل کے عقیدہ کی فرضیت اور وصیِ رسول ہونے کا دعویٰ، آپ کے مخالفین سے اظہارِ برأت اور اُن کی تکفیر کا قول اور غلو اور اسلام کا اظہار کرتے ہی حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف محاذ آرائی اور ان پر طعن و تشنیع اور غصبِ خلافت کے الزام اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ مجلسِ شوریٰ پر اعتراض کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ یہودیوں نے انتہائی گھناؤنی سازش کے تحت دو طرف سے اہلِ اسلام اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا۔ ایک طرف نظریاتی وحدت پارہ پارہ کرنے کی ٹھانی اور دوسری طرف قبائلی تعصب کو ابھارنے اور باہمی آویزش اور ٹکراؤ پیدا کرنے کی جدّوجہد کی۔

بدقسمتی سے اس خبیث الاصل کو صرف جلاوطن کرنے پر اکتفا کیا گیا تو اس کو مصر اور بصرہ و کوفہ کے علاقوں میں جو نئے نئے اسلام کے زیرِ اثر آئے تھے اور وہاں پر غیر مسلموں کی کثیر تعداد موجود تھی یا نومسلم حضرات کی، جو حقائق و واقعات کا صحیح علم اور ادراک نہیں رکھتے تھے، تو اسے ان علاقوں میں مزید کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا اور سادہ لوح اہلِ اسلام کو جو ابھی اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے تھے، انہیں ورغلانے کا موقعہ ہاتھ لگ گیا، لہٰذا یہ یہودی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا اور اس کے بعد دُنیائے کفر نے گھی کے چراغ جلائے، کیونکہ عساکرِ اسلام باہمی حرب و قتال میں اُلجھ کر رہ گئے اور عرصہ دراز تک اسلامی فتوحات کا سلسلہ مسدود ہوکر رہ گیا اور اسی باہمی حرب و قتال کے ذریعے اس یہودی کے اختراعی نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے راہ ہموار ہوگئی اور فضا سازگار ہوگئی کیونکہ جب نزاع و اختلاف اور جنگ و جدال تک نوبت پہنچ جائے تو مخالفین کے

عیوب و نقائص بیان کرنے سے کون ہچکچاتا ہے اور کم از کم سننے سے لاتعلق رہنا اور بیزار ہونا تو ممکن نہیں رہتا، لہٰذا اس حوالے سے مخالفین کے حق میں طعن و تشنیع اور ان کی مذمت و ملامت شروع کرلی گئی اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے فضائل و کمالات کے بیان میں مبالغہ آرائی اور تجاوز و افراط سے کام لیا جانے لگا۔

پھر یہیں پر بس نہ کی گئی، بلکہ خلفاء سابقین پر بھی طعن و تشنیع اور تنقید و تنقیص کے لیے راہ ہموار کرلی گئی کہ اگر یہ خلافت فاروق شوریٰ پر نہ چھوڑتے، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نامزد فرما دیتے، تو نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنتے نہ ان کے خلاف شکایات پیدا ہوتیں اور نہ نوبت اس جنگ و جدال تک پہنچتی، لہٰذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شوریٰ سے ہی یہ سب خرابیاں پیدا ہوئیں۔ پھر اس سے ترقی کرتے ہوئے خود خلافتِ فاروقی کو نشانہ بنا لیا اور اس کو محلِ تنقید و تنقیص بنا کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف طعن و تشنیع کا راستہ ہموار کرلیا کہ انہیں ہی خلیفہ نہیں ہونا چاہیے تھا، نہ وہ خلیفہ ہوتے نہ فاروقِ اعظم (رضی اللہ عنہ) خلیفہ بن سکتے، نہ شوریٰ قائم ہوتی، نہ امیر عثمان (رضی اللہ عنہ) منصبِ خلافت تک پہنچتے اور نہ یہ حالات رونما ہوتے تو گویا ساری خرابی کی جڑ سقیفہ بنو ساعدہ کا اجتماع ٹھہرا، لہٰذا سب سب مہاجرین بھی مجرم اور سب انصار بھی۔ العیاذ باللہ!

الغرض اس طرح مرحلہ وار یہودی سازش نے ان محسنینِ اسلام کے خلاف اذہان کو مسموم کرنے اور ان میں بغض و عناد کا زہر بھرنے کی مذموم و قبیح کوشش کی اور باقاعدہ ایک نیا مذہب تیار ہوگیا، جس پر موالاتِ مرتضیٰ کی بظاہر چھاپ ضرور ہے، مگر حقیقت ساری وہی ہے جو عبداللہ بن سبا یہودی کی اختراع ہے اور اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف سازش و مکروہ چال۔

کیا عبداللہ بن سبا افسانوی شخصیت ہے؟

علامہ ڈھکو صاحب نے محض اس میں اختلاف بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کوئی حتمی فیصلہ اور قطعی نتیجہ ذکر نہیں کیا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا ضمیر اس

جواب کی صحت اور درستگی کو تسلیم نہیں کرنا، ورنہ اس سے بہتر صورت گلو خلاصی کی اور کیا ہو سکتی تھی - اس ضمن میں جن مؤرخین کے نام گنوائے ہیں، وہ سبھی شیعہ ہیں، جبکہ جواب میں بعض سنی اور شیعہ مؤرخ کا دعویٰ کیا تھا - عین ممکن ہے طٰہٰ حسین کو سُنی قرار دے دیا ہو، لیکن کون نہیں جانتا کہ وہ اسلام کے تہتر فرقوں میں سے کسی فرقہ کے تو کجا خود اسلام کے ہمہ وقت پابند نہیں تھے، اس لیے اپنے مذہب کی مستند اور معتبر کتب میں مندرج ائمہ کرام کی روایات کے مقابل ایسے مؤرخین کی ذاتی رائے کو پیش کرنا ظلم عظیم ہے، لہٰذا اس کا قول ہمارے خلاف نہ حجت نہ الزام اور یہ جواب نہ بُرہانی ہوا اور نہ ہی جدلی -

رہے شیعہ علماء، تو متقدمین سبھی اس کو واقعی اور نفس الامری شخصیت تسلیم کرتے ہیں، البتہ بعض متاخرین شیعہ علماء نے اس کو افسانوی شخصیت قرار دیا ہے اور اس افسانے کا اختراع کرنے والا سیف بن عمر بتلایا ہے اور اس کو نقل کرنے اور اس کی تشہیر کرنے کا ذمہ دار ابو جعفر طبری کو ٹھہرایا ہے، لیکن یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ شیعی کتب میں امام زین العابدین، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہم سے اس کے متعلق لعن و طعن اور اس سے برأت اور بیزاری منقول ہے اور اس کے نظریات و عقائد سے نفرت اور برأت کا اظہار مروی ہے۔ (ملاحظہ ہوں رجال کشی ص۹۹ و ص۱۰۰ و ص۱۰۱ کی روایات، اور تنقیح المقال جلد دوم ص۱۸۳ و ص۱۸۴)

تو اس کے باوجود بھی اگر اس کو افسانوی شخصیت قرار دیا جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اہل تشیع نے ائمہ کرام کے نام پر جتنی روایات بیان کی ہیں، وہ سب افسانے ہیں - ہم تو بڑی فراخ دلی کے ساتھ پورے شیعی لٹریچر کو افسانہ ماننے کے لیے تیار ہیں، بلکہ مانتے ہی اسی طرح ہیں، لیکن خود شیعہ مذہب کے علماء ذرا سوچیں کہ وہ اس مذہب کا پرچار کس منہ سے کرتے ہیں؟

حضرت امام زین العابدین اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اس کے متعلق ارشاد آپ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے قلم حقیقت رقم سے ملاحظہ فرما چکے اور عبداللہ بن سنان نے حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے

نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرتا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خداوند تعالیٰ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا - ملاحظہ ہو رجال کشی ص۹۹

۱- علامہ کشی کا بعض اہل علم کے حوالے سے عبداللہ بن سبا کو واقعی شخصیت تسلیم کرنا اور اس کا سابق یہودی ہونا بھی رسالہ "مذہب شیعہ" کی عبارت میں ملاحظہ کر چکے -

۲- علامہ طوسی نے اس کو اپنے رجال میں واقعی شخصیت تسلیم کیا، لیکن ساتھ ہی کہا "رجع الی الکفر و اظہر الغلو" اُس نے کفر کی طرف رجوع کیا اور غلو کا اظہار کیا -

۳- صاحب خلاصہ نے بھی اس کے واقعی شخصیت ہونے کا اعتراف کیا اور کہا غال ملعون حرقہ امیرالمؤمنین کان یزعم ان علیاً اللہ وانہ نبی لعنہ اللہ - وہ غالی شیعہ اور ملعون ہے، اس کو امیرالمؤمنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جلا دیا تھا - وہ یہ زعم اور عقیدہ فاسدہ رکھتا تھا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خدا ہیں اور وہ خود نبی ہے - اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے - ملاحظہ ہو تنقیح المقال ص۱۸۳ و ص۱۸۴ جلد ثانی اور رجال کشی مع حاشیہ ص۹۹ تا ص۱۰۱ جس میں ائمہ کرام اور اکابرین علماء شیعہ کی زبانی اس کو واقعی شخصیت تسلیم کیا گیا اور اس کے عقائد و نظریات حتیٰ کہ اس کا انجام بھی بصراحت ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا اس کو افسانوی شخصیت قرار دینا سراسر عجز اور بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور ائمہ کرام کی طرف منسوب روایات کے ناقابل اعتبار ہونے کی بیّن دلیل، جو شیعہ مذہب کے اس دعویٰ کو بیخ و بُن سے اکھیڑ کر پھینک دے گی کہ ہمارا مذہب اہل بیت کرام سے منقول ہے -

آخر غالی شیعوں کا امام کون ہے؟

جب ائمہ کرام اور اکابر شیعہ کے اقوال سے عبداللہ بن سبا کا واقعی شخصیت ہونا واضح ہو گیا اور اسے افسانوی شخصیت قرار دینے کی لغویت واضح ہو گئی تو اب

ایک اور پہلو سے بھی علامہ موصوف کے اس جواب کی لغویت ملاحظہ فرمائیں
وہ پہلو یہ ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور حضرت علی مرتضیٰ
رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس کو روایت کرتے ہوئے فرمایا: سیہلک فیّ
صنفان محب مفرط یذهب به الحب الی غیر الحق و مبغض
مفرط یذهب به البغض الی غیر الحق۔ یعنی عنقریب میری وجہ
سے دو گروہ ہلاک ہوں گے۔ ایک محبت میں حد سے تجاوز کرنے والا جس کو محبت
غلو اور افراط راہ راست سے دور لے جائے گا اور دوسرا بغض اور عداوت کی وجہ
میری شان میں تحقیر و تنقیص کرنے والا جس کو یہ بغض و عناد اور تقصیر و تفریط غلط
اور ناصواب راہ پر ڈال دے گی۔ وخیر الناس فیّ حالا النمط الاوسط
اور میرے متعلق سب سے بہتر حالت اور صحیح راہ پر گامزن وہ ہوگا جو میانہ روی
اور اعتدال سے کام لینے والا ہوگا اور افراط و تفریط سے محفوظ ہوگا۔ (نہج البلاغہ
ج ۲ ص ۲۹۸)

لہٰذا اس فرمانِ واجب الاذعان کے تحت غالی جماعت کا پیدا ہونا تو
لازمی امر ہے اور یہ خبر صادق قطعاً غلط اور خلافِ واقع نہیں ہو سکتی اور خود
اثنا عشری شیعہ کو بھی غالی شیعہ کی موجودگی کا اعتراف ہے جو حضرت علی مرتضیٰ
رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کرام کو الٰہ اور معبود برحق تسلیم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ تو اگر
اس گروہ اور جماعت کا بانی اور مقتداء و پیشوا عبداللہ بن سبا نہیں، تو پھر اس کے
ہیرو اور بانی و موجد کی نشان دہی کی جائے کہ وہ کون تھا اور اس کا طریقۂ
واردات کیا تھا؟ تو اس کا جواب بھی شیعی کتب سے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ علامہ سید نعمت اللہ الجزائری الموسوی المتوفی ۱۱۱۲ھ نے اپنی معروف
زمانہ کتاب "انوارِ نعمانیہ" میں سبائیہ شیعہ کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ بن سبا یہودی
کو اس فرقہ کا مقتداء و پیشوا اقرار دیا ہے اور اس کے وہی عقائد و نظریات بیان
کیے ہیں جو رجال کشی کے حوالے سے ذکر کیے جا چکے ہیں۔

قال عبد الله بن سبا لعلیّ علیه السلام انت الاله

حقاً فنفاه علی الی المدائن وقیل انه کان یهودیاً فاسلم
وکان فی الیهودیة یقول فی یوشع بن نون وفی موسیٰ
مثل ما قال فی علی وقیل انه اول من اظهر القول بوجوب
امامة علیّ ومنه تشعبت اصناف الغلاة۔
(انوارِ نعمانیہ جلد ثانی ص ۲۳۴)

یعنی عبداللہ بن سبا نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم ہی حقیقت میں اللہ
اور معبود برحق ہو، تو آپ نے اس کو مدائن کی طرف جلا وطن کر دیا اور کہا گیا ہے کہ وہ یہودی
تھا، بعد ازاں اسلام لایا اور یہودی ہوتے ہوئے اس نے حضرت یوشع بن نون
اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے متعلق جو کچھ کہا، وہی اس نے اسلام لانے کے بعد
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں کہا اور کہا گیا ہے کہ وہی پہلا شخص ہے جس نے
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے وجوب و لزوم کا قول کیا اور اسی سے ہی
غالی شیعہ کے جملہ اصناف و اقسام پیدا ہوئے ہیں۔

وقال عبد الله بن سبا ان علیاً علیه السلام لم یمت
ولم یقتل وانما قتل ابن ملجم شیطانا تصور بصورة
علیّ وعلیّ علیه السلام فی السحاب والرعد صوته و
البرق ضوءه وانه ینزل بعد هذا الی الارض یملاءها
عدلا وهؤلاء یقولون عند سماع الرعد علیك السلام
یا امیر المؤمنین۔ (انوارِ نعمانیہ جلد ثانی ص ۲۳۴)

اور عبداللہ بن سبا نے کہا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فوت نہیں ہوئے
اور نہ ہی قتل کیے گئے ہیں اور ابن ملجم نے ایک شیطان کو قتل کیا تھا جو حضرت
علی رضی اللہ عنہ کی صورت و شکل میں نمودار ہوا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بادلوں
میں ہیں اور بادلوں کی گرج دراصل انہی کی آواز ہے اور برق دراصل انہی کی
چمک ہے اور وہ ایک زمانہ میں زمین کی طرف اتریں گے اور اسے عدل اور
انصاف سے بھر دیں گے اور سبائی لوگ بادل کی گرج کے وقت علیك السلام

یا امیر المؤمنین کہتے ہیں ۔

الغرض نعمت اللہ الموسوی المتوفی ۱۱۱۲ھ نے ابن سبا کے وجود کو بھی تسلیم کیا اور اس کے عقائدِ فاسدہ کو بھی، جن میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا عقیدہ بھی شامل ہے اور ان کی امامت کی فرضیت کا اور ان کے دوبارہ دنیا پر تشریف لانے کا، جسے رجعت کہا جاتا ہے اور اس کا جملہ اقسام و اصنافِ غلاۃ کا مقتداء و پیشوا ہونا بھی تسلیم کیا ہے ۔

۲۔ علامہ ابن ابی الحدید شیعی معتزلی نے شرح نہج البلاغہ میں اس گروہ کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ تحریر کیا وہ بھی ملاحظہ کرتے چلیں ۔

سوال : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے بہت زیادہ معجزات دیکھے، لیکن آپ کے حق میں الوہیت و ربوبیت کا قول نہ کیا، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چند کرامات دیکھ کر آپ کی الوہیت کا قول کر ڈالا، آخر اس کا سبب کیا ہے ؟

جواب ۱ : صحابہ کرام علیہم الرضوان جنہوں نے آپ سے معجزات کا مشاہدہ کیا، وہ پختہ ارادے والے تھے اور عظیم عقول و اذہان کے مالک تھے ۔ لیکن ان کے برعکس یہ جماعت ضعیف رائے اور سخیف عقل کی مالک تھی اور اس جماعت نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا صرف آخری دور دیکھا تھا، مثل عبداللہ بن سبا کے اور ان کے رفقاء اور ہمنواؤں کے، جن کی بصیرت و فراست کی رکاکت و سخافت اور ضعف و کمزوری کا حال معروف اور مشہور تھا، لہذا ان کے متعلق کوئی تعجب نہیں کہ آپ سے سرزد ہونے والے چند کرامات اور خوارقِ عادات دیکھ کر انہوں نے از روئے سخافتِ عقل یہ سمجھ لیا ہو کہ آپ میں جوہرِ الوہیت نے حلول کیا ہوا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں جوہرِ الوہیت کے حلول کے بغیر کسی بشر سے ایسے خوارقِ عادات کا صادر ہونا ممکن ہی نہیں تھا ۔

جواب ۲ : وقد قیل ان جماعۃ من ھٰؤلاء کانوا من نسل النصاریٰ والیھود وقد کانوا سمعوا من آباءھم و

اسلافھم القول بالحلول فی انبیاءھم و رؤسائھم فاعتقدوا فیہ علیہ السلام ذالک ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان غالی شیعوں کی ایک جماعت نصاریٰ اور یہود کی نسل سے تعلق رکھتی تھی اور انہوں نے اپنے آباؤ اجداد اور اسلاف سے اپنے انبیاء کرام اور رؤسا کے حق میں جوہرِ الوہیت کے حلول کا قول سن رکھا تھا، لہذا انہوں نے آپ کے متعلق بھی وہی قول کر دیا اور اسلاف کا عقیدہ آپ کے حق میں بھی اپنا لیا ۔

جواب ۳ : ویجوز ان یکون اصل ھذہ المقالۃ من قوم ملحدین ارادوا ادخال الالحاد فی دین الاسلام فذھبوا الیٰ ذالک (شرح حدیدی جلد سابع صفحہ ۵)

اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ نظریہ و عقیدہ دراصل ملحد اور بے دین لوگوں کی طرف سے (اسلام کے خلاف سازش) ہو، جنہوں نے دینِ اسلام میں الحاد اور بے دینی کو داخل کرنے کی سازش کی، لہذا وہ اس راہ پر چل پڑے ۔

الغرض ابن ابی الحدید کے اس کلام سے واضح ہو گیا کہ صرف ایک عبداللہ بن سبا ہی نہیں، بلکہ ایک پارٹی نے اسلام پر کاری ضرب لگانے کے لیے آباء و اجداد کی راہ و روش پر چل کر درجہ بدرجہ اس الحاد اور بے دینی کو اہلِ اسلام تک پہنچا دیا اور بہت سے مدعیانِ اسلام ان کے دامِ تزویر میں پھنس گئے اور اس الحاد و بے دینی اور گمراہی و ضلالت کو حقیقی اسلام اور روحِ ایمان سمجھ بیٹھے، حالانکہ ان یہود و نصاریٰ کا صرف اور صرف یہ مقصد تھا کہ مسلمانی کا روپ اختیار کر کے اہلِ اسلام میں گھس جاؤ اور ان میں ایسے عقائد اور نظریات کو جاری کرو اور انہیں رواج دو کہ بظاہر مسلمانی کا دم بھرنے کے باوجود حقیقت میں صرف اور صرف یہودی ہوں یا نصرانی یا ان سے بھی بدتر ۔

مجوسی سازش اور فرقہ اسماعیلیہ کی ابتدا

اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف دشمنانِ اسلام کی ایسی ہی تدابیر و دسیسہ کاریوں کا اثنا عشری شیعہ بھی اقرار اور اعتراف کرتے ہیں، چنانچہ سید نعمت اللہ الجزائری

الموسوی نے شیعہ کے معروف فرقہ اسماعیلیہ کے عقائد و نظریات پر بحث کرتے ہوئے کہا:

واصل دعوانهم الیٰ ابطال الشرائع ان العبادیة وهم طائفة من المجوس راموا عند قوة الاسلام تاویل الشرائع علیٰ وجوه تعود الیٰ قواعد اسلافهم وذالك انهم اجتمعوا وتذاکروا ما کان علیهم اسلافهم من الملك وقالوا لا سبیل لنا الیٰ دفع المسلمین بالسیف لغلبتهم علی الممالك لکن نحتال بتاویل شرائعهم الیٰ ما یعود الیٰ قواعدنا و نستدرج به الضعفاء منهم فان ذالك یوجب اختلافهم و اضطراب کلمتهم ورأسهم فی ذالك حمدان قرمط (انوار نعمانیہ ص ۲۴۳ ج ۲)

ان کا اصل مدعا و مقصود شرعی عقائد و احکام کو باطل ٹھہرانا ہے۔ عبادیہ جو مجوسیوں اور ایرانی آتش پرستوں کی جماعت تھی، انہوں نے اسلام کے غلبہ اور قوت حاصل کر لینے کے بعد شریعت کی ایسی تعبیر اور تشریح کا عزمِ مصمم کیا، جس کے ذریعے وہ اسلام کے عقائد و نظریات اور احکام و اعمال کو اپنے اسلاف کے اصول و قواعد پر منطبق کر دیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ اور مجلسِ مذاکرہ منعقد کی اور اپنے اسلاف کی حکومت و سلطنت اور عظمت و رفعت کا ذکر کیا۔ (اور موجودہ پستی اور غلامی کا) اور کہا کہ ہمارے لیے بزورِ شمشیر اہلِ اسلام کو اس علاقہ سے باہر نکالنے کی قدرت و طاقت نہیں، کیونکہ وہ بہت سے ممالک پر غالب آ چکے ہیں (اور عظیم قوت اور ناقابلِ تسخیر طاقت بن چکے ہیں) لیکن اگر کوئی حیلہ گری اور چارہ سازی ہے، تو صرف یہ ہے کہ ان کی شریعت کی تعبیر و تشریح ایسی کریں جو اسلام کو ہمارے اصول و قواعد کی طرف لوٹا دے اور ان پر منطبق کر دے اور اس طرح آہستہ آہستہ ضعیف العقل اور ضعیف العقیدہ لوگوں کو اسلام کی صحیح راہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ہماری اس چال اور حیلہ گری سے ان میں لازمی طور پر ان میں اختلاف پیدا ہو جائے گا اور ان کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی اور اس کا اصل بانی اور اس جماعت کا سرغنہ حمدان قرمط تھا۔

(نوٹ) علامہ جزائری صاحب نے عبادیہ مجوسیوں کے متعلق اسلام کے خلاف حیلہ گری اور سازش کا تذکرہ کیا اور ان کی منصوبہ بندی بیان کی ہے لیکن مقامِ غور ہے کہ جس طرح مجوسیوں کے دلوں میں اسلام کی ترقی اور اہلِ اسلام کی فتوحات سے آگ لگی ہوئی تھی۔ کیا یہود و نصاریٰ کے دلوں میں یہ آگ نہیں بھڑکی ہو گی اور انہوں نے اپنی حکومت و سلطنت کے ختم ہو جانے اور عظمت و رفعت کے خاک میں مل جانے کو ٹھنڈے دل سے قبول کر لیا ہو گا اور اسلام کے آفتاب کے نصف النہار پر چمکنے کو حسد و بغض کی نظروں سے نہیں دیکھا ہو گا؟ یقیناً یہ آگ سب دشمنانِ اسلام کے قلوب میں برابر لگی ہوئی تھی اور ایران و فارس میں اگر مجوسی لوگ سازشوں میں مصروف تھے، تو عراق و شام اور فلسطین و مصر میں یہود و نصاریٰ سرگرمِ عمل تھے اور اسلام کو مٹانے میں تب بھی متفق تھے اور اب تک بھی اسی راہ پر گامزن ہیں اور ملتِ واحدہ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک طرف عبداللہ بن سبا یہودی اینڈ کمپنی اسلامی نظریات پر حملہ آور تھی اور دوسری طرف عبادیہ مجوسی۔

اور اگر شیعی عقائد و نظریات پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہ سراسر یہودیت اور مجوسیت وغیرہ کا ہی ملغوبہ نظر آتے ہیں اور اہلِ اسلام کی فریب دہی کے لیے ان میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی کر لی گئی ہے اور انہیں اسلام سے دُور کرتے ہوئے عقیدۂ امامت سے عقیدۂ اُلوہیت تک پہنچا دیا اور لف حریر کے تکلف کے بعد محارم یعنی ماں، بہن اور بیٹی تک کو حلال ٹھہرا دیا اور لواطت بھی حلال کر دی۔ بعض نے صرف بیویوں کے ساتھ اور بعض نے بلا تخصیص اور زنا کو بھی حلال قرار دے دیا، مگر متعہ کا نام استعمال کر کے اور اس میں تعداد اور گواہوں کی پابندی ختم کر کے۔

الغرض بنظرِ انصاف دیکھا جائے، تو یہ فرقہ اسلامی فرقہ نہیں، بلکہ مذہب کی آڑ میں اسلام سے سیاسی انتقام کی بھیانک سازش ہے اور اسلام و اہلِ اسلام کو نیست و نابود کرنے کا ناپاک منصوبہ جس کو نہ اہل بیت کرام سے

تعلق اور نہ اُن کی سیادت وقیادت سے، بلکہ محض اپنے قلبی غیظ وغضب کو سامانِ تسکین مہیا کرنے سے غرض ہے اور صرف زبانی زبانی اسلام کا نام لینے والے یہودی اور مجوسی تیار کرنے سے غرض ہے، جس میں بدقسمتی سے وہ کافی حد تک کامیاب ہو گئے اور اسلام کی قوّت وطاقت کو اہلِ اسلام میں باہمی آویزش اور اختلافات کے ذریعے ضعیف وناتواں کر دیا اور وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر کے اس کی روز افزوں ترقی کو روکنے میں اور اپنے قلوب کو سامانِ تسکین وراحت پہنچانے میں فائز المرام ہو گئے۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔
اے کاش! علماءِ شیعہ یہود ومجوس کی اس سازش کا خود تذکرہ کرنے کے بعد اس سے عبرت بھی حاصل کرتے اور اس دامِ تزویر کو تار تار کر کے اس سے باہر آجاتے اور حقیقت کے اعتراف میں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے اور تلافیٔ مافات کرتے ع مگر ایں کار نیست کہ موقوفِ ہدایت باشد

عبداللہ بن سبا یہودی اور صاحبِ ناسخ التواریخ

قبل ازیں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے قلمِ حقیقت رقم سے ناسخ التواریخ جلد دوم، کتاب دوم ص۵۲۴ کی عبارت ملاحظہ فرما چکے اور اس کی طرف سے مذہبِ رجعت، عقیدۂ خلافتِ بلافصل اور وصیٔ رسول اللہ کا عقیدہ رائج کرنے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش کی تفصیل ملاحظہ کر چکے۔ اب اس کے اور اس کی جماعت کے عقائد کی مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں اور ان کو اہلِ تشیع کے مذہب پر منطبق کر کے دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ آیا اس مذہب کا بانی اور موجد یہی عبداللہ بن سبا ہے یا نہیں ہے؟

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا گزر ایک ایسی جماعت پر ہوا جو رمضان المبارک میں دن کو کھا پی رہے تھے، تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم بیمار ہو یا مسافر؟ تو انہوں نے کہا بالکل نہیں۔ آپ نے فرمایا، تم اہلِ کتاب میں سے ہو؟ اور ذمی ہو؟

تو انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا، پھر رمضان المبارک میں کھانے پینے کا تمہارے لیے کیا جواز ہے؟ تو اس جماعت کے رہنما نے کہا،

عبداللہ بن سبا کہ از مردم غالی اول کس است گفت انت انت وازیں سخن قصد کرد کہ توئی خداوند یزداں وآفرینندۂ انس وجان۔

یعنی عبداللہ بن سبا جو غالی شیعوں کا مقتدا اور پیشوا تھا، اُس نے کہا تو تو ہے، یعنی تو خداوندِ مہربان ہے اور خالقِ انس وجان ہے۔

آپ نے اس کا مقصد سمجھ لیا، تو فوراً گھوڑے سے چھلانگ لگا کر زمین پر اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہو گئے اور پھر سرِ مبارک کو اُٹھا کر فرمایا: تمہارے لیے ہلاکت ہو، میں تو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک عام بندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اسلام کی طرف واپس آؤ۔

الغرض آپ نے ان کو اپنے ہمراہ لے جا کر اسلام میں داخل ہونے اور ان کفریہ عقائد سے توبہ کرنے کی بہت تلقین کی، لیکن انہوں نے ذرّہ بھر اثر قبول نہ کیا، پھر آپ نے مجبور ہو کر انہیں آگ میں جھونک دینے کا حکم دیا، مگر اس جماعت نے آگ کے تنوروں میں جھونکے جانے پر بھی اور آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ کر بھی یہی نعرہ بلند کیا۔ الآن ظہر لنا ظہورا بیّنا انک انت الالٰہ۔ اب ہمیں پہلے سے بھی زیادہ وثوق اور یقین کامل حاصل ہو گیا ہے کہ واقعی تم الٰہ اور معبودِ برحق ہو کیونکہ آپ کے چچا زاد بھائی جنہیں آپ نے رسول بنا کر بھیجا تھا ہمیں بتایا تھا لا یعذب بالنّار الا ربّ النّار کہ آگ کے ساتھ عذاب دینا صرف آگ کے مالک اور خالق کا ہی کام ہے اور تم نے ہمیں آگ کے ساتھ عذاب دیا ہے لہٰذا تمہارا خالق ومالک اور الٰہ برحق ہونا ہم پر پوری طرح واضح ہو گیا ہے چنانچہ جل کر خاکستر ہو گئے، مگر اس عقیدہ پر ثابت قدم اور مستحکم رہے، انہیں دو گڑھوں میں جل مرنے کی حسرت میں شیعی شاعر نے کہا ہے ؎

لتزم بی المنیۃ حیث شاءت — اذا المنزم بی فی الحفرتین
اذا ما حشتا حطب النار — فذاک الموت نقداً غیر دین

اب موت مجھے جدھر چاہے پھینکے، جبکہ اس نے مجھے ان دو گڑھوں میں نہیں پھینکا جبکہ وہ جلتی اور بھڑکتی لکڑیوں کے ساتھ بھرے جا چکے تھے، تو وہ موت نقد تھی نہ کہ ادھار۔

۲۔ وہ جماعت جل گئی (جس کی تعداد بقول علامہ کشی وغیرہ ستّر تھی) مگر ان کے پیر و مرشد عبداللہ بن سبا نے جب مقصود و مدّعا پر پانی پھرتا دیکھا اور سازش و حیلہ گری کو ختم ہوتے دیکھا، تو توبہ کا اظہار کر کے جان بچانے کی ٹھانی اور حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دیگر مقربانِ خاص کو اپنا سفارشی بنا لیا۔ چنانچہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر اس کی توبہ قبول کی اور اسے رہا کرنا منظور فرمایا کہ وہ ان کے ساتھ کوفہ شہر میں رہائش پذیر نہیں ہوگا، بلکہ مدائن کی طرف چلا جائے گا، چنانچہ وہ کوفہ سے مدائن کی طرف منتقل ہو گیا اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو عبداللہ بن سبا نے پھر سابقہ عقائد کا پرچار شروع کر دیا اور کافی لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نیا عقیدہ یہ ظاہر کیا کہ اگر ان کا دماغ ستّر تھیلیوں میں میرے سامنے حاضر کرو، تو پھر بھی میں قطعاً ان کی وفات کا یقین نہیں کروں گا: لعلمنا انہ لم یمت ولا یموت حتیٰ یسوق العرب بعصاہ۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ وہ نہ فوت ہوئے ہیں اور وہ نہ فوت ہوں گے، حتیٰ کہ تمام اہلِ عرب کو اپنے زیرِ فرمان لائیں گے، اور ان پر حکمرانی فرمائیں گے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ عبداللہ بن صبرہ ہمدانی، عبداللہ بن عمرو بن حرب الکندی اور اس قسم کے بڑے بزرگ لوگ اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، وسخن ایشاں در بلاد و امصار رفت و مردمان در شک و شبہ افتادند۔ ان لوگوں کے اقوال اور وسوسے دور دراز شہروں اور علاقوں تک جا پہنچے اور لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔

بعض نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی غیبی خبروں کو سن کر اور واقعیت کا مشاہدہ

کر کے اور بعض نے خیبر کا دروازہ اکھیڑنے اور اس کا یہ سبب بیان کرنے سے ما قلعت باب خیبر بقوۃ جسدانیۃ بل بقوۃ الٰہیۃ۔ کہ میں نے بابِ خیبر کو جسمانی قوّت سے نہیں، بلکہ قوّتِ الٰہیہ سے اکھیڑا ہے۔ یہ عقیدہ اپنا لیا کہ آپ کے اندر اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہوا ہے اور بعض نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد سے آپ کی الوہیت کی طرف اشارہ سمجھ لیا: وحدہٗ صدق وعدہٗ، نصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔ وہ اکیلا ہے، اس نے اپنا وعدہ سچّا کر دیا۔ اپنے عبدِ خاص کی امداد و نصرت فرمائی اور اکیلے عساکرِ کفار کو شکست دی، کیونکہ غزوۂ خندق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی عمرو بن عبدِ وُد کو قتل کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح امداد فرمائی، لہٰذا ان کلماتِ طیّبات کا (مقصد و مطلب اپنی کج فہمی اور کور مغزی سے یہی سمجھ کر ان کا) مصداق حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بنا ڈالا، الغرض الوہیتِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر اس طرح کے دلائل قائم کر لیے گئے اور ان عقائد کا پرچار خفیہ انداز میں جاری رہا اور اس طرح ایک جماعت تیار ہو گئی، جن کو سبائیہ کہتے ہیں، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا وصال نہیں ہوا، بلکہ وہ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے ہیں اور یہ گرج و چمک انہیں کی آواز ہے اور یہ گروہ جب گرج کی آواز سنتے ہیں تو کہتے ہیں: السلام علیک یا امیر المؤمنین

۳۔ اس سبائی جماعت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بہتان بھی باندھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ وحی نازل فرمائی تھی، اس میں سے صرف دسواں حصّہ آپ نے ظاہر فرمایا اور نو حصّے اپنی صواب دید کے مطابق چھپا لیے تھے۔

گفتند آنچہ خداوند بدو وحی فرستاد از دہ یکے را ظاہر ساخت
و نُہ دیگر را بصلاح دید خویش پوشیدہ داشت۔

(نوٹ) سبائی غالیوں کے اس نظریہ کو اثنا عشریہ کے اس عقیدہ کے ساتھ ملا کر دیکھیں: تسعۃ اعشار الدّین فی التقیۃ۔ دین کا نوّے فیصد حصّہ

تقیہ میں ہے تو روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ابن سبا کے اس نظریہ کو تمام شیعہ فرقوں نے دل و جان سے قبول کر رکھا ہے۔ اُصول کافی میں شیعہ کے محدث کبیر کلینی نے دین کے نوے فیصد حصہ کو تقیہ میں منحصر مان کر اس سبائی نظریہ کو اہلِ تشیع کا اجماعی عقیدہ بنا ڈالا ہے اور اسے صرف امت تک محدود نہیں رکھا، بلکہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس میں شامل کرلیا گیا۔

۴۔ غالی شیعوں اور سبائی نظریات کے حاملین نے مزید قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ تمام اولادِ علی میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہوا ہے۔ العیاذ باللہ؛

۵۔ بعض نے تناسخ کا نظریہ اپنا لیا اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا ہی انکار کر دیا۔

۶۔ انہیں میں سے اسحاق بن زید بن حارث تھا، جس نے نظریۂ اباحت کو جاری کیا اور تکالیفِ شرعیہ یعنی فرائض و واجبات کی پابندی اور محرماتِ شرع یعنی زنا و لواطت وغیرہ سے اجتناب کی پابندی ختم کر دی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منصب رسالت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک اور حصہ دار تسلیم کرتا تھا۔

۷۔ صاحبِ ناسخ کہتا ہے کہ انہیں غالیوں میں سے اب بھی ایران کے اکثر مقامات پر موجود ہیں، جو آگ پر چلتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ جلد سوم از کتاب دوم ص۴۷۴ تا ص۴۷۶)

الغرض رجعت، تقیہ، خلافتِ بلا فصل، وصی رسول ہونا، تولّیٰ و تبرّیٰ کے عقائد و نظریات، نیز حلول و اتحاد کا عقیدہ۔ نماز روزہ وغیرہ کی فرضیت کا انکار اور زنا و لواطت وغیرہ کی حرمت والی پابندیوں سے خلاصی و آزادی کا موجد اور بانی عبداللہ بن سبا ہے اور اس کے چیلے اور پیروکار۔ اور یہی عقائد و نظریات مذہبِ شیعہ کی رُوح ہیں اور ہر شیعی فرد کسی نہ کسی رنگ میں ابن سبا کے دامِ تلبیس و

تزویر میں گرفتار ہے۔

لہٰذا اب اس کو افسانوی شخصیت قرار دے کر اس الزام سے بچنے کی ناکام کوشش کرنا کہ "مذہب رفض اور تشیع دراصل یہود کی پیداوار اور ایجاد و اختراع ہے" کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ عذر قابلِ قبول ہے، بلکہ یہ اٹل حقیقت ہے اور علامہ ڈھکو کے اسلاف نے ہی اس کی راہِ فرار مسدود کر دی ہے، لہٰذا اس کی یہ سعی قطعاً کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔

عبداللہ مامقانی اور ابن سبا

اہلِ تشیع کے چودھویں صدی کے عظیم محقق اور مصنف شیخ عبداللہ مامقانی نے تنقیح المقال ص۱۸۳ اور ۱۸۴ ج ۲ میں اکابرین علماء شیعہ کی تصریحات نقل کر کے اس کے حسب و نسب اور اصل و نسل کو بھی تسلیم کیا اور علامہ کشی کے حوالہ سے ائمہ کرام سے اس کے متعلق منقول روایات کو نقل کیا اور اس کے نظریاتِ فاسدہ اور عقائدِ باطلہ کو بیان کیا اور ایک جملہ بھی ایسا ذکر نہیں کیا، جس سے ابن سبا کے افسانوی شخص ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہو، تو آخر علامہ ڈھکو صاحب کا کیا خیال ہے کہ یہ بھی شیعی مصنفین جاہل، بدھو، کورے، کودن اور احمق ہیں اور انہیں تحقیق و تدقیق سے کوئی نسبت اور تعلق نہیں ہے، صرف علامہ ڈھکو صاحب اور طٰہٰ حسین وغیرہ ہی محقق اور مدقق ہیں۔ یا للعجب

عقیدۂ رجعت کا بانی کون تھا؟

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے ناسخ التواریخ جلد دوم کتاب دوم ص۵۲۴ سے طویل ترین عبارت نقل کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ وصی رسول اللہ اور خلیفہ بلا فصل اور رجعت وغیرہ کے شیعی عقائد کا موجد اور اس مذہب کا عبداللہ بن سبا یہودی ہے، جس کے جواب میں علامہ موصوف نے صرف یہ کہہ کر

گلو خلاصی کی کوشش فرمائی کہ ہمیں متعلقہ مقامات میں کہیں اس عبارت کا سراغ ہی نہیں ملا۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ موصوف کو اپنی مسلکی اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ ہی نہیں اور نہ کسی کتاب کے حوالے تلاش کرنے کی اہلیت ہی ہے ورنہ جو کتاب تاریخ ہر سال کے سلسلہ وار واقعات پر مشتمل ہو اس میں سے ۳۵ھ کے واقعات کی تلاش کیونکر دشوار ہو سکتی تھی اور یہ عبارت نظروں سے اوجھل کیسے رہ سکتی ہے؟ مقامِ حیرت ہے کہ علامۃ العصر اور محقق دوراں اور مجتہد وقت ہونے کا مدعی اور حجۃ الاسلام کا لقب اپنے لئے مخصوص ٹھہرانے والا اتنی لیاقت بھی نہیں رکھتا کہ ۳۵ھ کے واقعات اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش اور ان کی شہادت کے علل و اسباب کو اپنے مذہب کی تاریخی کتاب سے تلاش کر سکتا ع بریں عقل و دانش بباید گریست

الحاصل کتاب ناسخ التواریخ جلد دوم، کتاب دوم ص ۵۲۴ "ذکر پدید آمدن مذہب رجعت در سال سی و پنجم ہجری" کا عنوان قائم کرکے ابن سبا کے کردار کو واضح کیا گیا ہے اور مزید تفصیلات جلد سوم، کتاب دوم ص ۱۷۴ تا ۱۷۶ پر موجود ہیں۔ صاحب ناسخ نے (پدید آمدن) کا لفظ استعمال کرکے واضح کر دیا کہ عقیدہ رجعت پینتیس ہجری سے قبل ظاہر اور نمایاں نہیں تھا۔ اگر قرآن مجید اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیان کیا ہوتا اور اس کو ارکان اسلام و ایمان میں داخل فرمایا ہوتا تو دور نبوت و رسالت میں ہی اس کا ظہور ہو چکا ہوتا اور آپ کے وصال شریف کے پچیس سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر قیاس کرکے اس نظریہ کے اختراع و ایجاد کی ضرورت نہ پڑتی، لہٰذا صاف ظاہر کہ اس عقیدہ کا موجد اور مخترع عبد اللہ بن سبا یہودی ہی تھا اور بعد ازاں اس کے متبعین نے اس کو نہ صرف بالاجماع اور بالاتفاق قبول کر لیا، بلکہ اسے شیعہ مذہب کی روح اور جان تسلیم کر لیا اور اس کے منکر کو دینِ تشیع سے خارج قرار دے دیا۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کا مقصد اس طویل اقتباس سے

صرف اس قدر تھا کہ مذہب شیعہ کا بانی کون ہے؟ اور اس کے بنیادی عقائد کس نے ایجاد کیے؟ اور کس وقت ان کا اختراع شروع ہوا اور آپ نے شیعی کتب رجال کشی اور ناسخ التواریخ کے حوالہ جات سے یہ پتہ بتلا دیا اور کھوج لگا دیا اور ہر شخص بخوبی اور بآسانی یہ حقیقت سمجھ سکتا ہے کہ اگر یہ عقیدہ و نظریہ بانی اسلام اور قرآن نے جاری کیا ہوتا تو ہجرت کے پینتیس سال تک اس کا پردہ خفا میں رہنا ناممکن تھا اور ایک یہودی نژاد مسلم نما کو اس کی اشاعت پر زور لگانا پڑتا، جب بانی کا تا پتہ اور اس کا اصل معلوم ہو گیا، تو بنا کا حال خود واضح ہو گیا۔

ع قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

لہٰذا ڈھکو صاحب کو عبارت تلاش کرنی چاہیے تھی اور اگر نہیں مل رہی تھی، تو جیسے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمایا تھا اگر حوالہ جات نہ مل سکیں تو سیال شریف آئیں، ہم حوالے دکھلانے کے ذمہ دار ہیں، آپ سے رابطہ پیدا کر لیا جاتا اور یہ عذر بارد اور کھوکھلا بہانہ کرکے اپنے لیے رسوائی کا سامان نہ کیا جاتا؟

کس نظریہ پر اس کے قائلین عقلی و نقلی دلائل قائم نہیں کرتے؟

علامہ موصوف نے جوابات کی تیسری شق میں کہا کہ پیر صاحب آف سیال شریف نے ہمارے عقیدہ رجعت کی رد کرنا چاہی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ عقلی و نقلی دلائل سے ثابت ہے، حالانکہ حضرت قبلہ پیر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے فساد و بطلان پر نہ دلائل دیے، نہ ان کا یہ مقصد تھا۔ آپ کا مقصد تھا اس کے موجد و بانی کی حقیقت بتلانا، مگر علامہ موصوف اس طرف سے تو عاجز و قاصر ہو گئے اور نیا رخ اختیار کر لیا کہ یہ عقیدہ بے شمار دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ثابت ہے۔ آخر دنیا میں کونسا ایسا باطل سے باطل نظریہ جاری ہوا، جس کے بانیوں نے اس پر عقلی اور نقلی دلائل قائم نہ کیے جو حضرات مذہب شیعہ کو باطل سمجھتے ہیں، انہوں نے بھی عقلی اور

نقلی دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں اور جو حق سمجھتے ہیں، انہوں نے بھی اتنی ضخیم کتابیں لکھ ماری ہیں کہ مجتہد العصر کے مدعی ہونے کے باوجود حوالہ بھی تلاش نہیں کر سکتے، لہٰذا محض عقلی و نقلی دلائل موجود ہونے کا دعویٰ کوئی وزن نہیں رکھتا۔

جو شخص بھی ایک نظریہ قائم کرتا ہے، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی علت موجبہ اور سبب باعث ہوتا ہی ہے جیسے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے: "لکل ضلالۃ علۃ" "ہر گمراہی کی کوئی نہ کوئی علت ہوا کرتی ہے"، اور عبداللہ بن سبا بھی معمولی آدمی نہیں تھا، وہ کتب سابقہ کا ماہر بھی تھا اور قرآن مجید کا بھی۔ اسی لیے اُس نے آیت کریمہ کو بطور دلیل پیش کر کے یہ عقیدہ جاری کیا اور خدا لگتی بات یہ ہے کہ علامہ ڈھکو صاحب کے دلائل کی نسبت اس کی دلیل زیادہ واضح اور وقیع نظر آتی ہے۔ علامہ ڈھکو کا اسے اپنے دلائل میں جگہ نہ دینا سراسر ناانصافی اور احسان ناشناسی ہے۔ ہاں البتہ اسے ذکر نہ کرنے کا موجب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم صرف ابن سبا کی تقلید پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اُس کی نگاہِ کرم سے خود مجتہد بن چکے ہیں اور نئے نئے دلائل پیش کر سکتے ہیں، جہاں تک ابن سبا کا ذہن رسا بھی نہیں پہنچا تھا ؏ پدر نتواند پسر تمام خواہد کرد

کس کی رجعت کا اعتقاد رکھا جائے

ناسخ التواریخ سے خود سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوبارہ تشریف لانا آپ ملاحظہ فرما چکے اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف زیارت کرانے نہیں آئیں گے، بلکہ اسلام کے مبلغ اور خلفاء اسلام میں سے ایک خلیفہ کی حیثیت سے تشریف لائیں گے تو جب ان پر قیاس کرتے ہوئے سیدِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی دوبارہ تشریف آوری کا عقیدہ اپنایا گیا ہے، تو حکومت و سلطنت اور حدود و قصاص کا معاملہ آپ کے ہاتھ میں تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

لیکن "انوارِ نعمانیہ" میں نعمت اللہ الجزائری کہتے ہیں کہ سبائیہ نے یہ عقیدہ اپنا رکھا ہے

کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بادلوں سے نزول فرمادیں گے اور ساری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ "وانہ ینزل بعد ھٰذا الی الارض و یملاءھا عدلا۔" تو اس طرح دونوں حضرات کی رجعت بھی اور ان کا حکمران اور متصرف ہونا ثابت ہو گیا۔

علاوہ ازیں حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت جعفر صادق اور حضرت موسیٰ کاظم وغیرہم رضی اللہ عنہم کی دوبارہ تشریف آوری اور حکمرانی کا قول بھی ثابت ہے اور یہ بھی دعویٰ ہے کہ اصل حکومت تو حضرت مہدی کی ہوگی۔ یہ حضرات صرف ان کے ہاتھوں میں مظلومانِ اہلِ بیت کی دادرسی اور ظالموں کے خلاف انتقامی کارروائی دیکھنے کے لیے تشریف لائیں گے، تو آخر اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس کی رجعت کا عقیدہ رکھا جائے اور کس حیثیت میں وہ رجعت تسلیم کی جائے۔

؏ شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیر ما

یوم الدّین اور یوم الجزاء کون سا ہے؟

قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ سے ایک ہی قیامت ثابت ہوتی ہے اور جمہور اہلِ اسلام بھی ایک ہی قیامت کے قائل ہیں اور ۳۵ھ تک سب اہلِ اسلام کا یہی عقیدہ و نظریہ رہا۔ اہلِ اسلام اس کو یوم الدین، یوم الجزاء، یوم الحساب اور الساعۃ وغیرہ سے تعبیر کرتے تھے اور کفار و مشرکین اس کا شد و مد سے انکار کرتے تھے، مگر قرآن مجید نے کفار و مشرکین کے بار بار رد و قدح کے باوجود کہیں بھی صراحت کے ساتھ اس دوسری قیامت اور دوسرے یوم جزاء کا ذکر نہیں کیا لہٰذا تمام اہلِ اسلام کے اجماع و اتفاق کے برعکس اور قرآن مجید کے ایک یوم الدین اور یوم الحساب کے اعلان کے برخلاف ایک یہودی کی تقلید و اتباع میں اس عقیدۂ رجعت کا اقرار و اعتراف کسی مدعیِ اسلام کو زیب نہیں دیتا۔

الحاصل فی الحال ہمارا مدعا و مقصود اس قدر تھا کہ حضرت شیخ الاسلام

نے شیعہ مذہب کے بانی کی نشان دہی میں جو کچھ فرمایا، وہ بالکل برحق تھا اور واقع کے مطابق اور اسی کتاب کے انہیں صفحات پر موجود تھا جن کا حوالہ رسالہ مذہب شیعہ میں دیا گیا تھا اور اس نے کسی سنی عالم کا یہ قول بھی نقل نہیں کیا، بلکہ اپنی تحقیق وتدقیق بیان کی ہے اور مذہب رجعت کے ظہور پذیر ہونے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش اور مکر وفریب نیز خلافت بلافصل اور وصی وغیرہ کے عقائد کی ایجاد واختراع میں عبداللہ بن سبا کی مساعی ذمیمہ بیان کی ہیں اور جب بانی کی حقیقت اور حیثیت معلوم ہو گئی، تو اس کے تیار کردہ نظریات کا حال بھی واضح اور عیاں ہو گیا، اس پر مزید ردّ و قدح کی ضرورت نہیں ہے۔

ہماری رائے یہی ہے کہ علامہ ڈھکو صاحب اتنے بے خبر اور نا اہل نہیں ہو سکتے کہ اپنے مذہب کی اہم کتاب میں سے اتنا واضح اور آسان حوالہ بھی معلوم نہ کر سکیں بلکہ آپ نے تقیہ سے کام لیا اور جھوٹ بول کر ثواب بھی کمایا اور جواب دہی کی تکلیف سے سہل انداز میں دامن بچایا۔ اگر تسلیم کر لیتے کہ واقعی ہماری کتابوں میں ہمارے اکابر نے تصریح کر دی ہے کہ عبداللہ بن سبا ہی اس نظریہ کو رواج دینے والا ہے جس پر مذہب شیعہ کا دارومدار ہے، تو پھر سارے مذہب کا ستیاناس ہوتا تھا، تو اگر ایسے مشکل مقامات پر تقیہ کام نہ آئے تو اسے جاری کرنے کا فائدہ ہی کیا؟

علامہ ڈھکو صاحب کی انوکھی منطق

علامہ موصوف نے عبداللہ بن سبا کے مذہب شیعہ کا بانی ہونے کی نفی میں یہ انوکھی منطق استعمال فرمائی کہ ہر مذہب والے اپنے مقتداء وپیشوا کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، جبکہ ہماری کتب رجال میں ہر جگہ اس کو کافر، بے دین اور ملحد و زندیق قرار دیا گیا ہے، لہٰذا وہ ہمارا مقتداء کیونکر ہو سکتا ہے؟ مگر یہ جواب سراسر غلط اور ناقابل اعتبار و التفات ہے۔

۱۔ ہم نے شیعی کتب کے حوالہ جات سے اس کو مذہب شیعہ کا بانی ثابت کیا ہے نہ کہ محض اثنا عشریہ کے نظریات کا لہٰذا اگر شیعہ کے بائیس فرقوں میں سے ایک فرقہ اس کی مذمت کرتا ہے، تو اس سے یہ کیسے لازم آ سکتا ہے کہ سب شیعہ فرقے اس کی مذمت کرتے ہیں اور اس کی تعظیم وتکریم نہیں کرتے۔ ابھی ناسخ التواریخ کے حوالے سے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالی شیعوں کے نزدیک ان دو گڑھوں کی اور ان میں جل مرنے کی کیا اہمیت ہے اور انہیں اس سعادت کے حصول کی کس قدر حسرت ہے، جن میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں کو جلا دیا تھا۔ جب گڑھے اس قدر عزیز ہیں، تو وہ لوگ ان کی نظروں میں کتنے عظیم ہوں گے اور پھر ان کا امام وپیشوا اور رہنما کس قدر معزز اور مکرم ہو گا اور ایک گروہ اسی کے نام کی مناسبت سے کہلاتا ہی سبائیہ ہے، لہٰذا ابن سبا کے مذہب شیعہ کا بانی ہونے کی نفی اس بودے اور بیہودہ جواب سے نہیں ہو سکتی۔

۲۔ علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ آپ اس کا نام بدل کر دوسرے نام سے اس کی تعظیم وتکریم کرتے ہوں تاکہ حق نعمت بھی ادا ہو جائے اور اہل السنت کے طعن وتشنیع سے بھی کسی قدر تحفظ حاصل ہو جائے، جس طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے مجوسی ابولؤلؤ کا نام بدل کر بابا شجاع الدین کہہ کر اس کا عرس اور میلہ منانا شروع کر دیا گیا اور اس کے حضور ہدیۂ تشکر اور گلہائے عقیدت پیش کئے جانے لگے اور آپ کے اہل مذہب کے لئے یہ ادنیٰ کرشمہ ہے۔

۳۔ نیز یہ عذر وہ شخص کر سکتا ہے جو اصول وقواعد کا پابند ہو اور شیعہ مذہب میں افراط وتفریط اور نشیب وفراز کا سلسلہ ہی ایسا ہے کہ محسن اور غیر محسن میں امتیاز روا ہی نہیں رکھا جاتا۔ جی چاہے تو مجوسی کو بابا شجاع الدین بنالیں اور اس کے عرس اور جشن منائیں اور جی میں آ جائے، تو آگ کی پرستش سے بچانے والے اور خدائے بزرگ وبرتر کے حضور سجدہ ریز کرنے والے، زرتشت کی جگہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں لانے والے اور زرتشتی ویدوں کی بجائے کلام اللہ شریف کی تلاوت کا

شرف بخشنے والے حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کو دین سے خارج قرار دے دیں اور گالی گلوچ اور سبّ و شتم کے بغیر ان کا نام لینا بھی گوارا نہ کریں ؎

یاں اُلٹی گنگا بہتی ہے، ہر چیز یہاں کی الٹی ہے

۴۔ نیز تقیہ بھی ایسے ہی مواقع کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ جب دیکھا کہ اس قائد اور رہبر کی قیادت و سیادت کا برملا اعتراف کرتے ہیں، تو مذہب کا سارا کھیل ہی بگڑتا ہے، کیونکہ اس کی اصل اور نسل یہود سے جا ملتی ہے، لہٰذا اس کا تذکرہ چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھی، بلکہ زبانی زبانی اس کی مذمت کر دی، خواہ دل اس کی یاد اور محبّت و اُلفت سے معمور ہی کیوں نہ ہو۔

پچھلے اوراق میں متعدّد حوالہ جات آپ نے ملاحظہ فرمائے ہیں، جہاں ائمہ کرام نے خلفاء راشدین کی تعریف کی ہے، مگر وہاں شیعہ علماء ان ممدوحین کی مدح و ثنا کو تقیہ پر محمول کرتے ہیں اور شیعہ راویوں کے حق میں یہودی، نصرانی، مجوسی اور تثلیث کے قائلین سے بدتر وغیرہ کے الفاظ ائمہ کرام کی زبانی منقول ہیں، مگر ان کو اس مذہب کا رہبر اور بانی قرار دیا جاتا ہے، اس لیے نہ تمہاری مدح، مقتدا ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے اور نہ تمہاری مذمّت، مقتدا ہونے کی نفی کر سکتی ہے۔ یہ صرف وہاں کا پیمانہ اور معیار ہو سکتا ہے جہاں پر زبان اور ضمیر میں یکسانیت ہو اور قول و عقیدہ میں وحدت ہو، مگر بدقسمتی سے شیعہ مذہب اور اس کے پیروکار اس خوبی اور صفتِ کمال سے کوسوں دُور ہیں۔

۵۔ نیز ابن سبا نے خلافتِ بلا فصل اور وصیِّ رسول اور رجعت کے عقیدہ سے آغاز کیا تھا اور اس کی آخری منزل حلول و اتحاد تھا اور وہ درجہ بدرجہ یہودیت اور نصرانیت کی طرف لے جا رہا تھا۔ اثنا عشریہ اس کا مکمّل ساتھ نہ دے سکے اور جس بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام پر وہ لے جانا چاہتا تھا، اس کے اہل نہ نکلے اور اس کے دشمن بن گئے، مگر ابتدائی تعلیمات سے فیضیاب ہونے کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا، بس صرف اتنا قدر ثابت ہوا کہ آپ اس کے مرید کامل اور

تلمیذِ ارشد نہ بن سکے۔ اسی لیے آپ کے اکابرین نے اس کے متعلق کہا:

عبد اللہ بن سبا الذی رجع الی الکفر و اظہر الغلو (تنقیح المقال، صـ۱۸۳ و ۱۸۴ ج ۲)

"عبداللہ بن سبا (امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے تھا) بعد ازاں کفر کی طرف لوٹ گیا اور غلو کا اظہار کیا"۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جب تک حلول و اتحاد کا قول ائمہ کے حق میں نہیں کیا تھا اور اپنے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا، تمام فرقے اہلِ تشیع کے اس کو رہبر اور قائد مانتے تھے، جب یہ عقائد ظاہر کیے، تو بعض نے نفرت کا اظہار کیا اور بعض نے مکمّل وفاداری کا مظاہرہ کیا، مگر اس طرح بھی اس کی قیادت سے کلیتہً برأت اور بیزاری ظاہر نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ شیعہ کے دامن میں خیرات ہے، یہ سب اسی کا صدقہ اور فیضان ہے۔

کیا مذہب شیعہ کے بانی سیّد الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟

علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ مذہبِ شیعہ کا بانی عبداللہ بن سبا یہودی نہیں، بلکہ اس کے بانی خود بانیانِ شریعت ہیں۔ ہم علامہ موصوف کے اس دعویٰ کی حقیقت، دوسرے مقام پر پوری طرح واضح کر چکے ہیں، یہاں ان تفصیلات کے اعادہ کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی گنجائش۔ البتہ ایک مغالطہ دہی پر تنبیہ کیے دیتا ہوں کہ کتاب و سنت میں شیعہ کا لفظ جہاں بھی وارد ہوتا ہے، علامہ موصوف اس سے مخصوص فرقہ اور خاص نظریہ کی حامل جماعت مراد لے کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہماری حقانیت ثابت ہو گئی اور ہمارا تذکرہ قرآن کریم میں ہے، احادیثِ رسول میں ہے، لہٰذا ہمارے بانیٔ مذہب اللہ تعالیٰ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

حالانکہ خود انہیں بھی تسلیم ہے کہ لفظ شیعہ مطلق جماعت اور گروہ کے معنی میں آتا ہے اور وہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی اور قرآن مجید میں کفّار اور جہنّمیوں کو بھی اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، لہٰذا محض شیعہ کا لفظ دیکھ کر استدلال کر لینا درست نہیں، جب تک وہ مخصوص نظریات و عقائد ثابت نہ ہو جائیں، جن کا علامہ کشی اور صاحبِ ناسخ کے

اقرار واعتراف کے مطابق عبداللہ بن سبا موجد ہے، لہٰذا معروف معنوں میں شیعہ صرف وہی ہوگا جو ان عقائد کا معترف اور معتقد ہوگا۔ قرآن کریم میں موسیٰ علیہ السلام کے قومی بھائی اور برادری کے آدمی کو "هٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ" سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس سے موجودہ شیعوں کے عقائد پر ہونا کیسے ثابت ہوسکتا ہے، وہ تو ابھی تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور ان کے دین کا بھی قائل نہیں تھا اور پورا یہودی بھی نہیں بن پایا تھا، شیعہ کیسے بن گیا تھا؟ اور پھر اسی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ" "بے شک تو کھلا گمراہ ہے" بھی فرما دیا تھا، لہٰذا اگر کہیں مقامِ مدح میں یہ لفظ وارد ہو تو اس سے استدلال کا دارومدار صرف اور صرف اس امر پر ہوگا کہ وہاں پر تحریفِ قرآن، رجعت، خلافتِ بلافصل، وصایت اور تولّیٰ و تبرّیٰ وغیرہ نظریات کا تحقق اور ثبوت بھی فراہم کیا جائے، حالانکہ قطعاً اس امر کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ موصوف کا حال اس استدلال میں ویسے ہی ہے، جیسے کہ بھوکا آدمی سورج کو لٹکتی ہوئی روٹی سمجھ لے۔

اس تمہیدی گزارش کو ذہن میں رکھ کر اب علامہ صاحب کی بیان کردہ روایت اور اس سے استدلال کی حقیقت معلوم کر لیں۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا، یا علی انت وشیعتك هم الفائزون یوم القیامة۔ (دُرِ منثور، نور الابصار، صواعق محرقہ وغیرہ)

"اے علی! تم اور تمہاری جماعت قیامت کے دن کامیاب اور فلاح پانے والی ہوگی، لیکن یہ ارشاد کیا ان مخصوص نظریات کے حاملین کے لیے ہے یا اس سوادِ اعظم اور عظیم اکثریت اور جمہور اہلِ اسلام کے حق میں ہے، جو حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ کے معاون و مددگار تھے اور ان کی دل جوئی اور ہمنوائی میں آپ برسرِ منبر شیخین رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب بیان فرماتے رہتے تھے اور انہی کے عمل و کردار میں موافقت فرماتے تھے اور ان کے جاری کردہ سنن اور طریقوں میں سرِمو تغییر و تبدیل کے روادار نہیں تھے، اس لیے علامہ ابن حجر اور شاہ عبدالعزیز نے بالکل بجا فرمایا کہ اس کا

مصداق ہم ہیں، اگر ہم اہل السنّت کہلانے والے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہیں تھے، پھر تو استدلال کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی اور اگر سارے لشکری، یا ان میں سے سوادِ اعظم تھے ہی اہل السنّت کہلانے والے، تو اس روایت سے استدلال قطعاً درست نہیں ہو سکتا، لہٰذا یہ سراسر دھوکہ دہی اور فریب کاری ہے۔

آیئے اب حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے قلم حقیقت رقم سے لفظ شیعہ کی آڑ میں فوز و فلاح کا سہرا اپنے سر باندھنے والوں کا حال مشاہدہ کریں اور ائمہ کرام کے ارشاداتِ عالیہ سے ان مخصوص نظریات کے حامل شیعہ معروفہ مصطلحہ کا حکم اور ان کی حیثیت ملاحظہ کریں۔

رسالہ مذہب شیعہ: از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

مذمتِ شیعہ بزبانِ ائمہ کرام علیہم الرضوان

چونکہ اس تحریر سے میرا مقصد صرف مخلصانہ مشورہ ہے اور اہلِ بصیرت حضرات کی خدمت میں غور و فکر کرنے کی درخواست کرنا ہے۔ اگر اہلِ تشیع بُرا نہ منائیں تو ان کو ائمہ معصومین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چند ملفوظات اور بھی سُنا دوں اور یہ مشورہ دوں کہ ائمہ معصومین چونکہ کذب اور جھوٹ سے مبرّا اور منزّہ ہیں، اس لیے ان کے کلام کو سچا جان کر ان پر ایمان لے آئیں۔ رجال کشی ص۲۵۴ پر مرقوم ہے:

۱۔ قال ابوالحسن علیه السلام ما انزل الله سبحانه آیة فی المنافقین الا وهی فیمن ینتحل الشیعة۔ یعنی حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو آیات بھی منافقین کے بارے میں نازل فرمائیں، تو ان منافقین سے مراد صرف وہی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو شیعہ بتلاتے ہیں اور درحقیقت تقیہ سے زیادہ وجہِ نفاق کیا ہو سکتی ہے؟

۲۔ اسی طرح کتاب الروضہ من الکافی ص۱۰۱ میں ہے کہ امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر میں اپنے شیعوں کو باقی لوگوں سے جُدا کروں، تو صرف زبانی وصف کرنے والے

ہی پاؤں گا اور اگر میں ان کے ایمان کا امتحان لوں تو تمام کے تمام مُرتد دیکھوں گا' اور اگر میں اچھی طرح چھان بین کروں تو ہزار میں سے ایک بھی نہیں ملے گا۔ اس کے بعد فرمایا: یہ لوگ کہتے ہیں ہم علی کے شیعہ ہیں حقیقتاً علی کا شیعہ وہی ہے جو اُن کے قول وفعل کو سچّا جانتا ہے۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو:

حدثنی موسیٰ بن بکر الواسطی قال لی ابوالحسن علیہ السلام لو میزت شیعتی ما وجدتهم الا واصفة ولو امتحنتهم لما وجدت الا مرتدین ولو تمحضتهم لما خلص من الالف الا واحد ولو غربلتهم غربلة لم یبق منهم الا ما کان لی انهم طالما اتکئوا علی الارائك فقالوا نحن شیعة علی انما شیعة علی من صدق قوله فعله (کتاب الروضة ص۱۰۲ مطبع نولکشور)

۳۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ ایسی قوم ہے جو گمان کرتی ہے کہ میں ان کا امام ہوں' خدا کی قسم میں بالکل ان کا امام نہیں ہوں' کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ملعون ہیں' جتنی دفعہ بھی میں نے عزّت کا سامان مہیّا کیا' تو ان لوگوں نے اس کو خراب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عزّت کو خراب کرے۔ میں کچھ کہتا ہوں اور یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ میری مراد ظاہری الفاظ کے خلاف ہے۔ میں صرف انہیں لوگوں کا امام ہوں' جن لوگوں نے صحیح معنوں میں میری تابعداری کی ہے۔

اب عربی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

عن قاسم الصیرفی قال سمعت ابا عبد اللہ علیہ السلام یقول قوم یزعمون انی لهم امام واللہ ما انا لهم بامام مالهم لعنهم اللہ کلما سترت سترا هتکوه هتك اللہ ستورهم اقول کذا یقولون انما یعنی کذا انا امام من اطاعنی۔ (رجال کشی ص۲۵۵)

۴۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ ہی فرماتے ہیں کہ میں جب رات کو

سوچتا ہوں' تو سب سے زیادہ دشمن انہیں کو پاتا ہوں' جو ہماری محبّت اور تولّی کا دم بھرتے ہیں۔ (عربی ملاحظہ ہو:)

قَالَ اَبُوعَبدُاللہ علیہ السلام لقد امسینا وما احدٌ اعدیٰ لنا ممن ینتحل مودتنا۔ (رجال کشی ص۲۵۹)

(رسالہ مذہب شیعہ ص۹۶/۹۷)

تحفہ حُسینیہ

ازابوالحسنات محمّد اشرف السیالوی

تتمۂ مبحث مذکور: تیسری روایت میں آپ نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمالیا: اقول کذا یقولون انما یعنی کذا — میں کچھ کہتا ہوں اور یہ لوگوں کو کہتے ہیں کہ ان کی مراد یہ تھی اور اپنی من مانی اور مرضی کی تعبیرات کے ذریعے لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنا ان کا مشن تھا اور اس رذیل مشن پر بہت سے لوگ کام کر رہے تھے' جن میں سے بعض کی تو حضرات ائمّہ نے نشان دہی فرمادی' مگر بعض پھر بھی پردۂ خفا میں رہے' جنہوں نے ابن سبا کی تقلید میں دینِ اسلام کو اپنی تخریب کاری اور فکری انتشار کا شکار بنائے رکھا' اسی رنج والم اور دُکھ درد کا اظہار کرتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

۵۔ عن ابن سنان قال ابو عبد اللہ علیہ السلام انا اهل بیت صادقون لا نخلو من کذاب یکذب علینا فیسقط صدقنا بکذبه علینا عند الناس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصدق البریة لهجة وکان مسیلمة یکذب علیه وکان امیر المومنین علیہ السلام اصدق من برء اللہ من بعد رسول اللہ وکان الذی یکذب علیه من الکذب عبد اللہ بن سبا لعنه اللہ وکان ابو عبد اللہ الحسین بن علی علیہ السلام قد

ابتلی بالمختار ثم ذکر ابو عبداللہ الحارث وبنانا فقال کانا یکذبان علی علی بن الحسین علیہ السلام ثم ذکر ابو عبداللہ المغیرۃ بن سعید وبزیغا والسری واباالخطاب ومعمرا و بشار الاشعری وحمزۃ الزیدی وصائد النھدی فقال لعنھم اللہ انا لا نخلو من کذاب یکذب علینا او عاجز الرأی کفانا اللہ مؤنۃ کل کذاب واذاقھم اللہ حر الحدید۔
(رجال کشی ص۲۵۸)

یعنی ابن سنان سے مروی ہے کہ امام ابوعبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اہل بیت سچے ہیں، لیکن کذابوں کے افترا و بہتان سے محفوظ نہیں ہیں جو ہم پر بہتان باندھتے ہیں اور ہمارے صدق کو اپنے جھوٹ سے ساقط کرنے اور ناقابلِ قبول ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق سے زیادہ سچے تھے اور مسیلمہ کذاب آپ پر جھوٹ باندھتا تھا اور آپ کے بعد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے زیادہ سچے تھے، لیکن عبداللہ بن سبا آپ پر جھوٹ باندھتا، اور افترا کرتا تھا۔ حضرت ابوعبداللہ امام حسین رضی اللہ عنہ مختار ثقفی کے کذب و افترا سے دوچار تھے۔ پھر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے حارث شامی اور بنان کا ذکر کرکے فرمایا، وہ دونوں حضرت امام زین العابدین علی بن الحسین رضی اللہ عنہم پر افترا اور بہتان تراشی کیا کرتے تھے۔ بعدازاں آپ نے مغیرہ بن سعید، بزیغ، سری، ابوالخطاب، معمر، بشار اشعری، حمزہ زیدی اور صائد نہدی کا ذکر کیا اور فرمایا، اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے، ہم جھوٹوں اور مفتریوں کے جھوٹ اور افترا سے محفوظ نہیں ہیں یا رائے اور فکر سے عاجزوں سے (جو مقصدِ کلام کو نہیں سمجھتے) اللہ تعالیٰ ہمیں ہر جھوٹے کے کذب سے کفایت فرمائے اور انہیں لوہے کی (ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی) حرارت کا مزہ چکھائے۔

۶۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے ہی اس مفتری پارٹی کے متعلق مروی منقول ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مصداق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ (پ، ع، آیت) (کیا میں تمہاری رہنمائی کروں ان لوگوں کے متعلق، جن پر شیاطین نازل ہوتے ہیں، وہ نازل ہوتے ہیں ہر بہتان باندھنے والے اور جرائم پیشہ پر) فرمایا کہ وہ سات آدمی ہیں مغیرہ بن سعید، نبان، صائد نہدی، حمزہ بن عمارہ زیدی، حارث شامی، عبداللہ بن عمرو بن الحارث اور ابوالخطاب۔
(رجال کشی ص۲۵۶)

الغرض شیعی اسماء رجال میں جگہ جگہ ایسے لوگوں کی نشان دہی حضرات ائمہ کی زبانی موجود ہے جس سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بہت بڑی جماعت اس مشن پر کام کر رہی تھی اور انہوں نے جی بھر کر افترا اور کذب بیانی سے کام لیا اور اپنے افترائی اقوال کی ان مقدس ہستیوں کی طرف نسبت کرکے ایک نئے مذہب اور دین کی بنیاد رکھی اور المیہ یہ تھا کہ ائمہ کرام بالعموم مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھے اور ان کے نام پر یہ مذہب عراق اور بصرہ و کوفہ میں چلایا جا رہا تھا اور اوپر تقیہ کی دبیز تہیں تھیں جو انکشافِ حقیقت سے مانع تھیں اور بڑی رازداری سے اس کو سینہ بسینہ پہنچایا جاتا اور کبھی اس کا افشا ہو جاتا اور ائمہ کرام کی طرف اس بارے میں رجوع کیا جاتا اور وہ فرماتے کہ یہ ہم پر بہتان و افترا ہے اور دروغ بے فروغ ہے تو یہ شاطر لوگ کہتے کہ عامہ یعنی اہل سنت سے تقیہ کرکے ائمہ نے اس طرح فرما دیا ہے، ورنہ حقیقی مذہب تو اُن کا وہی ہے جو ہم نے بتلا دیا ہے اور اس طرح یہود اور دیگر دشمنانِ اسلام کی طرف سے ایک لاعلاج بیماری کے طور پر یہ مرض اسلام اور اہلِ اسلام کو لاحق کر دیا گیا اور اندر ہی اندر ائمہ کرام کے حق میں حلول و اتحاد نبوت و رسالت کے عقیدے اور رجعت، وصایت اور تولّی و تبرّی کے عقائد پروان چڑھتے رہے۔ العیاذ باللہ!

٧- قال ابو جعفر علیہ السلام لو کان الناس کلھم لنا شیعة لکان ثلاثة ارباعھم لنا شکاکا والربع الاخر احمق۔

(رجال کشی ص۱۷۹)

"حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر سب انسان ہمارے شیعہ بن جائیں، تو ان میں سے چوتھائی ہمارے حق میں شکوک وشبہات کا شکار ہوں گے، اور بقیہ ایک چوتھائی احمق ہوں گے۔"

الحاصل اس طرح کی بہت سی روایات اسماء رجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں، جو شیعہ کی شدید مذمت پر دلالت کرتی ہیں۔ بالعموم بھی اور بالخصوص نام بنام بھی جن کے بیان کے لیے طویل دفتر درکار ہے، خدا تعالیٰ توفیق دے تو خود مطالعہ فرمائیں۔

تنزیہہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

مذمت شیعہ میں وارد روایات کا جواب

بعض نام نہاد شیعہ کی مذمت میں وارد شدہ بعض اخبار سے پیر صاحب نے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھا الخ

الجواب واللہ الموفق لنیل الصواب: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر قوم اور مذہب میں کچھ ایسے افراد ضرور پائے جاتے ہیں، جو "بدنام کنندہ نکو نامے چند"، کے مصداق ہوتے ہیں، وہ صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں اور کردار کی منزل سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شیعہ مذہب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، وہ لوگ جو زبان سے تو دعوائے تشیع کرتے ہیں، مگر اپنے عمل وکردار سے دشمنانِ آلِ رسول کا کردار ادا کرتے ہیں، ایسی دوغلی روش و رفتار رکھنے والوں کی ائمہ اطہار نے بیشک مذمت فرمائی ہے، وہ دونوں روایات جو مؤلفِ رسالہ نے نقل کی ہیں، وہ اسی سلسلہ کی کڑی ہیں اور اس بات کے قطعی

قرینے بھی موجود ہیں۔

اول یہ کہ یہ روایات ابو الخطاب غالی کے حالات کے ضمن میں مذکور ہیں۔

دوم ان میں من ینتحل التشیع کا لفظ موجود ہے، یعنی جو لوگ شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو شیعوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مذمت شیعوں کی نہیں، بلکہ ان کی ہے جو اپنے شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر حقیقت میں شیعہ نہیں ہیں، ورنہ حقیقی شیعوں کی تو کلام ائمہ میں بہت تعریف موجود ہے۔ (رسالہ تنزیہہ الامامیہ ص۱۶۱ و ۱۶۲)

تحفۂ حسینیہ — از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی

علامہ ڈھکو صاحب نے اس قدر تسلیم کر لیا کہ واقعی مذہب شیعہ میں چند بدنام کنندہ اور رسوائے زمانہ افراد موجود ہیں، لیکن اس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ ان بدنام ورسوا اور رذیل و ذلیل لوگوں کی ائمہ کرام نے نشانی اور علامتِ مشخصہ بھی بیان فرما دی ہے، یعنی ہم کچھ کہتے ہیں اور وہ ہماری مرضی و مراد کے برعکس ہمارے قول کی لوگوں کے سامنے تشریح کر کے لوگوں کو غلط فہمیوں کا شکار کرتے ہیں اور ہم پر بہتان باندھتے ہیں۔ اب وہ لوگ جن میں یہ نشانی پائی جاتی ہے، کون کون سے ہیں اور کتنی تعداد میں ہیں، تو علامہ ڈھکو صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ابو الخطاب غالی ہے یا وہ لوگ جو صرف دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم شیعہ ہیں، مگر ان کا عمل و کردار اس دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتا، لیکن اس میں بھی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ ان روایات میں یا اس مضمون کی دیگر روایات اور ارشاداتِ ائمہ میں صرف ابو الخطاب کی مذمت نہیں کی گئی، بلکہ ایسے راویوں اور معبرین و مفسرین کی مذمت ہے کہ جو مذہب شیعہ کے بانی و موسس ہیں، جن کی روایات الگ کر لیں تو مذہب شیعہ ہی ختم ہو کر رہ جائے، جس کے قرائن و شواہد یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

ا۔تیسری روایت پر غور فرمائیں، اس میں آپ نے ایک قوم کے متعلق فرمایا:

قوم یزعمون انی لھم امام (الی) اقول کذا یقولون انما یعنی کذا ۔یعنی ان کا طریق کار یہ ہے کہ امام جو کچھ فرماتے، وہ اس کو غلط معانی پہناتے اور اُلٹی تعبیر و تفسیر کرکے لوگوں کو گمراہ کرتے ، لہذا دوپہر کے اجالے کی طرح واضح ہے کہ یہ بیچارے بدعمل عوام شیعہ کی بات نہیں ہے، بلکہ ان خواص کی ہے جو ائمہ کرام کے کلام کے مفسر ہیں اور ان کی روایات کے مغز اور روح کو سمجھ کر ان کی تشریحات کرنے والے۔

۲۔ دوسری روایت میں بالعموم شیعہ حضرات کو الگ کرتے پر ان کو صرف زبانی جمع و خرچ کرنے والے، مرتدین، بوقتِ امتحان یک فی ہزار کے حساب سے بھی مخلص نہ ہونے کا دعوٰی کیا گیا ہے۔

۳۔چوتھی روایت میں سب سے بدترین دشمن انہیں کو قرار دیا ہے۔

۴۔ پہلی روایت میں ان شیعوں کو آیاتِ منافقین کا صحیح اور برحق مصداق قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ پانچویں روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تک کے دور میں پوری پارٹی کی نشان دہی کی گئی ہے جو دورِ رسالت سے لے کر امام موصوف تک ہر دَور میں ان مقدس ہستیوں پر افترا کرتے رہے۔

۶۔چھٹی روایت میں ایک جماعت کو شیطانوں کے چیلے اور ان کے تلمیذ اور ان سے کسبِ فیض کرنے والے کہا گیا ہے۔

۷۔ ساتویں روایت میں شیعہ کے تمام ممکنہ افراد کی تین چوتھائی کو شکوک و شبہات کا شکار کیا گیا ہے اور بقیہ ایک چوتھائی کو احمق قرار دیا گیا ہے۔

لہذا ان عمومات اور خصوصی ارشادات کے بعد اس توجیہ کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے اور بالخصوص عقلائی قواعد و ضوابط سامنے رکھتے ہوئے جو ماشاء اللہ ڈھکو صاحب کو بہت ہی یاد ہیں جن میں سے ایک قاعدہ یہ ہے جس کو وہ خود ذکر بھی کر چکے ہیں کہ:

"اعتبار عموم الفاظ کا ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا اور صرف الفاظ کے عموم و خصوص سے ہی معانی کا عموم و خصوص سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کون سے الفاظ کس موقعہ و محل میں اور کن حالات میں استعمال کئے گئے"۔ لہذا اب انہیں ان اصول و قواعد سے عدول اور فرار کی ناکام کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

رہا علامہ موصوف کا یہ خدشہ کہ یہ صرف زبانی دعوائے تشیع کرنے والوں کے متعلق ہیں، جن کی روش و رفتار ان کے دعوٰی کی تائید و تصدیق نہیں کرتی تھی، تو یہ بھی سراسر غلط اور بے بنیاد ہے، کیونکہ آپ فرماتے ہیں۔ اگر سب انسان ہمارے شیعہ ہو جائیں، تو بھی ان کا حال یہی ہوگا، گویا حضرت امامؑ نے شیعہ کے متعلق کلیہ بیان فرما دیا ہے اور استثناء کا احتمال ہی ختم کر دیا۔

نیز جو بھی شیعہ ہوگا اس کے اقرار و اعتراف سے ہی اس کے شیعہ ہونے کا پتہ چلے گا اور جو اس قسم کے اقرار و اعتراف کرنے والے تھے، وہ سب ائمہ کرام کے تجربہ اور آزمائش کے مطابق ایسے ہی تھے، کیونکہ سُنّی تو تقیہ کو روا رکھتے نہیں تھے اور نہ ہی انہیں کوئی مجبوری تھی کہ وہ صرف زبانی دعوے کرتے اور عملی اور اعتقادی طور پر شیعہ نہ ہوتے، بلکہ ان کے سامنے ائمہ کرام بھی اہل السنت کے عقائد اور اعمال اپنائے ہوئے تھے ، لہذا روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو لوگ یہ اعلان و اظہار کرتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں زبانی شیعہ کہلانا بھی معمولی قربانی نہیں تھی، لیکن ان تولی اور محبت و مودت کے دعویداروں کا تلخ تجربہ ائمہ کرام کو وہی تھا جو اوپر والی روایات سے عیاں ہے۔

جھوٹے راویوں کا مقصد اصلی کیا تھا

آیئے ذرا یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وہ بہتان تراش اور کذاب و مفتری اس کذب و افتراء سے کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟

فقال ابو عبد اللہ علیہ السلام اجل ھو کما ذکرت یا فیض

ان الناس اولعوا بالكذب علينا، ان الله افترض عليهم لا يريد منهم غيره و انی احدث احدهم بالحديث فلا يخرج من عندی حتی يتاوله علی غير تاويله وذالك انهم لا يطلبون بحديثنا وبحبنا ما عند الله وانما يطلبون به الدنيا وكل يحب ان يدعی رأساً (الی) فاذا اردت حديثا فعليك بهٰذا الجالس واوماء الی رجل جالس من اصحابه (زرارة بن اعين) (رجال كشی ص۱۲۴)

"امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے فیض لوگ ہم پر جھوٹ باندھنے کے عاشق وشیدا ہیں اور انہوں نے یُوں سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہی چیز فرض کی ہے اور اس کے علاوہ دوسری کسی شے کا وہ ان سے ارادہ نہیں رکھتا، میں ان میں سے ایک شخص کو ایک بات بتاتا ہوں اور حدیث نقل کرتا ہوں، تو وہ ابھی میرے پاس سے نکل نہیں پاتا کہ اس کو دوسرے معانی میں ڈھال لیتا ہے اور الٹی تعبیر وتشریح کرلیتا ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہماری احادیث کی روایت سے اور ہماری محبّت کے دعوٰوں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر وثواب کے طلب گار نہیں ہیں، بلکہ اس حیلہ سے دنیا کمانے کے درپے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہے کہ وہ (محدثین اور محبین کا) رئیس اور سردار کہلائے۔ پھر آپ نے حاضرین مجلس میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: اگر تجھے حدیث مطلوب ہو تو اس (محدث اور خاص الخاص شیعہ) کی طرف رجوع کرنا، یعنی زرارہ بن اعین کی طرف۔"

اس روایت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے محض عوام کالانعام کی شکایت نہیں فرمائی، بلکہ رئیس المحدثین اور ثقۃ الاسلام قسم کے شیعہ کے متعلق حال دل بیان فرمایا اور دل کے پھپھولے دکھلاتے اور ان کے تولّی اور دعوائے محبت اور حفظ احادیث کا مقصد اعلیٰ بھی بتلایا، یعنی حطام دُنیا کا

حصول اور رئیس و قائد کہلانے کی خواہش۔

مثالی شیعہ محدثین کی حالتِ زار

ابھی ابھی آپ نے زرارہ بن اعین کا ذکرِ خیر سنا اور پڑھا اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا اس کو شیعہ خیر البریہ کا مرجع علوم واحادیث قرار دینا ملاحظہ فرمایا، مگر اسی تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرماویں تاکہ پتہ چل جائے کہ ایسے مثالی شیعہ محدثین اور مرجع انام علماء کی حقیقت کھلی تو امام موصوف نے پھر کیا ارشاد فرمایا:

۱- عن عمران الزعفرانی قال سمعت ابا عبدالله عليه السلام يقول لابی بصير يا ابا بصير وكنا اثنی عشر رجلا ما احدث فی الاسلام احد ما احدث زرارة من البدع عليه لعنة الله هٰذا قول ابی عبدالله - (رجال كشی ص۱۳۴)

عمران زعفرانی سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو ابوبصیر سے فرماتے ہوئے سنا۔ اے ابوبصیر! اسلام میں اتنی بدعات کسی نے بھی داخل نہیں کیں، جتنی کہ زرارہ نے داخل کی ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اور یہ آپ نے ہم بارہ آدمیوں کی موجودگی میں فرمایا۔

۲- علی بن الحکم کی روایت میں ہے: قال (ابو عبدالله) زرارة شر من اليهود والنصاریٰ ومن قال ان الله ثالث ثلاثة (ص۱۴۲)

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زرارہ تو یہود و نصاریٰ اور ان تمام لوگوں سے بدتر ہے، جنہوں نے دعوٰی کیا کہ اللہ تعالیٰ تین خداؤں میں سے ایک ہے (نعوذ باللہ منہ)

نوٹ: صرف زرارہ نہیں، بلکہ ابوبصیر اور دیگر مقربان بارگاہِ امام کا حال یہی ہے جیسے کہ کتبِ رجال میں تصریحات موجود ہیں، بوجہ طوالت ان تفصیلات کے درج

کرنے سے قاصر ہوں، لیکن اس قسم کی مذمت کی دلچسپ اور عجیب و غریب توجیہ کا ذکر کرنا ضروری ہے، وہ ملاحظہ فرمائیں اور اس مذہب کے بانیوں کی چالاکیاں، عیاریاں اور فریب کاریاں دیکھیں۔

شیعہ محدثین پر لعن و طعن کی حکمت

بجائے اس کے کہ حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی ایسے سخت الفاظ استعمال کئے جانے کے بعد زرارہ اور ابوبصیر وغیرہ محدثین شیعہ کو نظرانداز کیا جاتا بلکہ انہیں قابل نفرت سمجھا جاتا۔ اہل التشیع نے حضرت صادق علیہ السلام کے ان ارشادات کی توجیہ و تاویل کرکے اپنے ان محدثین کا دفاع کیا۔ چنانچہ رجال کشی کا محشی السید احمد الحسینی رقمطراز ہے کہ ابوعمرو محمد بن عمرو الکشی نے اس باب میں دو قسم کی روایات درج کی ہیں۔ ایک قسم کی روایات وہ ہیں، جن میں زرارہ کی مدح و ثناء، اس کی منزلت عظیمہ اور مرتبہ عالیہ کا بیان ہے اور حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے تمام اصحاب پر اس کو علم و معرفت اور اہل بیت کی احادیث کے حفظ و ضبط میں مقدام اور سرخیل قرار دیا گیا ہے اور علوم اہل بیت کو ضائع ہونے سے بچانے والا تسلیم کیا گیا ہے اور دوسرے قسم کی وہ روایات ہیں، جو بالکل اس کے برعکس ہیں جن میں اس کو، کذاب، روایات کا وضع کرنے والا، ریاکار، احادیث ائمہ میں اپنی طرف سے کلمات و عبارات داخل کردینے والا وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے۔

لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ واقعی زرارہ ان صفات ذمیمہ اور خصائل رذیلہ سے موصوف و متصف تھا، بلکہ ان مقربان بارگاہ امامت پر اعداء اور جبار و سرکش سلاطین زمان کی طرف سے مظالم کا نشانہ بننے اور قتل کئے جانے کا خطرہ تھا۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ ائمہ کرام ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ان مخلصین کی جانوں پر رحم کھاتے ہوئے ائمہ کرام ازرہ تقیہ ان کو ایسے القابات سے نوازتے تھے تاکہ سلاطین و حکام کے متوقع انتقام سے ان کو محفوظ کرسکیں۔

وکان من الطبعی ان یتخذ الائمة الهداة علیهم السلام التقیة وسیلة لحفظ اصحابهم وشیعتهم وحقن دماءهم البریئة فکانوا یقولون فی حق اصحابهم ما یرونه صالحا لوقایتهم عن التهم والشبهات۔ (حاشیہ رجال کشی، ص۱۴۳)

اور ائمہ کرام کے طبعی میلان کا تقاضا تھا کہ وہ ائمہ ہدیٰ تقیہ کو وسیلہ بناتے اپنے اصحاب اور شیعہ کی حفاظت اور ان کے بے گناہ خون کی حفاظت کے لیے، لہٰذا وہ اپنے اصحاب کے حق میں جو مناسب سمجھتے، انہیں تہمتوں اور شبہات سے بچانے کے لیے فرماتے رہتے۔

اب ذرا سوچ کر بتائیں کہ جس محدث اور رئیس الشیعہ کو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کافر و مشرک اور یہود و نصاریٰ سے بدتر کہیں، تو آپ کی اس مذمت اور تغلیظ و تشدید پر کان بھی نہ دھرا جائے، بلکہ یہ کہہ کر دل کو اطمینان دے لیا جائے کہ یہ سب کچھ اس گوہر نایاب کی سلامتی اور بقاء کے لیے کہا گیا ہے، تو پھر صادق و کاذب کے درمیان امتیاز کس طرح ہوسکتا ہے اور جھوٹے اور مکار لوگوں سے دین کا تحفظ کیونکر ممکن ہوگا، لہٰذا ہر مسلمان اور دیانت دار شخص اور صاحب عقل و خرد بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ائمہ اہل بیت کے ارشادات عالیہ کے قطعاً وہ مقاصد نہیں ہوسکتے جو بیان کیے گئے ہیں اور یہی گروہ ہے جس کی نشاندہی کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: میں کچھ کہتا ہوں اور وہ اس کی میری مراد اور مقصد کے برعکس تعبیر و تاویل کردیتے ہیں، بلکہ یہ صرف اور صرف یہودیوں اور مجوسیوں وغیرہ کی سازش ہے اور اسلام دشمنی کے لیے انہوں نے ائمہ کرام کی مقدس شخصیات کا اپنے آپ کو مخلص اور نیازمند ظاہر کیا اور اپنے کرتوتوں اور تباہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ان حضرات کو تقیہ باز ثابت کردیا اور ان کے ارشادات کو یہ کہہ کر بے اعتبار ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ گالیاں اور تکفیر وغیرہ ہماری حفاظت کے لئے سپر اور ڈھال حرز جاں اور تیغ بند تعویذ ہیں اور ان سے در اصل ہماری اہل السنت سے جان بچانا

مقصود ہے، ورنہ ہم تو اصلی مومن اور حقیقی شیعہ ہیں اور سچے لوگوں کے سردار و رئیس
مگر یہ سوال، اب بھی اپنی جگہ قائم ہے اور تشنۂ جواب ہے کہ بطورِ تقیہ ان اکابرین محدثین کی مذمت اپنے شیعوں کے سامنے کیوں فرمائی؟ کیا تقیہ اپنے لوگوں سے ہوا کرتا ہے یا غیروں سے؟ اور ان ثقۃ الاسلام اور شریعت مدار محدثینِ شیعہ کو اپنے شیعوں سے خطرہ تھا یا دوسرے لوگوں سے؟ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ یہ توجیہ و تاویل قطعاً قابلِ قبول نہیں ہے۔ غالباً علامہ ڈھکو صاحب نے اسی لیے اس توجیہ و تاویل سے گریز کیا اور دوسری صورت دھوکہ دہی کی نکالی کہ یہ عامی قسم کے شیعوں کے حق میں ائمہ کے ارشاد ہیں، خواص اور اصلی شیعوں کے حق میں نہیں، لیکن یہ بھی سراسر غلط اور خلافِ واقع توجیہ ہے جیسے کہ سطورِ بالا سے ظاہر ہو چکا ہے۔

محدثینِ شیعہ کا اثر ذاتِ امام پر

زرارہ بن اعین اور اس قسم کے دوسرے پراسرار راویانِ حدیث اور اقوالِ ائمہ کی تعبیر و تاویل کرنے والوں کی، حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے پاس آمد و رفت اور ان کی بیان کردہ احادیث کی غلط تعبیرات اور ان میں تلبیس و تدلیس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود امام صاحب کو روایت حدیث کے معاملہ میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور یہ سوال عام لوگوں کی زبان پر آگیا کہ آیا نقلِ احادیث میں ان کی شخصیت قابلِ اعتبار رہے بھی یا نہیں؟ چنانچہ ایسا ہی ایک سوال و جواب رجال کشی سے پیشِ خدمت ہے۔

ابو عمرو کشی لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن عبد الحمید الحمانی نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے، جو اس نے امامت کے موضوع پر تالیف کی ہے کہ میں نے شریک سے دریافت کیا کہ کئی اقوام کا خیال ہے کہ جعفر بن محمد ضعیف الحدیث ہیں تو اس نے کہا میں تمہیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔ آپ نیک اور پاکباز مرد تھے، لیکن جاہل قوم ان کے ارد گرد جمع ہو گئی، وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے پاس سے باہر آتے اور کہتے ہیں

حضرت جعفر بن محمد نے یہ احادیث بیان کی ہیں؛

ویحدثون باحادیث کلها منکرات کذب موضوعة علی جعفر لیستاکلوا الناس بذالك ویاخذون منهم الدراهم فکانوا یاتون من ذالك بکل منکر وسمعت العوام بذالك متهم فمنهم من هلك ومنهم من انکروا هٰؤلاء مثل المفضل بن عمر وبنان وعمرو النبطی وغیرهم ذکروا ان جعفر احدثهم ان معرفة الامام تکفی من الصوم والصلوة ان علیا علیه السلام فی السحاب یطیر مع الریح وانه کان یتکلم بعد الموت وانه کان یتحرك علی المغتسل وان اله السماء والارض هو الامام فجعلوا لله شریکا، جهال ضلال والله ما قال جعفر شیئا من هٰذا قط، کان جعفر اتقی لله واورع من ذالك فسمع الناس بذالك فضعفوه ولو رأیت جعفر العلمت انه واحد الناس
(رجال کشی ص ۲۷۵)

اور ایسی احادیث بیان کرتے، جو سب منکر، موضوع اور سراسر بہتان و افترا ہوتیں جس سے ان کا مقصود لوگوں سے کھانا اور دراہم وصول کرنا ہوتا تھا (اور جب تک یہ لوگوں پر بارگاہِ امام میں اپنا تقرب ظاہر نہ کرتے اور ان کے علوم و احادیث کے امین ہونے کا دعوی نہ کرتے، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا) لہذا ہر منکر اور جھوٹی روایت ان کی طرف منسوب کر کے بیان کر دیتے، چنانچہ جب عوام نے ان کی زبانی ایسی روایات سنیں تو بعض ان کے مطابق عقیدہ اپنا کر ہلاکت میں گر گئے اور اپنی عاقبت برباد کر بیٹھے اور بعض نے ان روایات کا انکار کر دیا اور ایسے مفتری اور کذاب مفضل بن عمرو، بنان اور عمرو نبطی وغیرہم تھے۔ انہوں نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ احادیث نقل کیں؛

۱۔ امام کی معرفت حاصل ہو جائے، تو نماز اور روزہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بادلوں میں ہیں اور آندھیوں کے ساتھ اڑتے رہتے ہیں۔ ۳۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ شہادت کے بعد کلام فرماتے تھے۔ ۴۔ اپنے تختۂ غسل پر خود بخود جنبش فرماتے تھے۔ ۵۔ زمین اور آسمان کا الٰہ و معبود امام ہی ہے۔

اور اس طرح انہوں نے امام کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا۔ یہ سبھی جاہل تھے اور گمراہ و بے دین بھی۔ بخدا حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ آپ بہت زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے تھے اور محتاط و متورع تھے۔ لوگوں نے اس قسم کی احادیث سنیں، تو آپ کو نقلِ حدیث اور اس کی روایت میں ضعیف قرار دے دیا، حالانکہ اگر تم آپ کو دیکھتے، تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ یکتائے روزگار ہیں۔

فوائد و نتائج: الغرض ساری تفصیلات عرض کروں، تو صرف اس موضوع پر ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ میں نے صرف یہ دکھلانا تھا کہ حضرتِ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے یہ ارشادات عوام شیعہ کے متعلق نہیں تھے، بلکہ ثقۃ الاسلام، شریعت مدار، اور علوم و احادیثِ ائمہ کے امین ہونے کے مدعی لوگوں کے متعلق ہیں اور جب خواص بلکہ اخص الخواص کا یہ حال ہے تو ع قیاس کن زگلستان من بہار۔

الغرض اب تک کی گزارشات سے چند فوائد حاصل ہوئے، جن پر تنبیہ ضروری ہے:

۱۔ اہل السنّت پر شیعی علماء اعتراض کرتے ہیں کہ اگر ان کو اہل بیت کرام سے تعلق و ارتباط ہوتا، تو ان کی کتابوں میں اہل بیت کی روایات اس کثرت سے کیوں نہ ہوتیں، جس طرح اہلِ تشیع کے ہاں ہیں، تو اس کی وجہ واضح ہو گئی کہ ان مقدس شخصیات کے گرد سبائی ٹیموں نے خاص مقصد اور مشن کے تحت گھیرا تنگ کر رکھا تھا اور کذب و افتراء اور دروغ بافی کا طوفان برپا کر رکھا تھا اور بظاہر وہ مخلص اور نیازمند تھے اور درحقیقت دشمن اور بدخواہ تھے، ان کے بھی اور اسلام کے بھی اور تقیہ بازی سے کام لیتے تھے اور فی الواقع ان حضرات سے صحیح طریقہ پر ثابت احادیث بہت کم دستیاب ہوتی تھیں، اس لیے اہل السنّت کے ہاں ان سے مروی احادیث کم ہیں۔

۲۔ نیز اس سوال کا جواب بھی آ گیا کہ جعفری کہلانے کی بجائے حنفی، شافعی اور مالکی وغیرہ کیوں کہلاتے ہیں، کیونکہ اہل بیت کرام کا صحیح مذہب اور حقیقی نظریہ صرف ان حضرات کو معلوم تھا اور انہیں کو ان کی صحیح احادیث و روایات معلوم تھیں، نہ کہ ہر راوی اور شاگرد ہونے کے دعوے دار کو بلکہ ان کی طرف نسبت کے اکثر دعویدار ان ائمہ کرام کے ارشادات کے مطابق کافر و مشرک تھے اور یہود و نصاریٰ اور اربابِ تثلیث سے بدتر، لہٰذا ان سے امتیاز حاصل کرنے کے لیے ان سچے اور راستباز تلامذہ کی طرف اپنے مسلک کی نسبت کی۔

جعفری مذہب کی حقیقت

۳۔ نیز ان حقائق کی روشنی میں جعفری مذہب کی حقیقت اور اصلیت بھی واضح ہو گئی کہ وہ دراصل امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا مذہب نہیں، بلکہ ان جھوٹے، مکار اور فراڈی، جالبِ زر اور لقمہ اندوز اور جہال و ضلال اور کفار و مشرکین اور ملحد و بے دین لوگوں کا تیار کردہ مذہب ہے اور ان راویوں نے اپنی مرضی کے مطابق ان کے ارشادات کو ڈھال کر یہ مذہب تیار کیا، لہٰذا اس کو ان ائمہ کرام کا مذہب کہنا غلط ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان اکابرینِ اہلِ بیت کا مذہب صرف اور صرف وہی ہے جس پر سوادِ اعظم اہل السنّت والجماعت ابتداء سے لے کر آج تک قائم ہیں اور جن کے اصول و قواعد اور بنیادی عقائد ہمیشہ سے متحد اور متفق علیہ ہیں اور اگر اختلاف ہے تو صرف فروعی اور اجتہادی مسائل میں جبکہ اہلِ تشیع کے ان شریعت مدار اور رؤسائے مذہب نے اپنی صواب دید اور پسند کے مطابق عقائد اختراع کر کے اہلِ تشیع کو متعدد مذاہب میں تقسیم کر دیا، جن میں باہم کفر و اسلام کا اختلاف موجود ہے اور ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ہم اہل بیت کے مذہب پر ہیں، حالانکہ خود شیعی علماء کو اعتراف ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں بھی خلفاء ثلاثہ کے عمل و کردار اور روش و رفتار کے مطابق عمل پیرا رہے اور دوسرے ائمہ کرام بھی ظاہر میں سوادِ اعظم اہل السنّت کے ہی موافق تھے، البتہ ان کے نزدیک باطنی اور حقیقی مذہب و نظریہ ان کا یہ نہیں تھا بلکہ بطورِ تقیہ اور

خوف و خشیت کے عام اہلِ اسلام پر سنّی مذہب ظاہر کرتے تھے اور حقیقی مذہب وہ تھا، جو صرف چند خواص کے سامنے ظاہر کیا کرتے تھے، جن کا حال ائمہ کرام کی زبانی سُن چکے ۔ لہٰذا جعفری مذہب قطعاً وہ نہیں، جو ان لوگوں نے بیان کیا ہے بلکہ یہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پر سراسر افترا ہے

۴۔ نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے مقامِ مذمت میں فیمن ینتحل التشیع اور یزعمون انّی لھم امام کے الفاظ کیوں ذکر فرمائے، کیونکہ اہل بیت کرام کا مذہب اہل السنّت والا تھا اور یہ لوگ بھی بظاہر اسی پر کاربند تھے اور خفیہ طور پر دوسرے مذاہب رائج کرنے کے درپے تھے جو ائمہ کرام کے ظاہر و باہر اور متواتر و مستفیض مذہب و مسلک کے سراسر خلاف تھے اس لیے فرمایا کہ یہ صرف ہمارے مخلص اور نیازمند ہونے کے دعوے دار ہیں اور درحقیقت یہود و نصاریٰ سے بدتر ہیں اور اہل السنّت کو تو دعوے کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ ان کا عمل و کردار ظاہر میں تھا، وہی عقیدہ و نظریہ واقعہ و حقیقت میں بھی تھا اور نہ ائمہ کرام کے اقوال کو ظاہری معانی سے تبدیل کرنے کی ان کو ضرورت تھی، اس لیے ان کے متعلق اس قسم کے تاثر اور ردِ عمل کا اظہار ائمہ کرام کی طرف سے ممکن ہی نہیں تھا اور یہیں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جن نیازمندوں اور متبعین و معتقدین کے متعلق تعریفی کلمات ائمہ کرام یا سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وارد ہیں، وہ کون ہیں؟ وہ صرف اور صرف اہل السنت ہیں، جن کی موافقت و متابعت کا حکم دیتے ہوئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خیر الناس فی حالا النمط الاوسط فالزموہ والزموا السواد الاعظم الخ کہ افراط و تفریط سے منزہ جماعت ہی ہلاکت سے محفوظ ہے (نہ محبت میں حد سے متجاوز اور نہ بغض سے کام لینے والے) لہٰذا اسی درمیانی جماعت کی اتباع و موافقت کرو اور اسی سوادِ اعظم کو لازم پکڑو، ان سے الگ ہونے والا اسی طرح شیطان کے تصرف میں جانے والا ہے، جس طرح ریوڑ سے الگ ہونے والی بھیڑ بکری بھیڑیئے کا لقمہ بنتی ہے ۔ اس پر تفصیلی گفتگو دوسرے

مقام پر ہو چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں ۔ الغرض علامہ موصوف کا ان تعریفی کلمات کو ان مخصوص نظریات کے حاملینِ شیعہ پر منطبق کرنا اور مسرت و شادمانی کا اظہار کرنا قطعاً درست نہیں ہے ۔

رسالہ مذہب شیعہ　　　　از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

قاتلانِ امامِ حسین رضی اللہ عنہ کون تھے؟

اب تھوڑا سا غور اس بات پر بھی کرلیں کہ امام عالی مقام سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو کن لوگوں نے شہید کیا اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے مکر و فریب کے ساتھ لاتعداد دعوت نامے لکھے تھے؟ احتجاج طبرسی ص ۱۵۷ پر مرقوم ہے کہ سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کوفیوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ تم نہیں جانتے کہ تم ہی لوگوں نے میرے والد ماجد کی طرف خط لکھے اور تم نے ہی ان سے دھوکہ کیا اور تم ہی لوگوں نے اپنی طرف سے عہد و پیمان باندھے، بیعت کی اور پھر تم ہی لوگوں نے ان کو شہید کیا اور ان کو تکلیفیں دیں، پس جو ظلم و ستم تم نے کمائے، ان کی وجہ سے ہلاکت ہے تمہارے لیے اور تمہارے برے ارادوں کے لئے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کس آنکھ سے دیکھو گے؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماویں گے، تم نے میری آل کو قتل کیا اور میرے خاندان کو تکلیفیں دیں، پس تم میری امت میں سے نہیں ہو۔

اور کتاب کشف الغمہ ص ۱۸۷ پر اہلِ کوفہ کے دعوت ناموں کی بعینہٖ عبارت کی نقل موجود ہے ۔ ملاحظہ فرماویں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ للحسین بن علی امیر المومنین من شیعتہ و شیعۃ ابیہ امیر المومنین ۔ سلام اللہ علیک ۔ امّا بعد: فان الناس منتظرونک ولا رأی لھم فی غیرک فالعجل فالعجل یابن رسول اللہ والسلام علیک ۔ یعنی حضرت

حسین بن علی (رضی اللہ عنہما) کی طرف اُن کے شیعوں کی جانب سے یہ دعوت نامے ہیں - آپ پر اللہ تعالیٰ کا سلام ہو۔ اس کے بعد گزارش ہے کہ سب لوگ آپ کے انتظار میں ہیں اور آپ کے بغیر ان کی نگاہ کسی پر نہیں پڑ رہی - اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند جلد از جلد تشریف لایئے (تاکہ یہ انتظار بھی ختم ہو)

کتاب مجالس المومنین کی عبارت بھی ملاحظہ ہو کہ کوفہ میں کون لوگ تھے، جنہوں نے دعوت نامے بھیجے تھے — مجالس المومنین ص ۲۵ ؛

وبالجملہ تشیع اہلِ کوفہ حاجت بہ اقامت دلیل ندارد و سُنّی بودن کوفی الاصل خلافِ اصل و محتاجِ دلیل است ——— یعنی خلاصہ مرام یہ ہے کہ اہلِ کوفہ کا شیعہ ہونا محتاجِ دلیل نہیں ہے، بلکہ بدیہی امر ہے اور اہلِ کوفہ کا سُنّی ہونا خلافِ اصل ہے اور محتاجِ دلیل ہے۔

اب ذرا ان کوفیوں کے متعلق اور محبت و تولّی کے علمبرداروں کے متعلق امام عالی مقام سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کا دوسرا ارشاد بھی سُن لیں ؛

(کتاب مناقب المعصومین ص ۵۲ مطبوعہ ایران) اے شیعانِ ! اے محبان ! لعنتِ خدا و لعنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بر تمامی اہلِ کوفہ و شام باد۔

یعنی اے شیعو! اے محبو! اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت ہو تم تمام اہلِ کوفہ اور اہلِ شام پر۔

غالباً ائمہ کرام کی جن روایات کا ظاہر کرنا ذلّت کا موجب تھا اور جن کے چھپانے کے متعلق بانیانِ مذہب شیعہ نے تاکیدیں کی تھیں اور اس بارے میں روایتیں گھڑی تھیں، وہ ائمہ کرام کی یہی حدیثیں تھیں جن کا نمونہ پیش کر چکا ہوں - واقعی اگر ائمہ کرام کے یہ ارشادات لوگوں کو سنائے جائیں، تو کون بیوقوف شیعہ مذہب اختیار کرے گا۔

(رسالہ مذہبِ شیعہ ص ۹۷ و ۹۸)

تنزیھہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

کیا قاتلانِ حسین شیعہ تھے؟

۱- پیر صاحب سیالوی نے اپنے دوسرے متعصب ہم مذہبوں کی طرح شہادت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا بے بنیاد الزام بھی بیچارے شیعوں کے سر تھوپنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ ان لوگوں کی حالت قابلِ تعجب ہے جو بجائے اس کے کہ جو اہلِ حق کی طرف سے لکھا جا چکا ہے، اسے صحیح تسلیم کریں اور خاموشی اختیار کریں یا پھر مدلّل طریقہ پر جواب الجواب دیں، مگر یہ ہیں کہ نہ یہ کرتے ہیں نہ وہ کرتے ہیں -

۲- درحقیقت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل وہ لوگ تھے، جن کا نعرہ میدان کربلا میں یہ تھا، انا علیٰ دین عثمان اور انصار حسینی کا جواب میدانِ کربلا میں یہ تھا، بل انت علیٰ دین الشیطان۔

۳- جس کوفہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت کے بعد پورے بیس سال معاویہ کی حکومت رہی ہو اور زیاد بن ابیہ گورنر رہا ہو اور جس نے ہر شجر و مدر کے نیچے چھپے ہوئے شیعہ کو تہِ تیغ کر دیا تھا، اس کوفہ میں ہزاروں کی تعداد میں شیعہ کہاں سے آگئے؟

۴- جہاں شیعہ کا لفظ موجود ہے تو اس سے مذہبِ شیعہ پر کاربند لوگ مراد نہیں، بلکہ ان پر یہ لفظ بایں معنیٰ استعمال کیا گیا ہے کہ معاویہ کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، ورنہ اُن کی اکثریت تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ ماننے والی تھی نہ کہ خلیفہ بلا فصل - اگر ایک ہی ایسا فرد ثابت کر دیا جائے، جو یزیدی افواج کی طرف سے لڑ رہا تھا اور خلافتِ بلا فصل کا بھی قائل تھا تو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔

۵- قاتلانِ حسین وہی لوگ تھے، جو یزید کو چھٹا خلیفہ اور اس کے باپ معاویہ کو مسندِ رسول کا پانچواں خلیفہ تسلیم کرتے تھے، بلکہ قتل الحسین یوم السقیفۃ حسین تو سقیفہ کے دن شہید کر دیئے گئے تھے۔

۶۔ یہ بحث ہی فضول ہے، قتل کرنے کے بعد وہ کافر و مرتد تھے اور قتل سے پہلے اُن کا مذہب وہی تھا جو اس شخص کا مذہب تھا، جس کی حکومت کے تحفظ کے لیے اور جس کی اطاعت گزاری کے لیے یہ لوگ جنگ لڑ رہے تھے اور یہ معلوم کرنا کہ وہ کس مذہب کا چھٹا خلیفہ ہے، چنداں مشکل نہیں ہے۔

رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۶۵ و ۱۶۶)

تحفۂ حسینیہ — از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

قاتلانِ امام حسینؓ وہی تھے جنہوں نے بُلا کر امداد دینے سے انکار کر دیا تھا

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی مدلل اور باحوالہ تحریر کے جواب میں علامہ ڈھکو صاحب نے جو کچھ فرمایا، وہ سب صدری نسخہ ہے جس کا حوالہ جات اور کتبِ مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ صرف خیالی گفتگو ہے اور محض احتمالات و امکانات کو قطعی حقائق کا نام دے کر دو اڑھائی صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔ سب سے پہلے یہ حقیقت واضح کرنے کی اشد ضرورت تھی کہ بُلانے کون تھے؟ اور ان پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اعتماد کیوں کیا تھا؟ اور جو لشکر میدانِ کربلا میں تھا، یہ کوفہ کے ہی لوگ تھے یا باہر سے منگوائے گئے تھے؟ اگر کوفہ میں خلافتِ بلا فصل کا عقیدہ رکھنے والے اور حقیقی شیعہ اور اسمِ بامسمّٰی قسم کے شیعہ موجود نہیں تھے یا ان کی اتنی تعداد نہیں تھی جو آپ کے ساتھ مل کر یزیدی قوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کر سکتے، تو آپ کا اس دعوت کو قبول کرنا اور کوفہ کی طرف عازمِ سفر ہونا بے جواز ہو جاتا ہے۔ اگر وہاں کے سبھی لوگ یا جمہور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پانچواں اور یزید کو چھٹا خلیفہ تسلیم کرنے والے تھے اور دیگر علاقوں میں بھی صورتِ حال یہی تھی اور آپ کے قریبی برادری کے لوگ یعنی

بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب اور بنو عبد مناف بھی ساتھ نہیں تھے اور بالخصوص حضرت محمد بن حنفیہ جیسے بھائی اور حضرت عبداللہ بن عباس جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی اور ان کے دستِ راست اور ان کی اولاد بھی ساتھ نہیں تھے تو عازمِ کوفہ ہونے کا جواز کیا رہ جاتا ہے۔ پھر کوفہ میں آپ رہائش پذیر رہے، وہاں کی سابقہ حالت اور موجودہ حالت سے بھی پوری طرح باخبر تھے اور اس کے باسیوں سے پوری طرح آگاہ تھے اور یہ بھی یقیناً آپ کے علم میں ہو گا کہ امیر معاویہ کے دورِ حکومت اور زیاد کی گورنری کے دوران ان پر کیا قیامت ٹوٹی اور اس میں اب کتنے آدمی ہمارے شیعہ میں سے ہیں تو اگر ان میں یزید کے ساتھ ٹکر لینے کی ہمت و طاقت نہیں سمجھتے تھے، تو پھر اس سفر کا اور ان کی دعوت کو قبول کرنے کا جواز ثابت کریں اور قوت و طاقت نہ ہونے کے باوجود ترکِ تقیہ کی توجیہ پیش کریں اور اگر خواہ مخواہ جان ہی دینی تھی، تو مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ اور مصر و بصرہ وغیرہ میں بھی یزید کے عامل موجود تھے۔ ادھر رُخ کیوں نہ فرمایا اور حصولِ شہادت کی سعی کیوں نہ فرمائی اور خطوط موصول ہونے اور دعوت نامے پہنچنے سے پہلے یہ پروگرام کیوں نہ بنا لیا اور جنہوں نے خطوط لکھے تھے، ان کے عقیدہ و نظریہ کو کیوں نہ پوری طرح جانچ پرکھ لیا؟

لہٰذا جب تک اس سوال کا اور اس کی جملہ شقوق کا جواب نہیں مل جاتا، یہ تقریر و تحریر پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتی، خواہ علامہ ڈھکو صاحب اسے دہرائیں یا اس کے اسلاف اسے بیان کریں اور نہ اس کو دیکھ سُن اور پڑھ کر کوئی عقلمند مطمئن ہو سکتا ہے، لہٰذا اس کو صحیح تسلیم کرنے کا تو سوال ہی کیا۔ رہا علامہ صاحب کی طرف سے مدلل جواب کا مطالبہ تو وہ ہمارے اکابرین نے پہلے بھی پورا کیا، اور اب ہم بھی پورا کریں گے۔

دینِ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کیا تھا؟

۲۔ علامہ موصوف نے فرمایا: قاتلانِ حسین وہ تھے، جن کا نعرہ میدانِ کربلا

میں یہ تھا کہ ہم دینِ عثمان پر ہیں جس کے جواب میں انصارِ حسینی کہا کرتے تھے بلکہ تو دین شیطان پر ہے ۔ پہلے تو یہ عرض کروں کہ ڈھکو صاحب کو اس عبارت کا معنیٰ و مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آیا یا آپ نے دیدہ دانستہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دین و مذہب معلوم کریں اور پھر اس جملہ کا معنیٰ و مفہوم سمجھیں ۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دین اور مذہب نعوذ باللہ شیطان والا تھا، تو اُن کے محاصرہ کے دوران حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ان کے پہرے دار کیوں بنے رہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ آن کی طرف سے دفاع کیوں کرتے رہے اور ان باغیوں کے خلاف جہاد کا اذن کیوں طلب کیا، پھر ان شہید کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنے اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم کیوں ظاہر فرمایا جبکہ آپ سے بیعت کرنے والے مہاجرین و انصار نے عرض کیا تھا، لو عاقبت قوماً ممن اجلب علی عثمان ۔ کاش کہ آپ ان لوگوں کو سزا دیتے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف محاصرہ کیا اور قتل کرنے کا ارتکاب کیا۔

پوری تفصیلات حضرت امیر اور امام حسن رضی اللہ عنہما کے دفاع کی، اور عزم انتقام کی معلوم کرنی ہوں تو نہج البلاغہ جلد اول صفحہ ۳۹ شرح ابن ابی الحدید جلد ثانی صفحہ ۱۴۲ و ۱۵۳ ناسخ التواریخ جلد دوم کتاب دوم ص ۵۳۶ و ص ۵۳۵ پر ملاحظہ فرمائیں اور تحفہ حسینیہ حصہ اول ص ۴۶۷، ۴۶۸ پر مطالعہ فرمائیں اور ان کے علاوہ دیگر دلائل اور شواہد ان کی فضیلت و منقبت کے ملاحظہ فرما کر تسلی کر لیں کہ ان کا مذہب کیا تھا، اور بارگاہِ نبوت و رسالت اور نگاہِ امامت و ولایت میں ان کا مقام کیا تھا۔ الغرض حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا مذہب وہی تھا جو حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کا تھا اور جملہ مہاجرین و انصار کا بلکہ جس کی بنیاد رسولِ معظم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔

اب یہ سمجھ لیجئے کہ اس جواب کا مطلب و مفہوم کیا تھا، چونکہ اس قائل نے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا دین و مذہب حضرات اہل بیت کرام سے الگ سمجھا تھا، تو اس کا

رد کرتے ہوئے اور تکذیب کرتے ہوئے کہا تو حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے دین پر نہیں بلکہ شیطان کے دین پر ہے، کیونکہ ان کا دین و مذہب تو وہی تھا جو ان حضرات کا تھا اب یہ علامہ ڈھکو صاحب کو نحو کی ابتدائی کتابوں میں درج شدہ قواعد ہی معلوم نہ ہوں، یا دیدہ دانستہ ان سے آنکھیں بند کر لیں، تو اس کا کیا علاج ہے۔ بل کا کلمہ اضراب کے لیے ہوتا ہے۔ ایک حکم کی نفی کر کے دوسرا ثابت کرنا ہو، تب اسے استعمال کرتے ہیں۔ ما جاءنی زید بل عمرو کا ترجمہ نحویوں کے نزدیک یہ ہے کہ زید نہیں آیا، بلکہ عمرو آیا ہے جبکہ علامہ صاحب کے نزدیک ان کے قول کے مطابق یہ ترجمہ بنے گا کہ نہ زید آیا نہ عمرو بلکہ زید اور عمرو ایک شے ہے ع بریں عقل و دانش بباید گریست ــــــ اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے دین و مذہب کو ائمہ کرام کے مذہب سے مختلف کیسے کہا جا سکتا ہے، جبکہ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ و جدال اور حرب و قتال کے باوجود فرماتے ہیں:

الظاهر ان ربنا واحد ونبینا واحد ودعوتنا فی الاسلام واحدة، لانستزیدهم فی الایمان بالله والتصدیق برسوله ولا یستزیدوننا، الامر واحد الا ما اختلفنا فیه من دم عثمان ونحن منه براء ۔ (نهج البلاغة مصری جلد ثانی ص ۱۵۲)

یعنی یقیناً ہمارا رب ایک ہے، نبی ایک ہے اور اسلام میں دعوت ایک ہے، نہ ہم ان پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان اور رسولِ گرامی کی تصدیق میں زائد اور افضل ہونے کے دعوے دار ہیں اور نہ ہی وہ ہم پر اس ایمان و تصدیق میں فوقیت کے مدعی ہیں۔ ہم دونوں فریق کا معاملہ دین اور مذہب کے لحاظ سے ایک ہے ماسوائے اس کے کہ خونِ عثمان میں ہمارا باہم اختلاف ہو گیا ہے اور ہم اس سے بری اور پاک دامن ہیں

جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ ہونے کے باوجود دین و مذہب میں ان کے ساتھ اختلاف نہیں، تو حق کی خاطر حضرت علی رضی اللہ عنہ خود اُن

کے مخالفین سے جنگ کرنے کو تیار ہوں اور اپنے لختِ جگر، حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے نورِ نظر اور نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے جنتی پھول یعنی حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہرے دار مقرر کریں اور اُن کا سپاہی بنا دیں؟ ان کے ساتھ دین و مذہب میں کیونکر اختلاف ہو سکتا تھا اور ان کے مذہب کو شیطان کا دین و مذہب کون قرار دے سکتا ہے، سوائے شیطان صفت انسان کے؟

الغرض اس جملہ سے اس شیطان کا ذکر کرنا مقصود تھا، جس نے دین میں اختلاف سمجھا تھا اور خود اس کی حقیقت بیان کی جا رہی تھی نہ کہ دینِ عثمان رضی اللہ عنہ کو دینِ شیطان قرار دیا جا رہا تھا، ورنہ ائمہ کرام کا بھی العیاذ باللہ اسی مذہب پر ہونا لازم آئے گا۔

کوفہ میں شیعہ کی تعداد کتنی تھی؟

۳۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے بیس سالہ دورِ حکومت میں کوفہ کے سب شیعہ تہ تیغ کر دیئے گئے تھے، لہٰذا اب وہاں ہزاروں کی تعداد میں شیعہ تھے کہاں؟ یہ جواب علامہ طبرسی کی احتجاج میں اور قاضی نور اللہ شوستری کی مجالس المومنین میں ذکر کیا گیا ہے۔ قاضی صاحب کے الفاظ یہ ہیں،
تا چناں کرد کہ کسے از شیعہ در آں جا نماند (مجالس المومنین جلد ۱ ص ۵۶)
یعنی کچھ قتل ہوئے، کچھ سولی پر لٹکا دیئے گئے اور بعض کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے تھے۔ مگر یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا کہ یہ صورتِ حال حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں تھی؟ جب معلوم تھی اور یقیناً معلوم تھی تو آپ نے کوفہ کا رُخ کیوں کیا؟ کیا جن لوگوں نے خطوط لکھے تھے، اُن کو آپ جانتے نہیں تھے؟ اور اُن کا مذہب و مسلک آپ کو معلوم نہیں تھا؟ جب جانتے پہچانتے بھی تھے، اور اُن کا مذہب و مسلک آپ کو معلوم تھا، تو مذہبی مخالفت کے باوجود ان پر اعتماد کیسے کر لیا اور اپنی امامت و خلافت کے لیے ان کی امداد و اعانت پر اعتماد اور بھروسہ کیسے کر لیا؟

لہٰذا یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آپ کو اپنے ہم عقیدہ بلکہ مخلصین اور نیازمندوں کی اتنی کثیر تعداد معلوم و محسوس ہوئی تھی جو یزیدی عساکر و افواج کے مقابلے کی تاب و توانائی رکھتے تھے، تبھی آپ نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور کوفہ کی طرف تشریف لے جانے کا عزم مصمم کیا۔ اب اس اجمال کی تفصیل عرض کرتا ہوں اور شیعی کتابوں سے یہ حقیقت واضح کرتا ہوں، کیونکہ علامہ موصوف کو تو اپنی مذہبی دیکھنے کا موقع نہیں ملتا اور یا انہیں جھوٹ بولنے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر معاملہ میں جھوٹ پر جھوٹ بولنا ہی لازم اور ضروری سمجھتے ہیں۔

الشیخ مفید، سید بن طاؤس، ابن شہر آشوب و دیگراں روایت کردہ اند کہ چوں امام حسن علیہ السلام بریاض جنت ارتحال فرمود شیعیان در عراق بحرکت در آمدہ عریضۃً بامام حسین نوشتند کہ ما معاویہ را از خلافت خلع کردہ باشما بیعت میکنیم حضرت در آں وقت صلاح دراں امر ندانستہ ایشاں را مجاب نمود و بصبر امر کرد۔ جلاء العیون ص ۳۴۸ (یعنی جب امام حسن رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو شیعان عراق حرکت میں آ گئے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ ہم معاویہ کو خلافت سے معزول کر کے تمہارے ساتھ بیعت کرتے ہیں۔ آپ نے اس وقت یہ اقدام مصلحت کے خلاف سمجھا، لہٰذا ان کی استدعا قبول نہ کی اور انہیں صبر کرنے کا حکم دیا۔

اگر امام حسن رضی اللہ عنہ کے وصال تک دس سالہ دورِ خلافت و امارت میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اور ان کے گورنر نے ان کو تہ تیغ کر دیا تھا اور وہاں کوئی شیعہ نہیں بچا تھا، تو یہ حرکت میں آنے والے کہاں سے پیدا ہو گئے اور انہوں نے اپنے اندر اتنی قوت کیسے سمجھ لی کہ عالمِ اسلام کے حاکم کو معزول کر دیں۔
نیز علامہ ڈھکو صاحب یہ بھی بتلائیں کہ یہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پانچواں خلیفہ تسلیم کرتے تھے یا اُن کی خلافت کے مخالف تھے اور خالص شیعانِ حسین رضی اللہ عنہ تھے۔

۲۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد پھر اہلِ عراق حرکت میں آ گئے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی جناب میں خطوط، قاصد اور ایلچی دوڑانے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دعوے یہ کیے گئے کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ ہم صرف آپ کی راہ میں آنکھوں کا فرش بچھائے ہوئے ہیں۔ بس تمہارے پہنچنے کی دیر ہے کہ کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو نکال باہر کریں گے ——— اگر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے قبل کے اس عرصہ میں بھی اہل کوفہ قتل و مصلوب ہو چکے ہوتے، تو یزید کے گورنر کو نکالنے اور اس کی افواج و سپاہ کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خلافت و حکومت قائم کرنے کے دعوے دار کون تھے؟ کیا یہ لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پانچواں اور یزید کو چھٹا خلیفہ ماننے والے تھے یا خالص شیعانِ حسین رضی اللہ عنہ تھے؟

اب شیعی کتب کی عبارات کے آئینہ میں اس حقیقت کا بچشمِ خود مشاہدہ کریں:

(۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ این نامہ ایست بسوئے حسین بن علی از جانب سلیمان بن صردِ خزاعی، مسیب بن نجیہ، رفاعہ بن شداد بجلی، حبیب بن مظاہر و سائر شیعانِ او از مومنان و مسلمانانِ اہل کوفہ۔ سلام خدا بر تو باد و حمد میکنیم خدارا بر نعمت ہائے کاملۂ او بر ما و شکر میکنیم او را کہ بر آنکہ ہلاک کرد دشمنِ جبار معاند ترا کہ بے رضائے امت بر ایشاں والی شدہ (تا) پس خدا او را لعنت کند چنانچہ قوم ثمود را لعنت کرد۔ بداں کہ ما دریں وقت امام و پیشوائے نداریم بسوئے ما توجہ نما و بشہرِ ما قدم رنجہ فرما کہ ما ہمگی مطیع توئیم (تا) نعمان بن بشیر حاکم کوفہ در قصر الامارت نشستہ است در نہایت مذلت و بجمعۂ او حاضر نمی شویم و در عید با او بیروں نمے رویم چوں خبر برسد کہ شما متوجہ ایں صوب شدہ اید او را از کوفہ بیروں کنیم تا باہلِ شام ملحق گردد والسلام (جلاء العیون ص۳۵۶)

ترجمہ: "یہ خط ہے حسین بن علی (رضی اللہ عنہما) کی طرف، سلیمان بن صرد خزاعی، مسیب بن نجیہ، رفاعہ بن شداد بجلی، حبیب بن مظاہر اور دیگر شیعانِ حسین،

مومنین و مسلمین اہلِ کوفہ کی طرف سے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کا سلام ہو، ہم اللہ کریم کی حمد بجالاتے ہیں، اس کی کامل نعمتوں پر اور اس کا شکر ادا کرتے ہیں اس احسان پر کہ اُس نے تمہارے جابر و سرکش اور معاند دشمن کو ہلاک کر دیا ہے جو اُمت کی رضامندی کے بغیر ان کا والی بن گیا تھا (تا) پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت ہو، (العیاذ باللہ) جیسے کہ اُس نے قوم ثمود پر لعنت کی۔

یقین کیجیے۔ اس وقت ہمارا کوئی امام اور پیشوا نہیں ہے، لہٰذا ہماری طرف متوجہ ہوں اور ہمارے شہر میں قدم رنجہ فرمائیں، کیونکہ ہم تمام ہی آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں (تا) نعمان بن بشیر حاکمِ کوفہ انتہائی ذلّت کے ساتھ کوفہ کے قصرِ امارت کے اندر بیٹھا ہوا ہے نہ اُس کے ساتھ ہم جمعہ پڑھتے ہیں اور نہ عید میں اس کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ جب ہمیں یہ خبر فرحت اثر ملے گی کہ آنجناب اس طرف متوجہ ہو چکے ہیں، تو ہم اس کو کوفہ سے باہر نکال دیں گے تاکہ وہ اہلِ شام کے ساتھ جا ملے۔ والسلام!"

یہ خط حضرت امام عالی مقام علیہ السلام کے پاس پہنچانے والے قاصد عبداللہ بن مسمع ہمدانی اور عبداللہ بن وال تھے۔

علامہ ڈھکو صاحب! ذرا اپنے باقر مجلسی صاحب کی اس تحریر کو غور سے پڑھیں اور اہل کوفہ کے اکابرین کے اس خط کو بغور پڑھیں۔ پھر اپنے دھرم سے بتلائیں، واقعی یہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پانچواں اور یزید کو چھٹا خلیفہ تسلیم کرتے تھے یا مخلص ترین شیعہ تھے جو ان کے ایمان و اسلام پر بھی اعتماد نہیں رکھتے تھے، بلکہ انہیں قومِ عاد کی طرح لعنت کا مستحق سمجھتے تھے، کیا آپ کو وہ جواب دیتے وقت شرم نہ آئی —؟

ب۔ مندرجہ بالا خط ارسال کرنے کے دو دن بعد ڈیڑھ صد خطوط لکھے گئے، جن کو کوفہ کے عظماء و رؤسا نے تحریر کیا اور ایک ایک، دو دو، تین تین، چار چار، بلکہ اس سے بھی زیادہ نے مل کر ایک ایک خط لکھا تھا اور ان خطوط کو

بارگاہ امام عالی مقام میں لے جانے والے قاصد تھے: قیس مصہر۔ عبداللہ بن شداد اور عمارہ بن عبداللہ۔ ملاحظہ ہو جلاء العیون۔ ص ۳۵۶)

جب عظماء و رؤسا اتنی تعداد میں تھے، تو ان کے ماتحت اور تابع و فرمانبردار کتنے ہوں گے، ان کا خود ہی اندازہ کر لیں۔

ج: ان ڈیڑھ صد خطوط کی روانگی کے دو دن بعد ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے ہاتھ یہ خط روانہ کیا گیا، جس میں پہلے خط کی طرح پورے شہر کوفہ بلکہ تمام علاقہ اور ولایت عراق کے لوگوں کو چشم براہ ظاہر کیا گیا، اور کسی دوسرے شخص کی امامت و خلافت تسلیم کرنے کا امکان بھی مسترد کرتے ہوئے جلد از جلد کوفہ پہنچنے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ایں عریضہ ایست بخدمت حسین بن علی از شیعیان، فدویان و مخلصان آنحضرت امابعد بزودی خود را بدوستان و ہواخواہان خود برساں کہ ہمہ مردم ایں ولایت منتظر قدوم مسرت لزوم تواند و بسوئے غیر تو رغبت نماید۔ البتہ البتہ بتعجیل تمام خود را بایں مشتاقاں مستہام برساں والسلام خیر ختام۔

د: اس کے بعد شبث بن ربعی۔ جبار بن ابجر۔ یزید بن الحارث۔ عروہ بن قیس۔ عمرو بن الحجاج اور محمد بن عمرو نے آپ کی امداد و اعانت کے لیے تیار کھڑے عساکر و افواج کی اطلاع دیتے ہوئے یہ عریضہ لکھا،

امابعد۔ صحراہا سبز شدہ و میوہا رسیدہ، اگر بایں صوب تشریف آوری لشکرہائے تو مہیا و حاضر اند و شب و روز انتظار مقدم شریف تو میبرند (جلاء العیون ص ۳۵۷)

یہی تیار لشکروں اور منتظر عساکر کا مژدہ سنانے والے میدان کربلا میں امام عالی مقام کے مقابل کھڑے تھے۔ جب امام عالی مقام نے ان کو پکار کر فرمایا: اے شبث، اے جبار، اے یزید! کیا تم نے یہ خط نہیں لکھا تھا جیسے کہ

ارشادِ مفید کے حوالے سے اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔ امام عالی مقام نے ان کے خطوط پر کیوں اعتبار کیا؟ اور میدان کربلا میں لشکر اعداء کی طرف کھڑے دیکھ کر انہیں کیوں شرم دلائی، جبکہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پانچواں اور یزید کو چھٹا خلیفہ ماننے والے تھے۔ کیا انہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف لشکر تیار کرنے کی اطلاع دی تھی یا اُن کی امداد و اعانت کے لیے اور ایسے لشکر تیار کرنے والے مخلص شیعان حسین تھے یا نہیں تھے؟

ھ: اس کے بعد ایک ہی دن میں چھ سو خطوط اہل کوفہ کی طرف سے موصول ہوئے اور یہ سلسلہ برابر قائم رہا، حتیٰ کہ بارہ ہزار خطوط حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پہنچ گئے: تا آنکہ در یک روز شش صد نامہ از آں غداراں بآنحضرت رسید چوں مبالغۂ ایشاں از حد گزشت ورسولاں بسیار نزد آنحضرت آمدند و جمع شدند دوازدہ ہزار نامہ از آں ناحیت بآنجناب رسید (جلاء العیون ص ۳۵۷)

اگر بارہ ہزار خطوط میں بھی ایک ایک سے چھ چھ تک لکھنے والے شمار کریں تو اوسطاً چھتیس ہزار کے قریب تو یہ بن جاتے ہیں جنہوں نے خطوط ارسال کیے، اور یہ بھی کہنا ممکن نہیں کہ ہر ہر شیعہ نے خط لکھا تھا، کیونکہ یہ عرف و عادت کے بھی خلاف ہے اور اکثریت ایسے لوگوں کی بھی ہو گی جو لکھ ہی نہیں سکتے ہوں گے، تو اس طرح بارہ ہزار خطوط کے پس منظر میں یہ تعداد لاکھوں تک پہنچنی چاہیے، جبکہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا تھا کہ نہ صرف پورا شہر کوفہ، بلکہ پورا عراق صرف اور صرف جناب کی امامت و خلافت کا خواہشمند ہے اور آپ کے لیے چشم براہ۔

۳۔ چنانچہ امام مظلوم نے ان رسل و رسائل اور قاصدوں اور پیاموں پر اعتماد کر کے اس دعوت کو قبول کرنے کا ارادہ فرما لیا اور حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام دے کر کوفہ روانہ کیا: اینک میفرستم بسوئے شما برادر و پسر عم و محل اعتماد خود پسر عقیل را پس اگر او بنویسد بسوئے من کہ مجتمع شدہ است رائے عقلاء و دانایان و اشراف و بزرگان شما آنچہ در نامہا درج کردہ بود بیاید انشاء اللہ

بزودی بسوئے شما آیم ۔ (جلاء العیون ص ۳۵۷)

میں ابھی تمہاری طرف اپنے چچیرے بھائی ابن عقیل کو بھیج رہا ہوں ۔ اگر وہ میری طرف لکھیں گے کہ واقعی تمہارے عقلاء اور دانا اور اشراف و بزرگ اس رائے پر متفق ہیں جو کچھ تم نے خطوط میں لکھا ہے، تو میں ان شاء اللہ جلد ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔

حضرت امام عالی مقام کی اس جانچ پرکھ اور حقیقتِ حال سے مکمل آگاہی کی سعی و کوشش کے باوجود اور تمام تر حزم و احتیاط کے باوصف ان عقلاء و شرفاء اور عظماء و رؤسا نے ذرہ بھر ضعف و ناتوانی اور بزدلی و بدحواسی کا شائبہ بھی نہ ہونے دیا اور اتنی کثیر تعداد نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے ان کے نمائندے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ وہ مکمل طور پر مطمئن ہو گئے اور انہوں نے امام عالی مقام کو خط لکھ کر اپنے وثوق و اعتماد اور اطمینان سے آگاہ کر دیا۔

(۱) چوں (مسلم بن عقیل) داخل شہر کوفہ شدند در خانۂ مختار بن ابی عبید ثقفی نزولِ اجلال فرمودہ و مردم کوفہ از استماعِ قدوم مسلم اظہار سرور بسیار نمودند و فوج در فوج بخدمتِ اُو می آمدند و نامۂ امام حسین را برایشاں میخواند از استماع آں نامہ گریاں گردیدند و بیعت میکردند تا آنکہ بردستِ مسلم ہژدہ ہزار نفر از اہلِ کوفہ بشرفِ بیعت آنحضرت سرفراز گردیدند پس مسلم عریضہ بخدمتِ آنحضرت نوشت (تا) اگر متوجہ ایں صوب گردید مناسب است (ص ۳۵۸)

خلاصۃ المرام یہ کہ اٹھارہ ہزار آدمی نے شہرِ کوفہ سے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں مطمئن کر دیا اور انہوں نے ان کا اخلاص دیکھا اور نیاز و انکسار مشاہدہ میں آیا اور آپ کے خط پر آنسو بہاتے دیکھا، تو کسی طرح کا تردد اور شک و شبہ باقی نہ رہا اور ظاہر ہے کہ جب حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر صرف شہر سے اٹھارہ ہزار نے بیعت کر لی تھی، تو آپ کے پہنچنے پر پورے علاقے کے کتنے لوگ حلقۂ بیعت میں داخل ہو جاتے، جبکہ اگلی روایت میں یہ تعداد پچیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔

اس کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

(ب) ابن شہر آشوب و دیگراں روایت کردہ اند چوں مُسلم بن عقیل وارد کوفہ شد در خانۂ سالم بن مسیب نزول کرد و دوازدہ ہزار کس با و بیعت کردند، چوں ابن زیاد داخل شد درمیان شب بخانۂ ہانی انتقال نمود و در پنہاں از مردم بیعت می گرفت تا آنکہ بست و پنج ہزار نفر با و بیعت کردند ۔ (ص ۳۶۱)

الحاصل ان روایات میں مذکور کوفیوں کی ہزاروں کی نفری اور اُن کی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا جبکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ خلیفہ و امیر یزید کا گورنر اور عامل بھی کوفہ میں موجود ہو تو کیا یہ اس حقیقت کی قطعی دلیل نہیں ہے کہ یہ لوگ نہ امیر معاویہ کو پانچواں خلیفہ مانتے تھے اور نہ یزید کو چھٹا خلیفہ، بلکہ وہ ان دونوں باپ بیٹے کے ساتھ سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنے والے تھے، لہٰذا ان حقائق کے مطالعہ کے باوجود ان کوفیوں کو شیعۂ خیر البریہ تسلیم نہ کرنا کسی بھی دیانت دار اور ایماندار شخص کے نزدیک درست نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتے تھے وہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کو بھی درست تسلیم کرتے تھے اور جس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو انہوں نے امارت و خلافت سونپ دی تھی، ان کی توہین و تحقیر کو بھی قطعاً روا نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس کو ایمان کے منافی سمجھتے تھے، لہٰذا مہر نیمروز کی طرح روشن ہو گیا کہ یہ سبھی شیعہ تھے اور اہل بیت کرام کے موالی اور محب ہونے کے مدعی، مگر نہ حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کو زیاد کے مقابلہ پر کوفہ میں کام آئے اور نہ ہی امام حسین رضی اللہ عنہ کو میدانِ کربلا میں کام آئے ۔ اب علامہ صاحب ہی بتلائیں کہ بیعت کے بعد اُن کو زمین نگل گئی تھی یا ملائکہ نے آسمان پر اُٹھا لیا تھا؟ رضوانِ جنت اُن کو لے گیا تھا یا مالکِ خازنِ نار۔

واقعۂ کربلا کے بعد شیعی تعداد اور کثرت

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین جلد دوم میں شیعہ خیر البریہ کے ملوک نامدار اور سلاطین کامگار کا عنوان قائم کر کے سلیمان بن صرد خزاعی اور مختار ثقفی کی زیر قیادت اہل کوفہ کا بنو امیہ سے بدلہ لینے کا عزم اور سابقہ کوتاہی کی تلافی کی جدوجہد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) سلیمان بن صرد کے ہاتھ پر ایک لاکھ آدمی نے اس مقصد کے لیے بیعت کی تھی، جب ۶۵ھ میں اس نے خروج کا ارادہ کیا اور اعلانِ جہاد کرایا تو صرف دس ہزار آدمی اس کے جھنڈے تلے جمع ہوئے۔

از صد ہزار کس کہ با وبیعت کردہ بودند دہ ہزار کس بیشتر نیافت۔

(مجالس المومنین، جلد دوم، ص ۲۴۳)

(۲) اس لشکر نے شام کی طرف کوچ کیا، تو ابن زیاد نے حصین بن نمیر وغیرہ کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ میدان کارزار میں سلیمان بن صرد، مسیّب بن نجبہ فزاری، عبداللہ بن سعد اور عبداللہ بن وال یکے بعد دیگرے قتل ہو گئے تو رفاعہ بن شداد نے کوفی لشکر کی کمان سنبھال لی۔ جب شام ہو گئی، تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ہمارے بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں۔ اگر ہم میدانِ کارزار میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں، تو ہم بھی قتل ہو جائیں گے اور ہمارا مذہب جہان سے بالکل معدوم ہو جائے گا۔ لہٰذا ہمیں اپنے گھروں کو واپس لوٹ جانا چاہیے، چنانچہ عبداللہ بن عوف کے مشورہ پر رات کی تاریکی میں میدانِ کارزار سے بھاگ کر کوفہ پہنچ گئے اور اس مذہب کے نئے پرچارک اور فدائی پیدا کرنے میں مشغول ہو گئے۔

"رفاعہ قدمے چند باز پس نہادہ با یاراں گفت مردم ما اکثر کشتہ شدہ اند و اگر ما دریں معرکۂ ثبات نمائیم آنچہ ماندہ اند بقتل رسند و ایں مذہب از جہاں برافتند، ما ازراہ کوفہ پیش باید گرفت الخ (مجالس المومنین، ج ۲، ص ۲۴۴)

علامہ ڈھکو صاحب خدا لگتی کہیے یہ کس مذہب کے پیروکار تھے اور ان کے میدانِ جنگ میں کام آنے سے کون سے مذہب کے جہان سے نیست و نابود ہونے کا خطرہ تھا۔ امیر معاویہ اور یزید کو پانچویں اور چھٹے خلیفے ماننے والوں کا یا خلافت بلا فصل اور امامت کے اہل بیت میں منحصر اور مختص ماننے والوں کا؟

۳۔ اس لشکر کی شکست کے بعد مختار ثقفی نے اہل کوفہ کی قیادت سنبھالی اور آخر کار ابن زیاد اور اس کے لشکریوں پر غلبہ حاصل کر لیا اور ظاہر ہے کہ یہ سبھی لشکری بھی امیر معاویہ اور یزید کے معتقد نہیں تھے، بلکہ شیعہ موالی تھے، جیسے کہ شوستری نے کہا: (مجالس المومنین جلد دوم ص ۲۴۹ میں ہے:)

"کافہ کوفیاں بخدمت مختار مبادرت نمودند و بکتاب خدا و سنت رسولِ خدا و اطاعت مہدی یعنی محمد بن حنفیہ در طلب خونِ امام حسین با وے بیعت می کردند"

حالانکہ حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی امامت کا عقیدہ رکھنے والے بھی شیعہ ہیں اور بعض نے بظاہر ان کو امام تسلیم کیا، لیکن حقیقت میں ان کو حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کا نمائندہ سمجھ کر ان کے لیے اطاعت کی بیعت کی۔"

بہرکیف ان کو شیعہ موالی تسلیم کرنا لازم ہے اور یہ بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مقامِ تعجب ہے کہ ۶۱ھ میں اگر کوفہ میں شیعہ تھے ہی نہیں تو ۶۵ھ تک صرف چار سال کے عرصہ میں اتنی کثیر تعداد کہاں سے پیدا ہو گئی؟ کیا جو لوگ رفاعہ بن شداد کے کہنے پر واپس ہوئے تھے کہ ہم قتل ہو گئے، تو یہ مذہب ختم ہو جائے گا۔ کیا انہوں نے چند مہینوں میں اس قدر نئی فوج کو جنم دے لیا تھا؟

۴۔ حضرت زید بن زین العابدین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر چالیس ہزار نے بیعت کی تھی اور میدانِ کارزار میں پہنچنے سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے برأت و بیزاری ظاہر کرنے کا مطالبہ کر دیا اور ان کے انکار پر ساڑھے انتالیس ہزار نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور جو پانچ صد بچ گئے تھے ان میں بھی شیعہ موجود تھے (مجالس المومنین ص ۲۵۴) تفصیل پہلے حصہ میں ذکر ہو چکی ہے ملاحظہ ہو ص ۳۵۷ تا ۳۶۴)

تو جب کوفہ میں شیعہ رہ ہی نہیں گئے تھے، تو چند سالوں میں ہزاروں کی یہ نفری کہاں سے پیدا ہوگئی، جو لڑنے کے قابل بھی ہوگئے تھے اور ظاہر ہے کہ سارے موالی صرف اتنے ہی تو نہیں تھے جو پیچھے رہ گئے ہوں گے، وہ ان سے بھی زیادہ ہوں گے اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ جو لوگ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے برأت ظاہر کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے، وہ کس طرح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پانچواں خلیفہ ماننے والے ہوسکتے تھے؟ اور یہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں شیعہ ہر دور میں کہاں سے آجاتے تھے؟

الغرض واضح ہوگیا کہ علامہ ڈھکو صاحب اور اس کے اسلاف نے کوفی شیعوں کی تعداد بیان کرنے میں سراسر غلط بیانی اور دروغ گوئی سے کام لیا ہے اور اس جوابِ ناصواب سے امام حسین رضی اللہ عنہ کے ناحق قتل سے شیعہ کی برأت قطعاً ثابت نہیں ہوسکتی۔

۴۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ شیعہ کا لفظ جن روایات میں آیا ہے وہ امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے والوں پر اطلاق کیا گیا ہے نہ کہ حقیقی شیعوں پر، جو خلافتِ بلافصل کے قائل تھے، بلکہ وہ تو ان کو چوتھا خلیفہ ماننے والے تھے الخ سچ ہے دروغ گو را حافظہ نباشد، علامہ موصوف نے رسالہ کے ص ۳۱ پر تصریح کی ہے کہ سُنّی اور اہل السنت والجماعت بنا ہے: سَنَةُ الْجَمَاعَةِ سے۔ جس کا مطلب ہے امیر معاویہ اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہما کی مصالحت اور اہل اسلام کے باہمی اجتماع و اتفاق کا سال، بس وہاں سے سُنّی اور اہل السنت بن گئے، لہٰذا مصالحت کے بعد بیس سال سے شیعہ اور سُنّی الگ الگ ہوچکے تھے، نہ مذہب میں اتحاد و اشتراک تھا اور نہ ہی نام میں اشتراک رہ گیا تھا تو پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھتے وقت مِنْ شِیْعَتِكَ وغیرہ لکھنے کا کیا مطلب ہوسکتا تھا۔

نیز جو سُنّی تھے، وہ تو اس مصالحت کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفق

ہوگئے اور ان کی حکومت و امارت کے معتقد ہوچکے تھے، تو وہ ان کی ذات پر لعن و طعن کیسے کر سکتے تھے، حالانکہ ہم خطوط میں ان کوفیوں کے خبیث کلمات ذکر کر چکے ہیں لہٰذا اب اس معنی کے لحاظ سے ان کو شیعہ کہنے کی توجیہ نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کا کوئی جواز ہوسکتا ہے۔

کیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سُنّی المذہب تھے یا شیعہ؟

یہ حقیقت تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہوچکی کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بار بار بلانے پر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تھے نہ کہ اپنے طور پر اور یہ بھی واضح ہوگیا جو لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پانچواں وارثِ مسندِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سمجھتے تھے اور یزید کو چھٹا، تو وہ ان کی حکومت و سلطنت کو متزلزل کرنے کے لیے امام حسین رضی اللہ عنہ کو دعوت کیسے دے سکتے تھے؟ نیز حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ صرف اس عقیدہ والوں کی دعوت پر کوفہ جانے کا پروگرام کیسے بنا سکتے تھے؟ جو مذہب و عقیدہ میں بھی مخالف اور سیاسی وابستگیوں اور وفاداریوں کے لحاظ سے بھی مخالف تھے، لہٰذا یقیناً اگر قابلِ اعتماد اور لائقِ اعتبار شیعہ نہیں تھے، تو اس اقدام کا قطعاً تصور آپ کی طرف سے نہیں کیا جاسکتا تھا اور اگر وہاں پر شیعہ حقیقی نہ ہونے کے باوجود صرف اہل السنت اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ رابع ماننے والوں کی دعوت پر آپ تشریف لے گئے تھے اور حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں پر اعتماد کرکے آپ کو خط لکھ دیا تھا، تو پھر یہ حقیقت بھی تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بھی سُنّی مذہب پر کاربند تھے، ورنہ سُنّیوں کی دعوت پر امامت و امارت سنبھالنے کے لیے آپ کے تشریف لے جانے کا تصور کس طرح کیا جاسکتا تھا، تو اس طرح شیعہ مذہب کا صفایا ہوجائے گا اور ائمہ کی طرف اس مذہب کی نسبت محض افترا اور بہتان سے زیادہ کیا حیثیت رکھے گی؟ کوفیوں کی بے وفائی اور عہد شکنی اپنی جگہ لائقِ ہزار نفرین ہے، لیکن مذہبِ امام میں شک و شبہ کی گنجائش

نہیں رہے گی اور شیعہ حضرات کے لیے یہ جواب بڑا ہی مہنگا ثابت ہو گیا کہ وہاں پر شیعہ تھے کہاں ؛ چہ جائیکہ ہزاروں کی تعداد میں ہوتے، کیونکہ اس طرح انہیں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو سُنی المذہب مانے بغیر چارہ نہیں رہے گا اور یہ بھی انہیں تسلیم ہے کہ تمام ائمہ کا مذہب و مسلک ایک ہے تو پھر تمام کو سُنی ماننا لازم ٹھہرے گا

ب ؛ علامہ صاحب نے فرمایا اگر ایک بھی ایسا فرد ثابت کر دیا جائے جو خلافتِ بلا فصل کا قائل تھا اور یزیدیوں کی طرف سے لڑ رہا تھا تو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ ہمیں ڈھکو صاحب کا انعام نہیں، ایمان درکار ہے، اس لیے ان کا مطالبہ پورا کرنا ہمارا کام ہے، ایمان لانا اُن کا کام اور توفیق دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ہاں تو اس ضمن میں درج ذیل امور پر غور فرمائیں ؛

۱۔ عبید اللہ بن زیاد کی طرف سے جتنا لشکر میدانِ کربلا میں بھیجا گیا تھا، وہ نہ شام سے آیا تھا اور نہ ہی بصرہ سے ابن زیاد اپنے ساتھ لایا تھا، بلکہ وہ صرف اور صرف کوفہ شہر کا ہی لشکر تھا، تو اگر حقیقی شیعے ان میں نہیں تھے، تو وہ کدھر تھے ؟ اور وہ کیا کر رہے تھے ؟ کیا وہ صرف نئے شیعوں کو جنم دینے میں مصروف تھے ؟ وہ ہزاروں افراد جنہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، کیا ان میں بھی کوئی حقیقی شیعہ تھا یا نہیں ؟ حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہوں نے کتنی وفاداری کی اور ایفائے عہد کیا ؟ اور کیا وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ حضرت امام کو کوفہ تشریف لانے کے لئے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ نے لکھ دیا ہے اور ان بدلے ہوئے حالات میں تشریف لائیں، تو انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، لہذا کتنے مخلص شیعہ نے حضرت امام کو روکنے کی کوشش کی یا ان کے تعاون کے لیے کوفہ سے باہر نکلے تھے ؟ اور ہزاروں کی تعداد میں خطوط بھیج کر اور بیسیوں قاصد روانہ کر کے بلائے ہوئے اس مہمانِ عزیز کی کیا امداد و اعانت کی ؟ علامہ صاحب ذرا آپ بھی تو دکھلائیں کہ پچیس ہزار اشخاص جنہوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت تسلیم کر لی تھی اور یزید کی امارت و حکومت کو ٹھکرا دیا تھا

ان میں کتنے حضرت امامِ مظلوم کی طرف سے لڑے تھے ؟ اور کیا جن لوگوں نے امیر معاویہ کو قومِ ثمود کے ساتھ ملا دیا تھا، وہ مخلص اور حقیقی شیعہ تھے یا نہیں ؟ اور اس مشکل وقت میں انہیں زمین نگل گئی تھی یا آسمان نے انہیں اُچک لیا تھا ؟

۲۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کے راستے میں فرزدق شاعر ملا جب آپ نے اہل کوفہ کا حال دریافت کیا، تو اس نے جواب دیا۔

دلہائے ایشاں با تست و شمشیر ہائے ایشاں با بنو امیہ آنچہ خدا خواہد آں کند و از قضائے حق چارہ نیست، فرمود کہ راست گفتی (جلاء العیون صـ ۳۷۱)

اُن کے دل تو تمہارے ساتھ ہیں، مگر تلواریں اُن کی بنو امیہ کے ساتھ ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، وہی کرتا ہے، اُس کی قضا کے سامنے کوئی چارہ نہیں (سوائے تسلیم و رضا کے) تو آپ نے فرمایا تو نے سچ کہا ہے۔

کیا یزید کو چھٹا خلیفہ ماننے والوں کے دل آپ کے ساتھ ہو سکتے تھے، وہ تو آپ کو باغی سمجھتے، لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یزید کو چھٹا خلیفہ برحق تسلیم کرنے کا اہل السنت پر افترا اور بہتان ہے اور یا فرزدق کے اس بیان اور حضرت امام کی تصدیق کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اہل کوفہ شیعہ تھے اور دل و جان سے محبِ اہلِ بیت تھے، مگر از روئے تقیہ اُوپر سے یزیدیوں کے ساتھ تھے اور ان مظلوموں کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگ رہے تھے اور دل ادھر راغب تھے اور ابطالِ ایمان و اظہارِ خلافِ ایمان کا پیکرِ مجسم تھے۔

۳۔ حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر حضرت امام نے فرمایا کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مسلم بن عقیل، ہانی اور عبد اللہ شہید کر دیئے گئے ہیں ؛ و شیعیانِ ما دست از یاری ما برداشتہ اند (جلاء العیون صـ ۳۷۵) اور ہمارے شیعوں نے ہماری امداد و اعانت سے ہاتھ اٹھا لئے ہیں۔ کیوں علامہ صاحب یہاں شیعیانِ ما کا لفظ عام نہیں ہے اور عقلائی قاعدہ یاد ہو گا کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوصیتِ مقام کا۔ تو اب اس عام میں شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کو کیوں داخل نہیں

کرتے ہو جن کو امامِ مظلوم بے وفا قرار دے رہے ہیں۔ یہ یزید کو ماننے والے تھے یا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو؟ کبھی دیانت داری کا مظاہرہ بھی تو کر دیا کرو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ابلیس لعین بھی کبھی سچ کہہ دیتا ہے اور آپ تو ماشاء اللہ مومن موالی ہونے کے مدّعی ہیں۔

۴۔ امامِ مظلوم نے میدانِ کربلا میں لشکرِ اعداء کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے چند جملے ملاحظہ فرما کر یہ فیصلہ دیں کہ وہ یزید کو امام ماننے والے تھے یا کہ خلافتِ بلا فصل کا عقیدہ رکھنے والے تھے۔

اے بیوفایانِ جفا کار غدار، مارا در ہنگامِ اضطرار بمدد ویاری خود طلبیدید چوں اجابتِ شما کردیم وبہدایت ونصرتِ شما آمدیم شمشیرِ کینہ بر روئے ما کشیدید و دشمنانِ خود را برما یاری کردید (جلاء العیون، مؤلفہ ملّا باقر مجلسی ص ۳۹۱)

یعنی اے بے وفا، جفا کار اور غدار اہلِ کوفہ! تم نے اپنی مجبوری کے وقت مدد واطاعت کے لیے ہمیں بلایا، جب ہم نے تمہاری دعوت قبول کر لی اور تمہاری ہدایت اور امداد واعانت کے لئے پہنچ گئے، تو تم نے بغض وکینہ کی تلوار ہمارے سامنے سونت لی اور ہمارے خلاف اپنے ہی اعداء کی امداد واعانت شروع کر دی۔

حضرت امام نے خطوط پڑھے تھے اور لکھنے والوں کو خوب پہچانتے تھے اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ لشکری غدار، عہد شکن اور بیوفا ہیں اور دھوکہ باز بلاکر امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے ہی دشمنوں کے امدادی بن گئے۔ کیا اہلِ کوفہ میں سے کوئی بھی خلافتِ بلا فصل کا قائل نہیں تھا اور نہ ہی اس کے قائل شریک عہد و پیمان تھے؟ ہماری سابقہ گزارشات کو پھر غور سے پڑھو، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کوفہ میں اس عقیدہ والے موجود تھے اور وہ شریکِ عہد بھی تھے اور اب امامِ مظلوم انہیں جانے پہچانے لوگوں کو جفا کار بیوفا اور غدار قرار دے رہے ہیں اور امام بہرحال سچے ہیں، تو پھر ڈھکو صاحب کے مکرنے اور چھپنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ علامہ صاحب ادھر یزیدیوں سے تقیہ اور ادھر ہم سے بھی تقیہ؟ کبھی تو دل کی بات زبان پر لایا بھی کرو۔

بلانے والوں میں خلافتِ بلا فصل کے قائل۔ عہد توڑنے والوں میں بھی خلافتِ بلا فصل کے قائل اور وہی اب تیغِ جفا سونت کر امامِ مظلوم کے مقابل بھی کھڑے ہیں، تو یہ سوال ہم سے کیوں کرتے ہو کہ کوئی ایک ہم میں سے وہاں پر موجود ثابت کرو۔ یہ سوال حضرتِ امام سے پوچھو کہ عہد کرنے والے خلافتِ بلا فصل کے قائل تو کوفہ میں بیٹھے۔ تمہاری امت بڑھانے اور مخلص شیعہ پیدا کرنے میں مصروف تھے، تم لشکرِ یزید کو عہد شکنی عہد شکنی اور غداری وبے وفائی کے طعنے کیوں دے رہے ہو۔ انہوں نے عہد کیا کب تھا؟

حضرت امام زین العابدین کا خطبہ، حضرت زینب کا خطبہ، حضرت ام کلثوم کا خطبہ، احتجاج طبرسی اور جلاء العیون میں مطالعہ کرو جو خطبات ان مظلومانِ دشتِ کرب وبلا نے کوفہ کے گلی کوچوں میں برسرِ عام فرمائے تھے، ان سب میں یہی عہد شکنی، بد عہدی، وعدہ خلافی، بے وفائی اور غداری کے الزامات ہیں اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے نقل کردہ خطبات میں بھی اور ان کے علاوہ دوسرے خطبات میں بھی شیعہ اور محبین ہی مخاطب ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ شیعہ بیچارے نہ عہد میں شامل، نہ عہد شکنی میں اور نہ غداری میں حصہ دار، تو خواہ مخواہ ان کو الزام کیوں دیئے گئے؟ اور پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت امام علیہ السلام نے خط لکھنے والوں کو نامزد کر کے فرمایا: اے لوگو! تم نے یہ خطوط نہیں لکھے تھے؟ تو کیا ان کو اپنا مخلص شیعہ سمجھ کر اُن کی دعوت قبول کی تھی یا یزید کا معتقد سمجھ کر۔ الغرض ڈھکو صاحب اگر سچے ہیں، تو جملہ اہل بیت کرام بمع امام حسین رضی اللہ عنہ کے اپنے اس اقدام کا اور پھر الزام اور طعن وتشنیع کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے اور اگر ان کا کوفہ تشریف لے جانے کا اقدام صحیح تھا اور اہلِ کوفہ پر یہ لعن وطعن صحیح تھا، تو پھر ڈھکو صاحب کا دعویٰ سراسر غلط ہے اور یہ مطالبہ بالکل بے جا اور ناروا۔ اور یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو چکی کہ جن شیعانِ علی وشیعانِ حسین نے آپ کو بُلایا تھا، انہوں نے ہی یزیدی لشکر میں شامل ہو کر یہ ظلم کیا اور انہوں نے ہی امام مسلم کو بے یار ومددگار چھوڑا اور انہوں نے ہی امامِ مظلوم رضی اللہ عنہ کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگے اور پردہ دارانِ عصمت مآب اور نونہالانِ گلستانِ مصطفوی کو خزاں رسیدہ کیا اور دشتِ کرب وکربلا میں خون کے آنسو رُلایا۔

امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسندِ رسول کس نے دی؟

۵۔ علامہ ڈھکو صاحب نے کہا قاتلانِ حسین وہ تھے جنہوں نے یزید کو چھوٹا خلیفہ بنایا اور اس کے باپ کو مسندِ رسول کا پانچواں خلیفہ تسلیم کیا، بلکہ حسین رضی اللہ عنہ تو سقیفہ کے دن ہی قتل ہو گئے تھے۔ آیئے واقعات اور حقائق کے آئینہ میں دیکھیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس نے دی؟ حقیقت یہ ہے کہ انہیں یہ مسندِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند، حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے جگر گوشہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نورِ نظر حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے سونپی تھی اور شیعانِ کوفہ کے حالات اور عادات و کردار دیکھ کر یعنی فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے اور اسلام کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کی سازشوں کو دیکھا اور سبائی شیطنت کو خونِ مسلم کی ارزانی پر تالیاں بجاتے اور گھی کے چراغ جلاتے دیکھا تو صلح کر لی اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غیبی فرمان کو سچ ثابت کر دکھایا: ان ابنی ھٰذا سید لعل اللہ ان یصلح بہٖ بین فئتین من المسلمین عظیمتین۔ میرا یہ بیٹا سردار اور عالی ہمت ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بدولت اہلِ اسلام کے دو گروہوں میں صلح کرا دے گا۔ نیز اپنے تجربات اور مشاہدات کے تحت بھی یہ قدم اٹھایا۔ اسی لیے فرمایا: اری واللہ ان معاویۃ خیر لی من ھٰؤلاء یزعمون انھم لی شیعۃ ابتغوا قتلی وانتھبوا ثقلی واخذوا مالی۔ (کتاب الاحتجاج، مطبع جدید ص۲۹)

بخدا میں دیکھتا ہوں کہ معاویہ میرے لئے ان لوگوں سے بہتر ہے جو دعویٰ کرتے ہیں میرے شیعہ ہونے کا اور انہوں نے میرے قتل کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے اور میرا سارا قیمتی سامان لوٹ لیا ہے ـــــ اسی احتجاج طبرسی ص۳۹۱ پر مرقوم ہے کہ آپ نے فرمایا انھم لا وفاء لھم ولا ذمۃ فی قول ولا فعل، یقولون ان قلوبھم معنا وان سیوفھم لمشھورۃ علینا۔ ان اہلِ کوفہ میں نہ وفا ہے اور

نہ عہد کا پاس، نہ قول میں نہ عمل میں۔ وہ زبانی دعوے کرتے ہیں کہ ان کے دل ہمارے ساتھ ہیں، حالانکہ ان کی تلواریں ہمارے خلاف اور ہم پر سونتی ہوئی ہیں۔ علامہ صاحب ہی بتلائیں کہ اس وقت بھی کوفہ میں کوئی خالص شیعہ تھا یا نہیں؟ اور عقیدۂ خلافت کا پابند کوئی فرد تھا یا نہیں؟ کیونکہ یہ تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیس سالہ دورِ حکومت اور شیعہ کے تہ تیغ ہو جانے کے بعد کا دور نہیں تھا، یہ تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد متصل دور کا معاملہ ہے۔

الغرض امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سونپی، تو رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرزند ارجمند نے، اور سونپنے پر مجبور کرنے والے وہ تھے جو محب و موالی تھے، تو کہیے قاتلانِ حسین کون ہوئے؟

ب۔ رہا یزید کو چھوٹا خلیفہ ماننے والا معاملہ۔ تو عملاً سب اہلِ کوفہ نے اس کو خلیفہ مانا ہوا تھا اور دل سے بھی نہیں مانتے تھے، تو بھی تلواریں اُن کی، اسی کی امارت وخلافت کو مستحکم کرنے کے لئے اہل بیت کرام کا خون پی رہی تھیں۔ رہے اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ تو جب تک اس کی اصلی کیفیت و حالت سامنے نہیں آئی تھی، خاموش تھے اور جب حقیقت منکشف ہو گئی، تو پھر جان و مال، عزت و آبرو قربان کر دی، مگر اس کی اطاعت قبول نہ کی اور اس سکوت میں جملہ بنو ہاشم، بنو عبد المطلب اور بنو عبد مناف سب ہی برابر کے شریک تھے، حتیٰ کہ حضرت محمد بن حنفیہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس بھی حضرت امام علیہ السلام کو اہلِ کوفہ کی بیوفائی اور غداری کے تحت منع کرتے رہے۔ الغرض اہلِ مدینہ کی بغاوت اور اہل مکہ کے عمل و کردار کے معلوم ہونے کے باوجود حضرات اہلِ سنت کو الزام دینا انصاف سے بہت بعید ہے، بلکہ سراسر ظلم ہے اور ابھی شیعہ کتب کی رُو سے یزید اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا باہمی معاملہ بھی عرض کیا جائے گا، جس سے مہر نیم روز کی طرح واضح ہو جائے گا کہ نگاہِ حسین علیہ السلام میں یزید اسی طرح اہلِ کوفہ سے بہتر تھا، جس طرح نگاہِ حسن علیہ السلام میں امیر معاویہ ان سے بہتر تھے۔

ج : نیز علامہ صاحب کا یہ کہنا کہ حسین (رضی اللہ عنہ) تو سقیفہ کے دن قتل ہو گئے تھے، کسی اچھی قابلیت کا مظاہرہ نہیں ہے، بلکہ صحیح دعویٰ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ جس دن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت کا دعویٰ کیا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابرینِ اہلِ بیت بس اسی روز شہید ہو گئے تھے، نعوذ باللہ من ذالک۔

۲۔ اگر سبب بعید دیکھیں، تو دعوائے رسالت ہے، اور اگر سبب قریب دیکھیں، تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی دستبرداری ہے اور خلافت کو امیر معاویہ کے سپرد کرنا تو یہ کہاں کا انصاف ہو گا کہ اول و آخر کو چھوڑ کر درمیان والوں پر یہ ذمہ داری ڈال دی جائے۔

۳۔ سقیفہ والوں نے تو محدود سلطنت لی، جس میں وصالِ مصطفوی سے سے تزلزل آچکا تھا اور ڈانواں ڈول ہو چکی تھی، پھر اس کو مضبوط و مستحکم کیا اور وسیع و عریض ملک بنایا، پھر اہل بیت کے حوالے کر دیا، وہ قاتل کیسے ہو گئے؟ یہ تو امام حسن رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی کہ اسے اپنے بھائی کے حوالے کرتے، اور امیر معاویہ کو اس مسندِ رسول اور مسندِ مرتضٰی کے قریب نہ پھٹکنے دیتے اور نہ ہی پھر یزید اس پر قابض ہو سکتا۔

۴۔ علاوہ ازیں اس کی ضمانت کیا ہے کہ اگر خلافتِ بلافصل حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کو مل جاتی، تو پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ شہید نہ ہوتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال والا خلیفہ، دورانِ خلافت شہید کر دیا گیا۔ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو کس طرح بے دردی کے ساتھ دورانِ خلافت شہید کر دیا گیا۔ حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کو بھی دورانِ خلافت ہی شہید کر دیا گیا، اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اس کو ترک کرنے میں عافیت سمجھی، لہٰذا خلافت کو جان بچانے کا حصن حصین سمجھ لینا کسی عقلمندی اور دانائی کا مظاہرہ نہیں ہے۔

۵۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں یہ بحث ہی فضول ہے۔ امام مظلوم کو شہید کرنے کے بعد وہ کافر ہو گئے تھے اور قبل ازیں اسی کے دین پر تھے جس کی حکومت کو محفوظ کر رہے تھے، حالانکہ یہ بحث فضول نہیں، بلکہ بڑی اہم بحث ہے اور دُور رس نتائج و عواقب کی حامل ہے، کیونکہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو دعوت دینے والے اہلِ کوفہ ہی تھے اور لکھتے بھی یہی تھے کہ ہم آپ کے شیعہ اور آپ کے والدِ گرامی کے شیعہ ہیں اور بُلاتے ہوتے مہمان کی تواضع کبھی تیروں، نیزوں اور تلواروں کے ساتھ کرتے ہیں اور امام عالی مقام فرزدق کے قول کی بھی تصدیق فرماتے ہیں کہ دل ان کے ہمارے ساتھ ہیں، اگرچہ تلواریں ان کی ہمارے خلاف ہیں اور یہ لشکری دوسرے علاقہ سے بھی نہیں بلائے گئے تھے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ انہیں بالعموم بھی اور بالخصوص بھی عہد و پیمان یاد دلا رہے تھے، تو یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ پہلے یزید کے مذہب پر تھے۔ اگر وہاں شیعے نہیں تھے تو امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزیدیوں کی دعوت کیسے قبول کر لی؟ کیا وہ اسی کوفہ میں والدِ گرامی کے ساتھ نہیں رہتے تھے، وہاں کے لوگوں سے واقف نہیں تھے؟ اور جب سلیمان بن صرد اور مختار ثقفی نے کربلا کے ظلم و استبداد کا بدلہ لینے کی ٹھانی، تو پھر ہزاروں شیعے کہاں سے نکل آئے؟ لہٰذا یہ تو تسلیم کرنا لازم ہے کہ وہاں شیعے تھے اور انہوں نے یزید کی نہیں، امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی، لیکن جب اس خلافت و امامت کی حفاظت کا وقت آیا اور حسبِ وعدہ یزید کے عامل کو کان پکڑ کر کوفے سے نکال لینے کا تو پھر اُن کا اتا پتہ ہی نہیں چلتا، تو آخر اس شدید ضرورت کے وقت وہ خاموش کیوں ہو گئے بلکہ دشمن کے ساتھ کیوں مل گئے؟ ان کا آپ کو بلانے کا مقصد کیا تھا؟ اور پھر غداری اور بدعہدی کا باعث کیا تھا؟ جب ان امور پر صحیح معنوں میں غور و فکر کیا جائے گا۔ تبھی یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ یہاں پر دراصل سبائی ذہن اور یہودی و مجوسی سازشیں کارفرما تھیں کہ عالمِ اسلام میں امن و سکون نہیں ہونا چاہیے اور انہیں باہم دست و گریباں کیا جائے اور الجھائے رکھو تاکہ فتوحات کا سیلاب رُکا رہے اور عالم کفر و شرک

اور یہودیت و نصرانیت سکھ کا سانس لے سکے ۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کروا کر جنگ جمل و صفین کے لئے فضا سازگار کردی اور ہزاروں صحابہ کرام شہید ہوگئے اور اب اہل بیت کرام سے بدلہ لینے کے لئے محب و موالی بن کر اور شیعہ خیر البریہ بن کر بلا لیا اور پھر بے یار و مددگار چھوڑ کر ان پر قیامتِ صغریٰ قائم کرادی تاکہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب اور اہل بیت میں سے کوئی بھی انتقامی کارروائی سے نہ بچ سکے اور قیصر و کسریٰ اور خیبر و فلسطین کے فتح کرنے والوں سے اس طرح بدلہ لے لیا جائے ۔ اللھم انا نجعلك فی نحورھم ونعوذ بك من شرورھم

اس گہری سازش کو سمجھنے کے لئے عبداللہ بن سبا کی سازش اور خفیہ تدابیر پر غور کرو، تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے ۔

یزید اور امام حسین رضی اللہ عنہ کا باہمی معاملہ از روئے کتب شیعہ

علامہ ڈھکو صاحب بار بار چھٹے خلیفہ کا راگ الاپ رہے ہیں، تو ہم ان کی مذہبی معتبر کتب کے آئینہ میں انہیں یزید کا اصل چہرہ بھی دکھلا دیتے ہیں اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا اس کے متعلق حسنِ ظن اور مظلومانِ کوفہ و کربلا کے ساتھ اس کا سلوک، تاکہ علامہ موصوف کا بخار اُتر جائے یا اعتدال پر آجائے ۔ شیخ مفید نے کتاب الارشاد میں ذکر کیا ہے کہ عمر بن سعد کے ساتھ آپ کا یہ معاہدہ ہوا تھا :

۱ ۔ اما بعد فان اللہ قد اطفأ النائرۃ وجمع الکلمۃ واصلح امر الامۃ ھذا حسین قد اعطانی عھدا ان یرجع الی المکان الذی ھو منه اتی او یسیر الی ثغر من الثغور فیکون رجلا من المسلمین له ما لھم وعلیه ما علیھم او یاتی امیر المومنین فیضع یدہ فی یدہ فیری فیما بینه وبینه وفی ھذا لك رضیً وللامۃ صلاح ۔ ارشاد مفید مع ترجمہ فارسی ج۲ ص۹

بے شک اللہ تعالیٰ نے جنگ کی آگ بجھا دی ہے اور اہلِ اسلام میں اجتماع و اتفاق

قائم کر دیا ہے ۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے میرے ساتھ عہد کیا ہے کہ وہ یا تو اس مکان کی طرف چلے جاتے ہیں جہاں سے وہ آئے ہیں یا ملک اسلام کی سرحدات میں سے کسی سرحد پر چلے جاتے ہیں، اور غازیانِ اسلام میں سے ایک غازی کی طرح ہوں گے جو منفعت کسی غازی کو حاصل ہوگی ان کو بھی حاصل ہوگی اور جو فریضہ اور ذمہ داری اُن پر عائد ہوگی وہی اُن پر عائد ہوگی یا امیر المومنین یزید کے پاس جا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیں گے اور وہ اپنی رائے کے مطابق اس باہمی معاملہ میں فیصلہ کرے گا اس میں تیرے لیے بھی رضا مندی کی صورت ہے اور اُمت کی بھلائی اور بہتری بھی ہے ۔

لیکن ابن زیاد کی ہٹ دھرمی سے یہ معاہدہ اپنے مطلوبہ نتائج مہیا نہ کر سکا ۔

۲ ۔ شیخ مفید جیسے شیعہ کے عظیم عالم اور محدث و متکلم کے بعد اب شیخ الطائفہ اور عظیم محدث و متکلم ابو جعفر طوسی کی بھی سنیں ۔

قد روی انه علیه السلام قال لعمر بن سعد اختاروا منی اما الرجوع الی المکان الذی اقبلت منه او ان اضع یدی علی ید یزید فھو ابن عمی لیری فی رأیه واما ان تسیروا بی الی ثغر من ثغور المسلمین فاکون رجلا من اھله ولی ماله وعلی ما علیه وان عمر کتب الی ابن زیاد بما سأل فابی علیه (تلخیص الشافی ص۴۷۱) ترجمہ وہی ہے جو پہلے ذکر ہو چکا، البتہ یہ جملہ اس میں زائد بھی ہے اور خصوصی توجہ کا طالب بھی کہ یزید میرا چچا زاد بھائی ہے، میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہوں اور وہ میرے متعلق جو فیصلہ کرے، اسے حق ہوگا ۔ طوسی صاحب نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہا : لعلمه علیه السلام بانه علی ما به ارءف به من ابن زیاد واصحابه ۔ کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ وہ جس حال میں ہے اس کے باوجود وہ ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں کی نسبت زیادہ رأفت اور رحمت سے پیش آئے گا اور بعینہ یہی عبارت اور مضمون شیعہ کے عظیم تر محدث سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے تنزیہ الانبیاء میں ص۱۷۷ پر ذکر کیا ہے اور اس میں بھی او ان اضع

یدی فی ید یزید فھو ابن عمی لیرٰی فی رأیہ موجود ہے اور یہ تصریح بھی موجود ہے: ولما رأی ان لا سبیل لہٗ الی العود ولا الی دخول کوفۃ فسلک طریق الشام سائرًا نحو یزید بن معاویۃ اللعین لعلمہ علیہ السلام بانہ علی ما بہ ارءف من ابن زیاد لعنہ اللہ واصحابہ الخ صـ۱۷۱)

یعنی جب آپ نے دیکھ لیا کہ نہ واپسی کی کوئی صورت ہے اور نہ کوفہ میں داخل ہونے کی تو آپ شام کے راستہ پر یزید بن معاویہ کی طرف چل پڑے، کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ وہ جیسا بھی ہے ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں کی نسبت میرے ساتھ بہت نرمی اور ہمدردی سے پیش آئے گا، لیکن کوفی لشکر مانع آگیا اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

اقول: اور اس رکاوٹ میں بڑا حصہ ان لوگوں کا معلوم ہوتا ہے جن کے ناموں کا آپ نے برسرِ میدان اعلان فرما دیا تھا۔ آپ نے فرمایا: اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن الاشعث، اے یزید بن الحارث! کیا تم نے خط نہیں لکھا تھا کہ آپ آئیں گے، تو اپنے معاون و مددگار اور سرفروش اور جاں نثار لشکر کو موجود پائیں گے۔ الم تکتبوا الیّ (الی) وانما تقدم علی جند لک مجند۔ (ارشاد مفید، صـ۱۰۱)

سید مرتضیٰ نے کوفہ کی طرف امام حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی اور ان کی دعوت کی قبولیت کا جواز پیش کرتے ہوئے اور [illegible] کو اور اپنے عزیزوں کی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کے توہم کا ازالہ کرتے ہوئے کہا:

سیدنا ابو عبد اللہ علیہ السلام لم یسر طالبا للکوفۃ الا بعد توثق من القوم وعھود وعقود وبعد ان کاتبوہ علیہ السلام طائعین غیر مکرھین ومبتدئین غیر مجیبین وقد کانت المکاتبۃ من وجوہ اھل الکوفۃ واشرافھا وقرائھا تقدمت الیہ فی ایام معاویۃ وبعد الصلح الواقع بینہ وبین الحسن علیہ السلام فدفعھم وقال فی الجواب ما وجب ثم کاتبوہ

بعد وفات الحسن علیہ السلام ومعاویۃ باقٍ فوعدھم ومناھم وکانت ایاما صعبۃ لا یستطیع فی مثلھا فلما مضی معاویۃ اعادوا المکاتبۃ وبذلوا الطاعۃ وکرروا الطلب والرغبۃ ورأی من قوتھم علی من کان یلیھم فی الحال من قبل یزید اللعین وتشحنھم علیہ وضعفہ عنھم ما قوی فی ظنہ ان المسیر ھو الواجب تعین علیہ ما فعلہ من الاجتھاد والتسبب ولم یکن فی حسبانہ ان القوم یغدر ویضعف اھل الحق عن نصرتہ (الی) ولو کان فعل مسلم بن عقیل بابن زیاد ما تمکن منہ ووافقہ شریک علیہ لبطل الامر ودخل الحسین علیہ السلام الکوفۃ غیر مدافع عنھا وحسر کل احد قناعہ فی نصرتہ واجتمع لہ من کان فی قلبہ نصرتہ وظاھرہ مع اعدائہ۔ (تنزیہ الانبیاء صـ۱۷۵، ۱۷۶)

خلاصہ مفہوم یہ کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے جب تک عہد و پیمان کے ذریعے وثوق حاصل نہ کر لیا اور جب تک انہوں نے اپنے طور پر اپنی خوشی و رضا سے خط و کتابت کا آغاز نہ کیا۔ آپ نے کوفہ کی طرف روانگی اختیار نہ فرمائی اور کوفہ کے رؤسا اور اشراف اور علماء و قراء کی طرف سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ امارت میں بھی خط و کتابت کی گئی تھی، جبکہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی صلح ہو گئی تھی، لیکن آپ نے ان کو ٹال دیا تھا، پھر جب امام حسن رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تب بھی انہوں نے دوبارہ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا، تو آپ نے ان سے وعدہ کیا اور انہیں امید دلائی، لیکن وہ دن ایسی کارروائی کے لیے سازگار نہ تھے۔ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو تیسری مرتبہ پھر اہل کوفہ نے خط و کتابت کی اور اپنی رغبت و خواہش کا اظہار کیا اور طاعت و فرمانبرداری کا عہد کیا اور آپ نے بھی ان میں یزید کے اس وقت کے عامل کی مخالفت اور برطرفی پر قدرت اور اس کے جوابی کارروائی سے عجز اور بے بسی کا

اندازہ لگا لیا تو سمجھ لیا کہ اب کوفہ کی طرف جانا لازم ہے، چنانچہ آپ نے اس معاملہ میں ضروری سعی اور کوشش فرمائی اور آپ کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کوفی قوم میں سے بعض بدعہدی کریں گے اور اہلِ حق ان کی امداد و نصرت سے عاجز و قاصر رہیں گے اور ایسے واقعات ہائلہ پیش آجائیں گے۔ کیونکہ جب مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کوفہ میں داخل ہوئے تھے: اخذ البیعۃ علی اکثر اھلھا۔ تو انہوں نے اہلِ کوفہ کی اکثریت سے بیعت لے لی تھی (اور ایک وقت ایسا بھی میسر آیا تھا کہ ابن زیاد کو حضرت مسلم ٹھکانے بھی لگا سکتے تھے، جبکہ وہ شریک بن الاعور کی عیادت کے لئے ہانی بن عروہ کے گھر آیا تھا، جس میں شریک موجود تھا اور وہ مسلم بن عقیل کے ساتھ اس کے قتل میں متفق بھی تھا، لیکن آپ نے ایسا نہ کیا اور موقعہ ہاتھ سے نکل گیا) ورنہ ابن زیاد کے ختم ہوجانے پر یزیدی تسلط کوفہ پر سے ختم ہوجاتا اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بغیر کسی مدافعت کے کوفہ میں داخل ہوجاتے اور ہر ایک آپ کی امداد و نصرت کے لئے اپنے اوپر سے (تقیہ) کے پردے ہٹا دیتا اور وہ سبھی لوگ آپ کے گرد جمع ہوجاتے، جن کے دل میں آپ کی امداد و اعانت کا جذبہ موجود تھا اور بظاہر اعداء کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

الغرض اہلِ تشیع کے اس عظیم عالم کے اس قول سے یہ واضح ہوگیا کہ اہلِ کوفہ میں اہلِ حق موجود تھے، جو امامِ مظلوم کی امداد و اعانت سے عاجز رہے اور اگر ابن زیاد قتل ہوجاتا، تو پھر وہ تقیہ کے پردے سے باہر آتے اور قلبی جذباتِ نصرت کا عملی مظاہرہ کرتے اور ارشادِ مفید کی عبارت سے ان اہلِ حق کا لشکرِ اعداء میں موجود ہونا ثابت ہوچکا اور جب امامِ مظلوم نے ان کے رازِ درونِ پردہ کو برسرِ محفل فاش کردیا اور ان کی اصلیت ظاہر کردی، تو وہ امام کو کیسے معاف کرسکتے، لہٰذا پہلے امام سے محبت کا مظاہرہ کرلیا اور اب انا معکم انما نحن مستھزءون کا مظاہرہ کرتے ہوئے یزیدیوں کو خوش کرنے میں مقدور بھر سعی نامشکور فرمائی اور ان معصوموں کے خونِ ناحق سے ہولی کھیلی۔

فائدہ: علامہ ڈھکو صاحب ذرا بتلانا یہ اہلِ حق کون تھے اہل السنت یا خالص

شیعانِ علی و شیعانِ حسین اور تقیہ کے پردوں میں چھپے ہوئے لوگ کون تھے اہل السنت یا اہلِ تشیع۔ کوئی خلافتِ بلافصل کا قائل لشکرِ اعداء میں نظر آیا یا نہیں آیا۔ مزید نام معلوم کرنے ہوں تو مجالس المومنین جلد دوم اور ص۲۴۱ کا مطالعہ کریں۔

ہاں تو امامِ مظلوم نے حالات کا رخ بدلا دیکھا تو یزید کے پاس جاکر بیعت کرلینے کا ارادہ فرمایا اور اس طرف چل بھی پڑے اس امید پر کہ وہ میرے ساتھ حسنِ سلوک سے کام لے گا لیکن محبوں نے غیرت اور محبت کے تحت اپنے محبوب کو اس دشمن کی طرف جانے سے ہرقیمت پر روکنے کی ٹھان لی اور جو ہوا سو ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تو اب یزید کا طرزِ عمل دیکھیں اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے حسنِ ظن کی واقعیت کا عملی اور قولی نمونہ دیکھیں:

۳۔ لما اراد ان یجھزھم دعیٰ علی بن الحسین فاستخلیٰ بہ ثم قال لعن اللہ ابن مرجانۃ اما واللہ لو انی صاحب ابیک ما سألنی خصلۃ الا اعطیتہ ایاھا ولدفعت عنہ الحتف بکل ما استطعت ولکن اللہ قضیٰ ما رءیت وانہ الیّ کل حاجۃ تکون لک۔ (ارشاد مفید جلد ثانی مع ترجمہ فارسی ص۱۲۶)

یعنی یزید نے جب اہل بیت کرام کے افراد کو مدینہ منورہ واپس بھیجنے کا ارادہ کیا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خلوت میں طلب کیا، پھر کہا اللہ تعالیٰ ابن مرجانہ پر لعنت کرے غور سے سنیے اگر بخدا میں اس وقت تمہارے باپ کے پاس موجود ہوتا، تو وہ جس طرح کے معاملہ اور سلوک کا مجھ سے مطالبہ کرتے، میں ان کا وہ مطالبہ پورا کرتا اور مقدور بھر کوشش کرکے موت کو ان سے دور رکھتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر اس طرح تھی۔ تمہیں جس طرح کی بھی ضرورت اور حاجت پیش آئے، تو وہ مجھ تک پہنچانا، میں اس کو پورا کرنے کا پابند ہوں گا۔)

علامہ صاحب ذرا بتلایئے گا یہ جنابِ والا کی مذہبی معتبر ترین کتابیں اور عظیم محدثین و متکلمین کی تالیفات کیا کہتی ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں یزید کیسا تھا؟ چھٹا خلیفہ ہونے کے لائق تھا یا نہیں؟ اگر شیعہ حضرات انہیں مہلت دیتے، تو وہ لازمی طور

کئی مقامات پر اسی جواب کے ذریعے گلو خلاصی کرانے کی کوشش کی ہے۔

ائمہ کرام کی دُنیا میں شیعہ سے بیزاری

۷۔ علامہ موصوف تو قیامت کے دن ائمہ کرام کا اظہارِ برأت و بیزاری تسلیم کرنے کو تیار نہیں، مگر ہم اسی دنیا میں شیعانِ امیر سے حضرت امیر المومنین علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کی بیزاری اور برأت کا اظہار ثابت کر دیتے ہیں۔

ا۔ اللّٰھمّ انی قد مللتھم وسئمتھم وسئمونی فابدلنی بھم خیرًا منھم وابدلھم بی شرًا منھم۔ اللّٰھمّ مث قلوبھم کما یماث الملح فی الماء۔ (نہج البلاغۃ مصری جلد اوّل ص۵۷)

اے اللہ! میں اُن سے ملول اور تنگ دل ہوں اور وہ مجھ سے تنگدل ہیں۔ پس مجھے اُن کے بدلے اچھے رفقاء عطا فرما اور انہیں میری جگہ بدتر حاکموں کے تصرّف میں دے۔ اے اللہ اُن کے قلوب کو اس طرح گلا دے، جس طرح نمک پانی میں گل جاتا ہے۔

ب۔ لوددت انی لم ارکم ولم اعرفکم، معرفۃ واللہ جرّت ندمًا واعقبت سدمًا، قاتلکم اللہ لقد ملأتم قلبی قیحًا وشحنتم صدری غیظًا۔ (نہج البلاغۃ جلد اول ص۸۱)

میری دلی خواہش ہے کہ میں نے تمہیں نہ دیکھا ہوتا اور نہ ہی مجھے تمہاری معرفت اور شناسائی ہوتی، کیونکہ یہ وہ معرفت اور شناسائی ہے، جو موجبِ ندامت ہے اور حیرانگی و سراسیمگی کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہلاک کرے، تم نے میرے دل کو داغ دار کر دیا ہے اور بگڑے زخموں والا اور میرے سینے کو غیظ و غضب سے بھر دیا ہے۔

ج۔ ارید ان اداوی بکم وانتم دائی۔ (نہج البلاغہ ص۲۸۶)

میں تمہارے ساتھ دوسروں کی دوا کرنا چاہتا ہوں، جبکہ تم خود میری بیماری اور سوہانِ رُوح بن چکے ہو۔

د۔ المغرور واللہ من غررتموہ (الیٰ) اصبحت واللہ لا

اصدق قولکم ولا اطمع فی نصرکم (نہج البلاغہ ص۸۷)

بخدا حقیقت میں دھوکہ اور فریب کا شکار وہی ہے، جو تمہارے دامِ فریب میں آ گیا۔ میں خدا کی قسم اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہ تمہاری کسی بات کو سچا مانتا ہوں اور نہ ہی تم سے امداد و نصرت کی امید رکھتا ہوں۔

ھ۔ لبئس حشاش نار الحرب انتم، اف لکم، لقد لقیت منکم برحًا فلا احرار صدق عند النداء ولا اخوان ثقۃ عند النجاء۔ (نہج البلاغہ، ج ۱، ص۲۹۶)

تم بہت ہی بُرے جنگ کی آگ بھڑکانے والے ہو، تمہارے لیے افسوس ہے، میں نے تم سے بہت دُکھ اٹھائے اور ظاہر چوٹ کھائی ہے۔ تم نہ لڑائی کے لیے بلانے پر مردانِ حُر کا کردار ادا کرتے ہو اور نہ مشورہ اور رازداری میں اعتماد پر پورے اُترتے ہو۔

و۔ اور کوفہ کے متعلق بھی آپ کا ارشادِ گرامی سُن لیں: ماھی الا الکوفۃ اقبضھا وابسطھا، ان لم تکونی الا انت تھب اعاصیرک فقبحک اللہ۔ (ص۴۷، نہج البلاغہ)

میرے مِلک اور تصرّف میں صرف کوفہ شہر ہے، اس کو لپیٹوں یا پھیلاؤں اور اگر اے کوفہ صرف تو نے ہی میرے مِلک میں ہونا ہے، جس میں فتنوں اور شورشوں کے گرد باد اور آندھیاں اُٹھ رہی ہیں، تو اللہ تیرا بُرا کرے اور تجھے بدصورت کرے۔

فرمایئے علامہ صاحب جب امیر المومنین اسی دنیا میں شیعانِ باوفا کے چہرے دیکھنا گوارا نہ کریں۔ ان کو سچّا نہ سمجھیں، ان کو دیانت و امانت سے خالی قرار دیں۔ فریب کار اور دھوکہ باز کہیں وغیرہ وغیرہ، تو فرمایئے قیامت کے دن یہی نظریہ اور عندیہ ظاہر فرمائیں گے اور حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی کوفہ میں ان سے بیزاری و برأت اور شیخین کا گلہ کرنے والوں سے بیزاری اور انہیں اپنے دَر سے اُٹھا دینا اور امام محمد باقر کا ابوبکر (رضی اللہ عنہما) کو صدیق نہ ماننے والوں کو دُنیا و آخرت میں سچّا نہ کیا جانا کہہ کر ان سے بیزاری کا اظہار معروض خدمت ہو چکا تو کیا یہ حضرات قیامت

میں بھی یہی عندیہ و نظریہ ظاہر نہیں فرمائیں گے ؟ اور جب یقیناً یہ نظریہ ظاہر فرماویں گے تو قمی کے حوالے سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی بیان کردہ روایت کی واقعیت اور حقانیت واضح ہو گئی۔

اہلِ تشیع دورِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں کہاں تھے؟

علامہ صاحب! یہ ارشادات تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اپنی زبانِ اقدس سے نکلے ہوئے ہیں۔ ان کے جواب میں تو نہیں کہہ سکتے کہ شیعہ اس وقت تھے کہاں؟ کیونکہ یہ کوفہ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اور زیاد کی گورنری کا دور نہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا گیا کہ انہوں نے ہر شجر و مدر کے پیچھے چھپے شیعہ کو قتل کر دیا تھا۔ اب تو ہم نے آپ کو شیعہ کا دورِ عروج و ارتقاء دکھلا دیا ہے اور خلیفہ بلا فصل کا اپنے ان پروانوں کے متعلق ردِ عمل۔ فرمایئے اس وقت ان لوگوں میں بھی کوئی خلافت بلا فصل کا قائل حقیقی اور اصلی شیعہ موجود تھا یا نہیں؟ کیا اس وقت بھی کوفہ میں صرف وہی لوگ تھے جو آپ کو صرف چوتھا خلیفہ مانتے تھے اور پانچویں چھٹی جگہ امیر معاویہ اور یزید پلید کو مسندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث سمجھتے تھے یا امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو اگر یہاں بھی جواب نفی میں ہی ہے، تو پھر اتنا بتاؤ کہ جہان میں کہیں تمہارا وجود اس وقت تھا بھی یا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بلکہ حجازِ مقدس تو ویسے ہی آپ سے مقدس تھے اور شام و دیگر مقبوضاتِ امیر معاویہ میں بھی تمہارا وجود نہیں تھا اور کوفہ میں بھی اس وقت موجود نہیں تھے، تو آخر تمہارا مسکن تھا کہاں پر؟ بالائے آسمان یا تحت الثریٰ؟ علامہ صاحب جنہیں تم نے یا مولوی اسماعیل صاحب گوجروی نے شیعہ بنایا، وہ تو نہ بدل سکے، مگر جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن (شیعہ) بنایا، وہ سبھی بدل گئے اور سُنّی بن گئے اور اصلی مومن (شیعہ) کہیں ڈھونڈے سے مِل ہی نہیں رہا، آخر یہ کیا معاملہ ہے اور یہ کیسی سوچ اور فکر ہے۔ لہٰذا بقائمی ہوش و حواس یہ عذر یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا کہ کوفہ میں

دورِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں شیعہ تھے کہاں؟ لہٰذا جب ثابت ہو گیا کہ دُنیا ہی میں ابو الائمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات نے ان سے برآت اور بیزاری کا اظہار کیا ہے، تو قیامت کے دن ضرور بالضرور برآت کا اعلان کریں گے تاکہ ان کی حسرتوں اور ارمانوں میں اضافہ ہو اور ان کی برسرِ محشر تذلیل اور رسوائی کا سامان ہو اور اُن کی جھوٹی اُمیدوں اور آرزوں پر پانی پھیرا جاسکے اور ان کی مکاریوں اور تقیہ بازیوں کا بدلہ دیا جاسکے۔

کیا ائمہ کرام کے خلاف کوئی کافر بھی لب کشائی نہیں کرسکتا؟

علامہ ڈھکو صاحب نے فرمایا: ائمہ دو قسم کے ہیں ائمۂ ہدیٰ اور ائمۂ ضلالت، اور خدا تعالیٰ کے فضل سے ہمارے ائمہ کے حق میں کوئی کافر بھی لب کشائی نہیں کرسکتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اہلِ تشیع نے من حیث المجموع ائمہ کرام کو ائمہ ہدیٰ ہی نہیں رہنے دیا اسی لیے وہ جو کچھ برسرِ منبر اور مسجدوں میں برسرِ محفل فرماتے تھے اور لوگ ان کا جو مقصد و مطلب سمجھتے شیعہ صاحبان اس کو تقیہ پر مبنی اقوال قرار دیتے ہیں اور تقیہ نام ہے ابطالِ ایمان اور اظہارِ خلافِ ایمان کا تو اس طرح انہوں نے ان کو خلافِ ایمان ظاہر کرنے والے قرار دے کر ائمہ ضلالت بنا دیا، تو اس سے بڑھ کر اجماعی گالی تمام شیعہ کی طرف سے تمام ائمہ کے حق میں کوئی ہو سکتی ہے؟ العیاذ باللہ منہ۔

نیز کاملیہ فرقہ کے متعلق عرض کیا جا چکا کہ انہوں نے خلافت کا دعویٰ نہ کرنے کی وجہ سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دیا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو مصالحت کرنے کے جرم میں سفیان بن ابی لیلیٰ نے مذل المؤمنین، مومنین کو ذلیل کرنے والے کہا۔ (رجال کشی ص۱۰۳) بعض نے ان کے اس اقدام پر ملامت کی فلامہ بعضہم علیٰ بیعتہ۔ (احتجاج طبرسی طبع جدید ص۲۸۹) ابو بصیر لیث مرادی کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اندر آنے کی اجازت نہ دی، تو اُس نے کہا: لوکان معنا طبق لاذن (تنقیح جلد ثانی / رجال کشی ص—) "اگر

ہمارے پاس نذرانے کے لیے طبق ہوتا، تو ضرور اجازت مل جاتی" اور واقفیہ شیعہ نے حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے بعد والے حضرات کی اور بعض نے خود حضرت موسیٰ کاظم کی امامت کا ہی انکار کر دیا جو واقفیہ کہلاتے ہیں اور ناؤوسیہ بھی۔

نیز شیعہ واقفیہ کا ایک گروہ بشیریہ کہلاتا ہے، جنہوں نے ائمہ کرام کے متعلق یہ گوہر افشانی کی ہے ؛ زعموا ان علی بن موسیٰ وکل من ادعی الامامۃ من ولدہ وولد موسیٰ مبطلون کاذبون غیر طیبی الولادۃ فنفوھم عن انسابھم وکفروھم لدعواھم الامامۃ الخ رجال کشی ص۴۰۶ وکذا فی تنقیح المقال للمامقانی جلد ۲ ص۸۸ ان کا زعم اور نظریۂ فاسدہ یہ ہے کہ حضرت امام علی رضا اور اُن کی اولاد میں سے جنہوں نے امامت کا دعویٰ کیا یا حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد سے جو امامت کے مدعی بنے، وہ سب باطل پرست، کاذب اور ناپاک ولادت والے ہیں ؛ چنانچہ انہوں نے ان حضرات کے صحیح النسب ہونے کا انکار کیا اور انہیں کافر بھی قرار دیا بسبب ان کے دعوائے امامت کے۔

اور حضرت امام ابوجعفر ثانی محمد بن علی رضا رضی اللہ عنہ تو ایسے مظلوم ہیں کہ ان کے چچوں اور امام رضا کے بھائیوں نے ان کے صحیح النسب ہونے کا انکار کر دیا اور دلیل یہ دی: ماکان فینا امام حائل اللون قط (ہم میں کوئی سیاہ فام نہیں ہوا جبکہ یہ سیاہ فام ہیں) فقال لھم الرضا ھو ابنی الخ امام رضا نے فرمایا یہ میرا بیٹا ہے اور منصبِ امامت کا وارث یہی ہے۔ بالآخر قیافہ شناسوں کو بُلا کر فیصلہ کیا گیا۔ نہ امام رضا کی بات تسلیم ہوئی اور نہ اس معصوم بچے کی شکل وصورت اور وضع وقطع ہی ان کو مطمئن کر سکی اور نہ دیگر مفروضہ علامات جو امام سے بوقتِ ولادت اور اس کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بہرکیف اہل بیت کرام کا اور حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کی اولاد اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی اولاد کا ان کے نسب پر انکار کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔

یہ تمام تفصیلات ہم نے نظریۂ امامت کے موضوع پر زیرِ تالیف کتاب میں بیان کی ہیں۔ یہاں پر صرف علامہ ڈھکو صاحب کے بے بنیاد دعویٰ کی حقیقت دکھلانا تھی

کہ واقعی ائمہ اثنا عشریہ پر کسی کافر نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کسی کے لئے ان میں اعتراض و انکار اور تنقیص و تنقید کا کوئی موقعہ و محل نہیں تھا یا خود شیعہ حضرات نے ان کے دین و ایمان پر بھی اعتراض کیا اور ان کے حسب ونسب پر بھی۔ ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جن مقبولانِ بارگاہِ خداوندی پر کفار ومشرکین کو بھی طعن و تشنیع کا موقعہ نہیں ملتا۔ یہ شقی ازلی اور بدبخت شیعہ ان کو بھی معاف نہیں کرتے اور صرف ان کے اخلاق و اطوار کو نہیں، ان کے حسب ونسب اور دین و ایمان کو بھی ہدفِ تنقید بنا ڈالتے ہیں خذلھم اللہ تعالیٰ ولعنھم فی الدنیا والاخرۃ۔

رسالہ مذہبِ شیعہ — از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

مسئلہ فدک کی تحقیق

خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق قطعی اور یقینی علم ہر لحاظ سے ائمہ صادقین کو ہی ہو سکتا ہے۔ ان کے ارشادات کو دیکھیں جو خلفائے راشدین کے مناقب میں خود اہلِ تشیع کی مستند اور معتبر کتابوں میں حد وحساب سے باہر ہیں، جن کا نمونہ عرض کر چکا ہوں، جن کے اعمالناموں کے ساتھ مولیٰ علی رشک فرماویں، جن کو آپ امام الہدیٰ اور شیخ الاسلام فرماویں، جن کے متبعین کو صراطِ مستقیم پر پکا اور ثابت قدم بیقین فرمائیں، جن کی اتباع سراسر ہدایت بیقین فرمائیں۔ ان تمام ارشادات کے برعکس ان کو ظالم اور غاصب کہنا سراسر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور باقی ائمہ کی تکذیب ہے، اس کے سوا انصاف سے بتلایئے اور کیا ہے؟

جہلاء، اَن پڑھ اور ناواقف لوگوں کو باغِ فدک کے قصّے گھڑ کر سُنانا اور ان کو ائمہ صادقین کے صریح اور واضح وغیر مبہم ارشادات سے منحرف کرنا چھوڑ دو۔

غور سے سنیے فدک کے متعلق اصولِ کافی ص۳۵۱ مطبوعہ نول کشور

وکانت فدک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاصۃ لانہ فتحھا وامیر المومنین، لم یکن معھما احد فزال اسم الفیئ ولزمھا اسم

الانفال۔ یعنی فدک صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، کیونکہ اس کو صرف آپ نے فتح کیا تھا اور امیر المومنین نے جن کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا، تو اس کا نام فیئ نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ انفال میں داخل ہے۔

اب یہ تحقیق کہ اس غزوہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اور کوئی صحابی نہ تھا۔ واقفِ حال حضرات پر چھوڑتا ہوں سر دست صرف اتنی گزارش کرتا ہوں کہ کافی کی تصریح سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ فدک فیئ نہیں تھا، بلکہ انفال تھا، تو اب انفال کے متعلق حضرت امام عالی مقام سیّدنا جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا واضح اور کُھلا فیصلہ ملاحظہ فرماویں:

قال الانفال مالم یوجف علیہ بخیل ولا رکاب او قوم صولحوا او قوم اعطوا باید یھم و کل ارض خربۃ او بطون اودیۃ فھو لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم وھو للامام بعدہ یضعہ حیث یشاء (اصول کافی ص۳۵۲) امام عالی مقام نے انفال کی تعریف اس کا مصداق اور حکم بیان فرمایا کہ انفال وہ ہے جس کا حصول فوج کشی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ دشمن جنگ کی مصالحت پر پیش کرے یا کوئی قوم اپنے اختیار سے حکومتِ اسلامیہ کو دے دے یا غیر آباد، لاوارث یا دریاؤں اور پہاڑی نالوں کا پیٹ تو یہ سب انفال ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دورِ حیات ظاہرہ میں اس کے واحد مالک تھے اور آپ کے بعد جو امام اور خلیفہ ہوگا، وہی اس کا مالک ہوگا، وہ جس طرح چاہے، اس کو خرچ کرے۔

اسی طرح فروع کافی ص۶۲۶ ملاحظہ فرماویں اور اصول کافی ص۳۵۱ پر بھی فدک کو انفال تسلیم کیا گیا ہے اور انفال کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا کہ امام اور خلیفۂ وقت اس کے اندر تصرف میں مختار عام ہے اور خلفاء راشدین کی امامت بحوالہ شافی و تلخیص شافی، نہج البلاغہ، ابن میثم وغیرہ ثابت اور محقق ہو چکی ہے اور بحوالہ کشف الغمہ ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی صدیقیت اظہر من الشمس ہے اور

بحوالہ ابن میثم و نہج البلاغہ و کافی وغیرہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا ثابت ہو چکا ہے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے غیر مستحق خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے کا فتویٰ قیامت تک نہ مٹنے والے نقوش کے ساتھ تحریر کر دیا ہے، تو پھر فرض بھی کر لیں کہ حسبِ ادعاء شیعہ ان ائمہ ہدیٰ نے فدک کو تقسیم نہیں فرمایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ صادقین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دین و مذہب کے عین مطابق عمل فرمایا، پھر ظلم اور غصب کے اتہامات کس قدر لغو اور بے معنیٰ ہیں۔ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اور امام عالی مقام سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اور امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے، حضرت سیّدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے اور سیدنا حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے اور امام عالی مقام سیّدنا حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی سنّت اختیار فرمائی تھی اور فدک کا تقسیم کرنا جائز نہیں رکھا تھا، بلکہ اسی طریقے پر عمل فرمایا جس پر کہ خلفائے راشدین نے عمل فرمایا، یقین نہ آئے تو اہل التشیع کی معتبر ترین کتاب کشف الغمہ ص۱۴۷ سطر ۲۳ ملاحظہ کریں کہ سب سے پہلے اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے فدک کو تقسیم کیا تھا۔ (رسالہ مذہبِ شیعہ ص۱۰۰ و ص۱۰۱ و ص۱۰۲)

تحفہ حسینیہ — **از ابو الحسنات محمد اشرف السیالوی**

فدک کے متعلق شیعہ حضرات بہت شور و غل کرتے ہیں اور اسے خلیفۂ اوّل کی طرف سے اہل بیت کرام کے خلاف اقتصادی حربہ قرار دیا جاتا ہے تاکہ وہ بھوک اور افلاس کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہو کر ان کے ماتحت رہیں، اس لیے ان کے منہ سے لقمہ چھین لیا وغیرہ وغیرہ، لہٰذا یہاں پر دو امر خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔

اوّل یہ کہ آیا حضرت سیّدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس واقعی صرف فدک ہی واحد ذریعہ کفایت و کفالت کا تھا یا اس کے علاوہ دیگر ذرائع معاش اور خود کفالت کے تھے۔ دوم یہ کہ آیا فدک میں صرف بطورِ وراثت یا ہبہ کے انتقال کرانے میں اختلاف و نزاع پیدا ہوا تھا یا اس کی آمدنی سے بھی انہیں حصّہ نہیں دیا جاتا تھا اور اخراجات کی کفالت

بھی نہیں کی جاتی تھی لیکن خود شیعی روایات اور مسلمات کی رُو سے حقائق وواقعات اس سے بالکل مختلف ہیں اور یہ سب کچھ محض زیبِ داستان کے لیے اور عوام اہلِ اسلام کے جذبات سے کھیلنے کے لئے بیان کیا جاتا ہے۔ آیئے حقیقتِ واقعیہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اعترافِ حقیقت میں بخل سے کام نہ لیں۔

امرِ اوّل کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس فدک کے علاوہ سات باغ تھے، جن میں آپ بلا شرکتِ غیرے تصرّف فرماتی ہیں۔ فروعِ کافی جلد ثالث ص۲۷ باب صدقات النبی صلی اللہ علیہ وسلم والائمہ علیہم السلام ووصایاہم کے تحت ابوصیر سے حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کی یہ وصیت مرقوم ہے:

(۱) هٰذا ما اوصت بہ فاطمۃ بنت محمّد رسول اللّٰہ، اوصت بحوائطہا السبع، العفاف والدلال والبرقۃ والمیثب والحسنیٰ والصافیۃ ومالام ابراهیم الی علی بن ابی طالب فان مضیٰ علی فالی الحسن فان مضیٰ الحسن فالی الحسین فان مضی الحسین فالی الاکبر من ولدہ اشہد اللّٰہ علیٰ ذالک والمقداد بن الاسود والزبیر بن العوام وکتب علی بن ابی طالب۔ یعنی یہ فاطمہ بنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وصیت ہے انہوں نے اپنے سات باغ یعنی عفاف، دلال، برقہ، میثب، حسنیٰ، صافیہ اور مالام ابراہیم کی وصیت کی ہے طرف علی بن ابی طالب کے اور ان کی وفات کے بعد حسن کے لیے اور ان کے وصال کے بعد حسین کے لیے اور ان کے وصال کے بعد ان کے سب سے بڑے فرزند کے لیے، میں اس پر گواہ بناتی ہوں اللہ تعالیٰ کو اور مقداد بن اسود اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کو اور اس وصیت نامہ کو علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نے تحریر فرمایا اور یہی روایت تہذیب الاحکام جلد ۹، ص۱۴۵ اور من لایحضرہ الفقیہ جلد ۴ ص۱۸۰ پر موجود ہے۔

۲۔ عن احمد بن محمد عن ابی الحسن الثانی علیہ السلام قال سئالتہ عن الحیطان السبعۃ أ کانت میراث رسول اللّٰہ لفاطمۃ؟ فقال لا انما کانت وقفا وکان رسول اللّٰہ یاخذ منہا ما ینفق علیٰ اضیافہ والتابعۃ تلزمہ فیہا فلما قبض جاء العباس یخاصم فاطمۃ علیہا السلام فیہا فشہد علی علیہ السلام وھی الدلال والعفاف والحسنیٰ والصافیۃ ومالام ابراهیم والمیثب البرقۃ

فروع کافی جلد ثالث ص۲۷۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد رابع ص۱۸۰ تہذیب الاحکام جلد تاسع ص۱۴۵)

یعنی احمد بن محمد نے حضرت ابوالحسن ثانی رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے سات باغات کے متعلق دریافت کیا کہ آیا وہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بطورِ وراثت حاصل ہوئے تھے، تو انہوں نے فرمایا نہیں وہ تو وقف تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اتنا خرچہ لے لیتے تھے جو اپنے مہمانوں پر صرف فرماتے تھے اور دیگر لازم ذمہ داریوں پر، جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آکر ان میں سے حصّہ وراثت کے لئے مخاصمت کی۔ چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات نے شہادت دی کہ یہ ساتوں باغات حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر وقف ہیں۔

شیعہ حضرات کی صحاح اربعہ میں سے تین صحاح کی دو عدد روایات نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، جن سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ فدک کے علاوہ سات باغات تھے جو مخیریق یہودی کی ملکیت میں تھے اور اُس نے برضا و رغبت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیے تھے یا بنو النضیر کے متروکہ اموال میں سے تھے، اور وہ حضرت سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کے تصرّف میں تھے، لہذا یہ حقیقت بے غبار ہو گئی کہ صرف فدک ہی واحد ذریعۂ معاش نہیں تھا، تو اب درج ذیل امور پر غور فرمائیں:

۱۔ اگر خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے از روئے ظلم و استبداد اقتصادی اور معاشی دباؤ ڈالنا ہوتا تو پھر یہ سات باغات آپ کے تصرّف میں کس طرح رہ سکتے تھے؟ اور وہ کونسی قوت تھی، جس نے ان کو یہ سات باغات غصب کرنے سے باز رکھا اور آپ نہ صرف حالتِ حیات میں ان پر متصرف رہیں، بلکہ بوقتِ وصال ان کی وصیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے بعد ان کی اولاد کو درجہ بدرجہ وصیت کی۔

۲۔ یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا ان باغات پر قبضہ ذاتی ملکیت اور موروثی مال کے طور پر نہیں تھا، بلکہ مال وقف کے متولی کے طور پر تھا اور ان باغات کو حسبِ تعریف کافی انفال میں سے ماننا لازم ہے، تو اس طرح دیگر انفال کا حکم بھی یہاں سے واضح ہو جائے گا۔

۳۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حقِ وراثت طلب کرنے پر جو جواب ان کو حضرت زہراء اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کی طرف سے دیا گیا کہ یہ مال وقف ہے نہ کہ ذاتی ملکیت لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہما کے ہاتھ میں بھی بطورِ وقف تھا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، پھر حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے تصرّف میں بھی بطورِ مال وقف رہا، ورنہ بیک وقت بطورِ زوج ہونے کے چوتھائی حصہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مل جاتا اور تین چوتھائی آپ کی اولاد کو مل جاتا۔ لہٰذا واضح ہوگیا کہ اصل میں وقف تھا اور آخر تک وقف کی حالت میں رہا اور یہی جواب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت سیدۂ زہراء رضی اللہ عنہا کو دیا گیا تھا تو اگر یہ جواب برحق ہے، تو وہ بھی برحق تھا اور وہ غلط تھا تو صحیح یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب دونوں کی صورت ایک ہے تو شرعی حکم بھی ایک ہی ہونا لازم ہے، اس میں تفریق و امتیاز سراسر زیادتی ہے۔

۴۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سُن کر خاموش ہو جانا اور ناراضگی اور ترکِ سلام و کلام سے بالکل مبرا رہنا، جبکہ ان کے قبضے میں ایک باغ بھی نہیں تھا اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا ایک باغ نہ ملنے پر ناراض ہو جانا اور اتنا سخت

ناراض ہونا کہ منانے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود نہ راضی ہونا اور تادمِ زیست کلام بھی ترک کر دینا محلِ غور ہے اور لائقِ فکر و نظر ہے کہ آیا لختِ جگرِ مصطفےٰ رضی اللہ عنہا اس بلند حوصلگی، عالی ہمتی اور فراخ دلی کی زیادہ حقدار و سزاوار تھیں، جو بقولِ شیعہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دوسری اولادِ پاک کی نسبت فطرتِ اسلام اور اس کی طہارت و تقدیس پر متولد ہوئی تھیں یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو شیعہ کے نزدیک مخلص مومن بھی نہیں تھے، العیاذ باللہ! گویا حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے دادے نے ان کا دعویٰ قبول کر لیا اور اسی قسم کا نانے کا دعویٰ نواسی نے قبول نہ فرمایا، کیا عظمتِ زہراء کے مدِّ نظر یہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے؟

۵۔ ان روایات سے یہ بھی واضح ہوا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان باغات کی آمدنی میں تصرّف فرماتے تھے اور صرف بقدرِ ضرورت اس میں سے لیتے تھے اور بقیہ کو دیگر مصارف میں استعمال فرماتے، جن کا تعلق جہاد اور رفاہِ عامہ سے ہوتا تھا نہ کہ ان کو ذاتی ملکیت کے طور پر تصرّف میں رکھے ہوتے تھے اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی متولی کو اپنے زیرِ تصرّف اوقاف اور قومی املاک، کسی کی ذاتی ملکیت قرار دینے کا حق نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نائبِ مطلق اور مالکِ کون و مکان اس کی پابندی فرمائیں، تو دوسروں کو اس سے سرِ مُو انحراف و عدول کی کس طرح گنجائش ہو سکتی ہے؟

صَدقاتِ زہرا رضی اللہ عنہا کے مَصارف

اب اس امر کا بھی فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ ان صدقاتِ نبویہ اور صدقات و اوقافِ زہراء کے مصارف کیا تھے؟ تو فروعِ کافی کے اسی باب میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ ابو مریم روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے نبوی اور مرتضوی صدقات کے متعلق دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا: ھی لنا حلال وقال ان فاطمۃ جعلت صدقتھا لبنی ھاشم وبنی المطلب ص۴۷ ج ۳

وہ ہمارے لئے حلال ہیں اور فرمایا کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے اپنے صدقات بنو ہاشم اور بنو المطلب کے لئے وقف کر رکھے تھے اور یہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ والی روایت کا ماحصل تھا کہ ہم انبیاء کرام علیہم السلام کا گروہ نہ وارث بنتے ہیں اور نہ کسی کو وارث بناتے ہیں۔ ہمارا تمام تر ترکہ صدقہ ہوگا: نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکناہ فھو صدقۃ۔ لہٰذا دونوں میں مآل اور انجام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ نہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس کو ذاتی ملکیت قرار دیتی تھیں اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ـــ بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی بطورِ نیابتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان اموال میں تصرف کا حق اپنے لیے ثابت کرتے تھے، جبکہ ان شیعی روایات کے مطابق حضرت سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کا موقف بھی یہی ہے کہ مجھے اس وقف میں تصرف کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا یہ کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف ہی نہیں، جس کو عالمِ اسلام کا ایک اہم اختلافی نظریہ بنا لیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کو موردِ الزام ٹھہرا لیا گیا اور ظالم و غاصب قرار دے دیا گیا۔

ازروئے منتظم زیادہ موزوں کون تھا؟

جب سابقہ گزارشات سے صحیفۂ خاطر پر یہ حقیقت نقش ہوگئی کہ فدک وغیرہ میں اختلاف صرف انتظامی حقداری کے اندر تھا نہ وقف یا قومی ملکیت میں ہونے میں اور نہ اس کے مصارف میں کوئی خاص اختلاف تھا، تو اب اس امر میں غور کر لیا جائے کہ ایسے امور کا انتظام و انصرام مرد بہتر طریقہ پر چلا سکتے ہیں یا عورتیں اور بالخصوص وہ عورت جو عصمت و عفت مآب ہو اور پردہ داروں کی سردار ہو۔ ظاہر ہے کہ آپ کی بجائے کوئی مرد ہی اس انتظام کے لیے موزوں تر ہو سکتا تھا، تو پھر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے پیش کردہ حوالہ جات کی رُو سے ظاہر ہو گیا کہ یہ حق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تھا اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے آنے والے خلفاء و ائمہ کا کما قال الامام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ کہ انفالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں اور آپ کے بعد امام

وقت کے لئے کہ اسے جہاں چاہے اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرے۔ فھو لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم للامام بعدہ یضعہ حیث یشاء

کیا ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن مصرف نہیں؟

عام اہلِ اسلام کی عورتیں خاوند کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں چوتھا حصہ اور اس کی اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصہ اس کے ترکہ سے حاصل کرتی ہیں، لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات، بلکہ اپنی ماؤں کے لئے حضرت زہراء اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما نے کیا سوچا کہ ان کے لیے وراثت بھی نہ ہو اور اخراجات کی کفالت بھی نہ ہو، جبکہ دوسری عورتیں صرف چار ماہ دس دن عدت گزار کر جہاں چاہیں نکاح کر لیں، لیکن ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس قسم کا تصور و خیال بھی روا نہ ہو۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً۔ تو آخر وہ زندگی کے ایام کس طرح پورے کریں اور اخراجات کہاں سے پورے کریں؟ تو اس ضمن میں ثقۃ الاسلام، شریعت مدار، مجتہد العصر بلکہ آیۃ اللہ روح اللہ کے القاب رکھنے والے علماء و مجتہدین کیا فرماتے ہیں کہ ان ازواجِ مطہرات کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اموال سے جملہ ضروری اخراجات ملنے ضروری ہیں یا نہیں؟ اور انہیں نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وعلیہم وعلیہن کی ازواج ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور امت کی طرف سے یہی بدلہ ملنا چاہیے کہ ان کی روزی بھی بند کر دی جائے اور اختیارِ نکاح بھی ختم کر دیا جائے کیا یہ زوجیت ان کے لیے اعزاز ہوئی: یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ ... اور اَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ، باعثِ سزا اور حبس بے جا کا موجب بن گئی، لہٰذا ہر صاحب عقل و ہوش اور صاحبِ دیانت و امانت یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یقیناً ازواجِ مطہرات کے جملہ اخراجات کی کفالت تا زیست انہیں اموال سے لازم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں تھے، بلکہ امت کی مائیں ہونے کے لحاظ سے دُور و دراز سے

اُمتی اور رُوحانی اولاد اُن کے درِ والا پر آنی تھی، لہذا اس حیثیت کو ملحوظ رکھ کر ان کو ضروریات مہیا کرنا لازم و ضروری تھا، تو کیا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس لیے گردن زدنی ہیں اور محلِ طعن و تشنیع کہ انہوں نے ازواجِ مطہرات کے حقوق کا تحفظ کیا اور حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہما کی ماؤں کی باعزت گزر بسر کا انتظام کیا اور شیعی نقطۂ نظر کے لحاظ سے اسلام پر لازم آنے والے لاجواب اعتراض کو دُور کر دیا کہ اسلام نے ازواجِ مطہرات کے حق میں کس عدل و انصاف کا مظاہرہ کیا ہے کہ اُمت کی عورتیں تو چوتھا یا آٹھواں حصّہ لے سکتی ہیں، جبکہ چار سے زیادہ ایک شخص کے عقد میں آ بھی نہیں سکتیں اور صرف چار ماہ دس دن کے لیے پابند ہیں، جبکہ ازواجِ مطہرات کے لیے زندگی بھر کے لئے پابندی کہ دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتیں اور تعداد کے لحاظ سے بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لیے آپ کے وقتِ وصال میں نو ازواجِ مطہرات بقیدِ حیات موجود تھیں اور ذرائع معاش اور اسبابِ کفالت میں ان کا حصّہ بھی نہیں، تو ان کے حق میں اس سے بڑی اسلام کی طرف سے ناانصافی کیا ہو گی (اگر واقعی یہی اسلامی حکم ہو تو) لہذا حضرتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس توہم اور وسوسہ کو اپنی خداداد فراست اور صحیح نظر و فکر اور راست اقدام سے بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا اور عدلِ اسلام کو مہرِ نیمروز کی طرح واضح کر دیا۔

یہود کی سازش اور حضرت صدیق اکبر اور حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کی کمال دیانت

اگر دونوں حضرات نے جور و استبداد اور ظلم و ستم کا ارتکاب کرنا ہوتا تو دوسرے باغات بھی چھین لیتے، جس طرح پہلے عرض کیا ہے۔ نیز فدک کو قومی ملکیت قرار نہ دیتے، بلکہ اپنے نام منتقل کرتے یا اپنی صاحبزادیوں کے نام منتقل کر دیتے، جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نہ اولادِ جسمانی تھی جو انہیں کما کر کھلائے اور نہ حضرت

حفصہ رضی اللہ عنہا کی آپ سے اولاد اور نہ ہی آپ کا سایہ ان کے سر پر رہا اور نہ ہی زندگی میں آپ نے کوئی مستقل ذریعۂ معاش اور سببِ گزران کا ان کے لیے بنایا اور مخصوص ٹھہرایا، لہذا اگر ناجائز اقدام کرنا ہی تھا، تو پھر اپنی ان عزیز ترین بیٹیوں کے لیے کیوں مخصوص کر دیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کے متعلق جو فیصلہ فرمایا، وہ مخصوص طور اور خالص دیانت داری اور امانت داری کے مطابق کیا اور وہ دنیا اور اس کے فانی مال کے نہ خود طلبگار تھے اور نہ اپنی اولاد کو اس کا طالب بنایا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے صدقے میں ان اصحاب اور اخص تلامذہ کا یہ حال ہے تو امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لختِ جگر رضی اللہ عنہا کے استغنا اور دُنیائے دُوں سے تنفر کا عالم کیا ہو گا، تو پھر اس ناراضگی اور نہ ختم ہونے والے ارمانوں کا کیا مطلب؟ یقیناً یہ افسانہ نگاری سبائی ذہنیت کا شاہکار ہے، کیونکہ یہ علاقہ یہودیوں سے ہی لشکرِ اسلام کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکنے کی وجہ سے ڈاکر دیا اور مصالحت کر لی، مگر اپنے قلبی دُکھ درد اور رنج و الم کا اظہار اس انداز سے کیا کہ وہی فدک قیامت تک اہلِ اسلام کے لیے افتراق و انتشار اور جدال و خصومت کا موجب اور باہمی سر پھٹول کا باعث بن گیا اور اس طرح کیونکر نہ ہوتا جبکہ وہ علاقہ بھی یہودیوں سے لے لیا گیا تھا اور یہ مذہب رفض و تشیع بھی انہیں کا جاری کیا ہوا ہے تو اگر یہ مذہب اس علاقہ کے ہاتھوں سے نکل جانے کی پریشانی و اضطراب اور رنج و الم اور دُکھ درد پر مشتمل نہ ہوا اور یہود کو ذلیل و خوار کر کے مدینہ و خیبر سے نکال دینے والوں پر ظلم و استبداد اور جور و ستم کے الزامات پر مشتمل و محیط نہ ہو تو پھر اس کے جاری کرنے کا فائدہ ہی کیا ہو سکتا تھا، لہذا فدک کے بہانے ان امراءِ اسلام کو بھی جی بھر کر گالیاں دیں اور اپنے ارمان نکالے، بلکہ ان شاطروں نے ایسا مذہب اور مسلک ایجاد کیا کہ اس فدک پر اپنی بہو بیٹیوں اور ماؤں بہنوں کو رونا دھونا کھانے کی بجائے رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر فاطمہ و بتول رضی اللہ عنہا کو آنسو بہاتے دکھلایا اور بھری محفلوں میں اس مستورہ و مخدرہ کو اپنے اثباتِ دعویٰ میں تقریریں کرتے دکھایا

اور والدِ گرامی کے سُسر اور اپنے نانے پر ظلم و تعدّی اور جور و ناانصافی اور شرعی احکام کی خلاف ورزی وغیرہ وغیرہ کے الزامات عائد کرتے اور خود انہیں اسی فدک کے غم میں جہانِ فانی سے کوچ کرتے دکھایا اور اہلِ اسلام میں سے ایک فرقے کو صدیوں سے اسی فدک کے غصب ہونے کی وجہ سے رونے دھونے میں مصروف رکھا ہوا ہے اور یوں فدک حاصل کرنے کے عوض ان غازیانِ اسلام اور بانیانِ اسلام سے بھاری قیمت وصول کی اور بدلہ چکایا، لیکن ہم ہیں کہ نہ اس شاطرانہ چال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ان مقدّس ہستیوں کے اخلاص و وفا کو ہی ملحوظ رکھ کر اس یہودی حربہ کو ناکام کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

امرِ دوم: اب یہ دیکھنا ہے کہ فدک کی آمدنی سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اور اہلِ بیت کرام کو حصّہ ملتا رہا یا نہیں؟ اور یہ حضرات اس کو قبول فرماتے رہے یا نہیں؟ اگر وراثت اور ہبہ کے طور پر ان کے حوالے نہ کرنے کے باوجود ان کے اخراجات کی کفالت ہوتی رہی ہو اور سیّدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر اہل بیت کرام اس آمدنی سے برضا و رغبت حصّہ وصول کرتے رہے ہوں، تو پھر بھی اس اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی اور نہ اس کو اُچھالنے اور افسانوی رنگ دینے کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے ۔

محاصلِ فدک سے کفالت اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا بیان

شرح ابن میثم بحرانی میں مرقوم ہے کہ جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے فدک کے متعلق بطورِ وراثت ملکیت کا دعویٰ کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سُنی ہوئی حدیث بیان فرمائی۔

انا معاشر الانبياء لا نورث ذهبا ولا فضة ولا ارضا ولا عقارا ولا دارا ولكن نورث الايمان والحكمة والعلم والسنة

وقد عملت بما امرني وسمعت ـ جلد خامس ص۱۰۱

یعنی ہم انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت کسی کو سونے، چاندی، زمین، مکان اور حویلی کا وارث نہیں بناتے، لیکن ایمان، حکمت، عِلم اور سُنّت کا وارث بناتے ہیں اور میں نے اسی پر عمل کیا ہے جس کا مجھے میرے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا اور جو میں نے آپ سے سُنا ـ وکذا فی الاحتجاج للطبرسی ص۱۰۲ مطبع جدید

اس کے بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسولِ خدا علیہ التحیۃ والثناء نے مجھے فدک ہبہ کر دیا تھا، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے گواہ طلب کیے اس پر حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے کہا، حضرت علی اور حضرت اُمّ ایمن (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) چنانچہ ان دونوں نے آپ کے حق میں گواہی دی ـ اسی دوران حضرت عمر فاروق اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما آئے، تو انہوں نے فدک کی آمدنی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تقسیم در مصارف کی تفصیلات بیان کیں، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

صدقت یا بنة رسول الله وصدق علی وصدقت ام ایمن وصدق عمر وصدق عبد الرحمٰن بن عوف وذالك ان لك ما لابيك كان يأخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم من فدك قوتكم ويقسم الباقي ويحمل منه في سبيل الله ولك على الله ان اصنع بها كما كان يصنع فرضيت بذالك واخذت العهد عليه به وكان يأخذ غلتها فيدفع اليهم منها ما يكفيهم ثم فعلت الخلفاء بعده كذالك ـ شرح ابن میثم بحرانی جلد ۵ ص۱۰۷

یعنی اے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر رضی اللہ عنہا! آپ نے بھی سچ فرمایا اور حضرت علی، حضرت ام ایمن اور حضرت عمر فاروق اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی سچ کہا۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جو حصّہ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا وہ اب بھی تمہارے لیے ہوگا۔ آپ کا طرزِ عمل فدک کے محاصل میں یہ تھا کہ تمہاری

روزی اور اخراجات کی مقدار کے مطابق ان سے لے لیتے تھے اور جو بچ جاتا اس کو تقسیم فرماتے اور جہاد کے لیے سواریاں خرید فرماتے اور میں آپ کو اللہ تعالیٰ ضامن دیتا ہوں کہ میں بھی وہی عمل اور طریق کار اختیار کروں گا جو آپ کا تھا، تو آپ راضی ہوگئیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس عمل اور طریق کار پر عہد لیا چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فدک کی آمدنی سے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی ضرورت اور کفایت کے مطابق ان کے گھر بھیجتے رہتے تھے اور آپ کے بعد والے خلفاء نے بھی اسی روش و کردار کو اپنایا اور حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے بھی یہی تفصیل شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید ص ۲۱۶ جلد ۱۶ پر ابوبکر احمد بن عبدالعزیز الجوہری کے حوالے سے مرقوم ہے اور دُرّہ نجفیہ شرح نہج البلاغہ جلد ۲ ص ۳۳۲ پر موجود ہے۔

فوائد: شیعہ حضرات کی کتب معتبرہ میں منقول اس تفصیلی روایت سے کئی فوائد حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** یہ ہے کہ حضرت صدیق اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہما کے درمیان اگر وقتی طور پر اس خاص مسئلہ میں اختلاف رائے پیدا ہوا بھی تھا تو وہ ختم ہوگیا اور آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے راضی ہوگئی تھیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ فدک میں اختلاف رائے کی جہت متعین ہوگئی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اخراجات کی کفالت میں پس و پیش نہیں کر رہے تھے، صرف ذاتی جائیداد اور موروثی ملکیت کے طور پر آپ کے حوالے کرنے کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سمجھتے تھے اور اس کو وقف مال اور قومی ملکیت قرار دیتے تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مطالبہ پر جو جواب ان کو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا اور حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے دیا گیا تھا بعینہٖ وہی جواب، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان حضرات کو دیا گیا تھا، گویا اس مسئلہ میں بھی باہم اتفاق و اتحاد ثابت ہوگیا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ فدک کے ہبہ کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ساری جائیداد کا قبضہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو دے دیا گیا تھا، ورنہ پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کے محاصل وصول کرنے اور بقدرِ ضرورت حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو دے کر باقی کو جہاد اور دیگر ضروریات میں استعمال کرنے کا مطلب کیا ہوسکتا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول کا اور اسے تسلیم کیے جانے کا مطلب کیا ہوسکتا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کو ضامن دیتا ہوں کہ میں اس کو اسی طرح تقسیم کروں گا، جس طرح رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم فرماتے تھے اور آپ نے اس پر رضامندی ظاہر فرمائی، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ہبہ سے مراد آمدنی کو ان حضرات پر صرف کرنا تھا نہ کہ ان کے قبضہ میں دے دینا، اور خود دست بردار ہوجانا۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا کی گواہی بھی رد نہیں کی گئی اور نہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا دعویٰ ہی بالکل رد کر دیا گیا تھا، بلکہ عملِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور شہادتِ اکابر کے مطابق اس کی صحیح صورت و شکل اور جہت متعین کر دی گئی تھی کہ واقعی فدک کی آمدنی تمہارے سپرد کی جاتی تھی لیکن ساری آمدنی بھی نہیں دی جاتی تھی اور بطورِ ملکیت اور ذاتی جائیداد بھی نہیں دی جاتی تھی، بلکہ انفال وفیٔ کے مصارف میں سے اہم مصرف ہونے کی بناء پر دی جاتی تھی، لہٰذا اس سے شیعہ حضرات کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ردِّ دعویٰ اور ردِّ شہادت کا الزام عائد کرنے اور پھر اس پر واویلا کرنے کی بنیاد ہی ختم ہوگئی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اخلاص اور احترامِ اہل بیت باحسن طریق ثابت ہوگیا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

کیا فدک وغیرہ ذاتی ملکیت ہوسکتے ہیں؟

اس تفصیلی روایت اور اس کے فوائد و نتائج کو معلوم کر لینے کے بعد اب صرف یہ نکتہ قابلِ تحقیق و تدقیق رہ گیا کہ آیا فدک اور اس قسم کے دوسرے اموال میں جو بقولِ کلینی اور بروایتِ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ انفال کہلاتے ہیں، ان میں وراثت جاری ہونی چاہیے یا نہیں؟ اور ایسے اموال قومی ملکیت قرار دیئے جائیں یا حاکمِ وقت کی شخصی اور ذاتی ملکیت۔ اربابِ عقل و دانش سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ جب بادشاہِ اسلام

اور حاکمِ وقت افواج وسپاہ کے ہمراہ کسی ملک وقوم پر حملہ آور ہو اور وہ مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے کچھ علاقہ دے کر صلح کرلیں، تو وہ علاقہ لازمی طور پر قومی ملکیت قرار پائے گا نہ کہ اس حاکم وسلطان کی ذاتی ملکیت کیونکہ اس کے رعب و دبدبہ اور ہیبت وجلال کا مظہر افواج وسپاہ ہیں نہ کہ محض اس کی اکیلی ذات اور یہی صورتِ حال فدک کی بھی ہے کہ اس کو بطورِ مصالحت کے پیش کیا گیا اور جنگ سے بچاؤ حاصل کیا گیا۔

جہاں جنگ لڑی گئی، وہاں پر چار خمس مجاہدین اور غازیانِ اسلام کو دیئے گئے، لیکن یہاں جنگ نہیں لڑی گئی تھی، لہٰذا صرف ایک خمس کی بجائے پوری جائیداد پر صرف حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا تصرّف اور تولیت رہی، لیکن قومی ملکیت کے نگرانِ اعلیٰ اور حاکمِ وقت کے طور پر نہ کہ ذاتی جاگیر کے طور پر اور یہی عندیہ ونظریہ حضرت ابوبکر صدیق اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا کہ یہ قومی ملکیت ہے اور اس کو تمام مصارف میں خرچ کرنا حاکمِ وقت کی ذمہ داری اور اہم فریضہ ہے اور اس مال سے ازواجِ مطہرات اور جملہ اہلِ بیت کرام اور یتامیٰ ومساکین وغیرہ کے اخراجات پورے کئے جائیں گے اور جو بچ جائے گا، اس سے جہاد کے لیے ضروری ساز وسامان حاصل کیا جائے گا اور یہی روش ورفتار اور عمل وکردار سیدِ عرب وعجم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا اور اسی پر عمل پیرا ہونے کی حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے ضمانت دی اور باہمی صلح وصفائی ہوگئی اور اختلاف ونزاع بالکل ختم ہوگیا اور یہی عمل وکردار اپنے دَورِ خلافت میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا بھی رہا جیسے کہ روایت کے آخری جُملہ سے بھی ظاہر اور دیگر حوالہ جات سے بھی جو بعد میں ذکر کیے جائیں گے۔

کیا وراثتِ انبیاء کا شرعی حکم حضرتِ زہراء کو معلوم نہیں تھا؟

شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ شریعت حضرتِ زہراء رضی اللہ عنہا کے گھر کی تھی، تو کیا انہیں یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا؟ انہوں نے اس کا مطالبہ پھر کیوں کیا تھا؟ تو جواباً معروضِ خدمت ہے

۱۔ جو عمل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تھا، وہی عمل حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

کا اپنے دَورِ خلافت میں رہا، لہٰذا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے نقطۂ نظر پر مرتضوی عمل نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور جب شہرِ علم اور مدینۃ الحکمت کے اس عظیم باب کی موافقت ومطابقت اور ہم خیالی ثابت ہوگئی، تو یہ اعتراض حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات سے مندفع ہوگیا، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب باب ہیں، تو اس سے وہی ظاہر ہو گا جو اس شہر کے اندر ہے، لہٰذا جب حقیقی مالکِ شرع حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ ونظریہ معلوم ہوگیا، تو اعتراض کی کیا گنجائش رہی؟ موافقتِ عمل کا ایک اور حوالہ عرض کرتا چلوں۔ ابوبکر جوہری نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب محمد بن اسحاق نے ان سے سوال کیا کہ جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ عراق اور اس کے علاوہ دیگر علاقوں میں مسلمانوں کے خلیفہ بن گئے، تو آپ نے ذوی القربیٰ والے حصے میں کیا روش اختیار کی؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا، سلك بھم طریق ابی بکر وعمر۔ کہ انہیں ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) والے طریقہ پر چلایا، تو میں نے کہا، یہ کیسے اور کیونکر ہوا، حالانکہ تم تو فدک وغیرہ کے متعلق مختلف نظریہ رکھتے ہو، تو انہوں نے فرمایا ان کے اہلِ بیت وہی عقیدہ ونظریہ رکھتے ہیں، جو ان کا تھا، تو میں نے کہا، تو انہیں فدک وغیرہ واپس کرنے میں کیا مانع پیش آیا؟ تو آپ نے فرمایا، کان یکرہ ان یدعیٰ علیہ مخالفۃ ابی بکر وعمر (شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۶، ص ۲۳۱) یعنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس امر کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کی طرف ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) کی مخالفت کی نسبت کی جائے۔ تو اگر ان کا عمل قرآن وسنّت کے خلاف ہوتا، تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کتاب وسنّت کی مخالفت کر کے ان کی موافقت کیسے کر سکتے تھے؟ لہٰذا اس اختلاف میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عمل گویا ثالث اور حکم ٹھہرا اور یہ اختلافِ رائے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہما کے باہمی اختلاف کی بجائے حضرت مرتضیٰ اور حضرتِ زہراء رضی اللہ عنہما کا اختلافِ رائے بن گیا، تو اب تو دونوں ہی حضرات شریعت والے باہم مختلف ہو گئے، تو کیا فتویٰ ہے، ان میں سے کس کا قول وزنی ہوگا؟

۲۔ بعض جزوی مسائل میں اختلاف آراء کا پایا جانا نہ ذاتی اختلاف کے زمرے میں آتا ہے اور نہ مذہب و مسلک کے اختلاف کے زمرے میں اور کسی ایک کی رائے کے وزنی ہو جانے سے دوسرے کی توہین و تحقیر بھی لازم نہیں آتی۔ دیکھئے قرآن مجید نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے اختلاف رائے کو بھی بیان فرمایا ہے اور اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم اور فیصلہ کو وزنی اور راجح بھی قرار دیا ہے، حالانکہ اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نہ نبوت و رسالت کے منصب پر فائز تھے اور نہ ہی حکومت و سلطنت پر، بلکہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے تھے۔

کما قال اللہ تعالیٰ، وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (سورۃ الانبیاء)

یاد کرو داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو جبکہ وہ کھیتی کے متعلق فیصلہ دیتے تھے، جبکہ اس میں ایک قوم کی بھیڑ بکریاں داخل ہو کر چر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ و حکم کا مشاہدہ کر رہے تھے اور وہ فیصلہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا تھا اور ان (باپ بیٹے) میں سے ہر ایک کو ہم نے فیصلہ کی قوت اور علم عطا کیا تھا۔

الغرض جب قرآن مجید کی رُو سے بیٹے کو باپ کے فیصلہ کے برعکس اور صاحبِ وقت پیغمبر اور خلیفہ کے خلاف رائے دینے کا حق ہے اور یہ بیٹے کی طرف سے باپ کی شان میں گستاخی نہیں اور نہ حضرت داؤد علیہ السلام کی ہتک اور کسرِ شان، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو منصبِ خلافت پر فائز ہیں اور رشتہ میں نانے ہیں اور عمر میں بڑے، سفر و حضر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے تھے اور آپ کے وزیر و مشیر تھے، اور آپ کے فدک کے متعلق طرزِ عمل کو بھی آنکھوں سے دیکھنے والے تھے اور ان کے ارشادات کو بھی براہِ راست سننے والے تھے، انہیں یہ حق کیوں کر نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی صحیح معلومات پر مبنی دیانتدارانہ رائے ظاہر کر سکیں اور اس سے ان کی طرف سے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی شان میں کونسی تقصیر اور اسارت و بے ادبی لازم آسکتی ہے

یا اس کو ظلم و جور اور استبداد سے کیونکر تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

آخر مُرّوت کا تقاضا کیا تھا؟

ابن العلقمی کے بندۂ درگاہ اور معتزلی شیعی ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں کہا، كان الاجمل ان يمنعهم التكرم مما ارتكبا منها فضلا عن الدين وهذا الكلام لا جواب عنه ولقد كان التكرم ورعاية حق رسول الله وحفظ عهده يقتضي ان تعوض ابنته بشيئ يرضيها الخ (ص۲۸۶ جلد ۱۶)

یعنی زیادہ موزوں یہ تھا کہ انہیں جود و کرم اور مروّت و رواداری اس سلوک سے روکتے جو انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے ساتھ روا رکھا، چہ جائیکہ دین و ایمان، اور اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں، کیونکہ مروّت اور سخاوت و کرم کا اور حقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہداشت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو کوئی چیز دے دی جاتی، جس سے آپ راضی ہو جاتیں۔

لیکن فدک وغیرہ کو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دینے کو مُروّت اور جُود و کرم قرار دینا اور حقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایت قرار دینا سراسر غلط ہے اور بقائمی ہوش و حواس اور شرعی معاملات کی نزاکتوں کو سمجھنے کے بعد ایسا سوال ہرگز نہیں اٹھایا جا سکتا، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کا بُغض یا حضرات اہل بیت کی محبّت میں غلو اگر کسی کے ہوش و حواس اور عقل و خرد کو ماؤف کر دے، تبھی اس قسم کے توہمات قلب و ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اس سوال کی لغویت ملاحظہ کریں؛

۱۔ حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فدک اور دیگر اموال پر قبضہ ذاتی ملکیت کے طور پر نہیں تھا، بلکہ صرف انتظامی نوعیت کا تھا اور آپ اس کو قومی ملکیت کے طور پر بیت المال کا حصہ سمجھتے تھے اور مستحقین میں تقسیم کرنے کے پابند تھے۔ اگر دوسروں کا حق

سلب کرتے، تو از روئے شرع شریف مجرم ٹھہرتے۔ نیز حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دوسروں کا حق دے دیتے، تو بھی آپ کو مجرم اور ظالم بناتے۔ العیاذ باللہ! لہٰذا یہ سوچ اور فکر قطعاً اسلامی نہیں کہ چونکہ فلاں عظیم شخصیت نے یہ مطالبہ کر دیا ہے تو شرعی احکام کو نظر انداز کر دو، خود بھی مجرم و ظالم بن جاؤ اور اس ہستی کو بھی مجرم اور ظالم بنا ڈالو۔ نگاہِ شرع شریف میں چھوٹے اور بڑے سبھی برابر ہیں اور حقوق العباد میں کسی کی خاطر دائرۂ شرع سے نکلنا اور حدود سے تجاوز کرنا روا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کو مروت و اخلاص اور حقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی رعایت اور نگہداشت کہا جا سکتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس مخلص اور پسندیدہ جماعت کی پہچان اور تعارف کراتے ہوئے فرمایا، جس کو اُس نے مرتدین اور باغیانِ اسلام کی سرکوبی کے لیے منتخب فرمایا تھا، لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ کہ وہ شرعی احکام کے نافذ کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔

اگر اللہ تعالیٰ کے احکام میں لچک پیدا کر لی جائے اور انہیں شخصیات کے گرد گھمانا شروع کر دیا جائے، تو یہ اسلام کی ابدیت اور دوام و بقاء اور اس کی انفرادیت اور امتیازی شان کے سراسر خلاف ہے اور اسلام کو یہودیت کے سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش ہے، کیونکہ یہودی احبار نے امیر و غریب اور اربابِ اقتدار اور محروم اختیار لوگوں میں تفریق پیدا کر رکھی تھی، لیکن اسلام نے اس تفریق اور امتیاز کو ختم کر کے بے لاگ اور بے رُو رعایت انصاف مہیا کرنے اور مستحقین کو حقوق ادا کرنے کی ضمانت دی۔ اگر خدا کا آخری دین بھی اسی اونچ نیچ اور امارت و غربت اور وجاہت و افلاس کا تفرقہ روا رکھے تو غرباء و فقراء اور دنیوی وجاہت سے محروم لوگ انصاف کس جگہ سے حاصل کر سکتے اور پھر اسلام کے پنپنے اور قابلِ قبول ہونے کی صورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟ لہٰذا عقل و خرد کو شرع کے تابع سمجھنے والوں کے ذہن میں اس قسم کے توہمات قطعاً پیدا نہیں ہو سکتے۔

صدیقی مُروّت و اِخلاص

ہاں اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذاتی مال کے متعلق حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ایسا مطالبہ ہوتا اور وہ آپ کو پیش نہ کرتے، تو خلافِ مروت سمجھا جا سکتا تھا، لیکن اپنے اور بیگانے سبھی شاہد ہیں اور اس حقیقت کے اعتراف و اقرار میں متفق و متحد ہیں کہ حضرت سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری پونجی پیش کرتے ہوئے عرض کیا، واللہ لقرابة رسول الله صلى الله عليه وسلم احبّ الى ان اصل من قرابتي (شرح حدیدی، جلد ۶ ص۴۷) بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت اور رشتہ و پیوند کا لحاظ اور صلہ رحمی میرے لئے اپنے قرابت داروں کی نسبت زیادہ اہم اور پسندیدہ ہے۔ لہٰذا میرے ذاتی مال سے جو چاہو سو لے لو وہ آپ کا مال ہے، لیکن فدک وغیرہ کے متعلق اگر میں اس روش اور طریقہ سے عدول کروں جو جنابِ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا ہوا تھا، تو میں راہِ راست سے بھٹک جاؤں گا اور ابوبکر جوہری نے نقل کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا،

يا ابنة رسول الله والله ما خلق الله خلقا احبّ الىّ من رسول الله ابيك صلى الله عليه وسلم ولو ددت ان السماء وقعت على الارض يوم مات ابوك والله لئن تفتقر عائشة احب الىّ من ان تفتقرى، اترانى اعطى الاحمر والابيض حقه واظلمك وانت ابنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ان هٰذا المال لم يكن للنبى صلى الله عليه وسلم وانما كان مالا من اموال المسلمين يحمل النبى صلى الله عليه وسلم به الرجال وينفقه فى سبيل الله فلما توفى رسول الله صلى الله عليه وسلم وليته كما كان يليه الخ (شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۶ ص۲۱۴)

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر! مجھے اللہ کی قسم ہے اللہ تعالیٰ نے کوئی فرد ایسا پیدا ہی نہیں کیا جو مجھے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح محبوب ہو اور جس دن آپ کا وصال ہوا، میں اس امر کا دل و جان سے آرزومند تھا کہ آج کے دن آسمان زمین پر گر پڑے اور جہان ہی ختم ہو جائے۔ اللہ کی قسم! میری بیٹی عائشہ کا محتاج اور فقیر ہو جانا میرے لیے قابلِ برداشت ہے، لیکن تمہارا محتاج و فقیر ہونا میرے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں ہر سُرخ اور سفید یعنی عربی اور عجمی کو تو مال دوں، لیکن تم پر ظلم کروں گا، حالانکہ تم میرے رسولِ کریم کی لختِ جگر ہو۔ صورتِ حال واقعی یہ ہے کہ یہ مال آپ کا ذاتی مال نہیں تھا بلکہ یہ مسلمانوں کے اموال میں سے ایک مال تھا جس میں سے آپ مجاہدینِ اسلام کو سواریاں مہیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ جب آپ کا وصال ہو گیا تو میں اس مال کا متولی بنا، جس طرح کہ آپ اس کے متولی اور نگران تھے الخ

اور احتجاج طبرسی میں یوں منقول ہے: وھٰذہ حالی ومالی وھی لک بین یدیک لاتزوی عنک ولاتدخرونک وانک وانت سیدۃ امّۃ ابیک دالیٰ، حکمک نافذ فیما ملکت یدای فھل ترین ان اخالف فی ذالک اباک صلی اللہ علیہ وسلم۔

ترجمہ: یہ میرا حال ہے (جو عرض کر چکا) اور یہ میرا مال ہے، جو آپ کی خدمت میں حاضر ہے اور آپ کا ہی مال ہے، وہ نہ تم سے سمیٹ کر دُور کیا جائے گا اور نہ اس کو آپ کے علاوہ کسی کے لیے ذخیرہ کیا جائے گا، جبکہ تم اپنے باپ کی امت کی سردار ہو تمہارا حکم میری مملوکہ اشیاء پر نافذ ہو گا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں فدک کے معاملہ میں آپ کے والدِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کروں گا۔

۲۔ ابن ابی الحدید کے کلام سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی شے دی اور نہ آپ کو راضی کیا، حالانکہ یہ سراسر بہتان ہے اور خلافِ واقع اور حقیقت ہے، جیسے کہ عرض کر چکا ہوں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ

کی ضمانت دیتا ہوں کہ میں اس تقسیم میں وہی طریقہ اختیار کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختیار فرماتے تھے اور تمہارے تمام اخراجات اور ضروریات کی اسی طرح کفالت کروں گا، جس طرح آپ کرتے تھے اور عملی طور پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تمام اخراجات کی کفالت کرتے رہے اور فدک کی آمدنی میں سے معقول حصّہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پیش کرتے رہے اور آپ قبول فرماتی رہیں۔ لہٰذا واضح ہو گیا کہ جس مروّت کا اظہار رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اسی مروّت کا آپ نے بھی فرمایا اور جس مروّت کا اظہار آپ نے نہیں فرمایا تھا، اُس مروّت کا اظہار خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں فرمایا تھا جس طرح کہ ذکر کیا جائے گا کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے فدک کا آپ سے مطالبہ کیا، لیکن آپ نے حوالے کرنے سے انکار فرما دیا۔ نیز یہ بھی ذکر ہو چکا کہ اس معاہدہ اور ضمانت کے بعد آپ راضی ہو گئیں۔ جب آپ کو راضی کر لیا، تو پھر بے مروتی کے الزام کا کیا جواز رہ گیا؟ اور مروّت و ہمدردی بلکہ اخلاص اور نیازمندی کا اس سے زیادہ مظاہرہ حدودِ شرع میں رہتے ہوئے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

۳۔ اگر آپ کے مطالبہ کے بعد مروّت اور ہمدردی صرف یہی تھی کہ آپ کو فدک دے دیا جاتا تو حضرت عبّاس رضی اللہ عنہ کے ساتھ مروّت کا تقاضا کیا تھا جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زندہ رہ جانے والا اپنا باپ فرمایا ھٰذا بقیّۃ آبائی۔ اور ان کو باپ کے ساتھ والی شاخ قرار دیتے ہوئے فرمایا، عم الرجل صنو ابیہ وھٰذا عمی وصنو ابی۔ جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے لیے رشتہ میں دادا جان تھے، لہٰذا آپ کو چاہیے تھا کہ ان کے وراثت کا حصّہ مانگتے پر نہ صرف یہ کہ ان کا حق اور حصّہ ان کو عنایت فرماتیں، بلکہ سارے باغات ہی ان کے سپرد فرما دیتیں۔ لہٰذا اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے اس جواب سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں بے مروتی ثابت نہیں ہوتی، تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ان اخلاص و نیازمندی پر مبنی جوابات سے کیونکر بے مروتی کا الزام

لازم آسکتا ہے؟ جو جواب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوسکتا ہے، وہی جواب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی ہوگا، بلکہ بطریقِ اولیٰ، کیونکہ باعترافِ شیعہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے پاس تو فدک کے علاوہ سات باغ موجود تھے، جبکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بھی نہیں تھا۔

۴۔ اسی قسم کا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بڑے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کی طرف سے پیش آیا تھا، جس کا نہج البلاغہ میں تفصیلی تذکرہ بایں الفاظ موجود ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، خدا کی قسم! اگر مجھے سعدان کے کانٹوں پر لیٹنا پڑے اور میرے گلے میں طوق، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر گھسیٹا جاؤں، تو وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے کہ میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں اس حال میں حاضری دوں کہ میں اس کے بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں اور ان کے حقوق غصب کرنے والا۔

پھر فرمایا، وَاللہ لقد رءیت عقیلا وقد املق حتی استماحنی من برکم صاعا ورءیت صبیانه شعث الشعور غبر الالوان من فقرهم (الی) فظن انی ابیعه دینی واتبع قیاده مفارقا طریقتی فاحمیت له حدیدة ثم ادنیتها من جسده لیعتبر بها الخ (نہج البلاغہ مع شرح ابن میثم جلد ۴، ص۸۳)

ترجمہ: اللہ کی قسم میں نے اپنے بھائی عقیل کو دیکھا، جبکہ وہ مفلس و فقیر ہوچکا تھا اور اُس نے مجھ سے تمہاری (بیت المال کی) گندم سے صرف ایک صاع (چار سیر کا پیمانہ) طلب کیا تھا اور میں نے اس کے بچوں کو دیکھا کہ وہ پراگندہ بال ہیں اور فقر و فاقہ کی وجہ سے زرد اور خاکستری رنگت والے ہیں، جب بار بار انہوں نے اصرار کیا اور اپنے مطالبہ کے پورے کیے جانے پر زور دیا، تو میں نے اپنا کان اُس کی طرف جھکایا۔ اُس نے گمان کیا کہ میں اپنا دین اُس کے ہاتھ بیچ دوں گا اور میں اپنی مہار اس کے ہاتھ میں دے کر اُس کے پیچھے چلوں گا، جبکہ میں اپنی راہ و روش کو چھوڑنے والا ہوں گا تو میں نے لوہے کا

ایک ٹکڑا گرم کر کے اس کے جسم کے قریب کیا تاکہ عبرت حاصل کرلے تو اس گرم ٹکڑے کے جسم سے مَس ہوتے ہی اس کی چیخ نکل گئی، تو میں نے اس سے کہا، تجھ پر رونے والی عورتیں روئیں، تو اس ایک ٹکڑے کے مس ہونے سے چلّا رہا ہے، جس کو ایک انسان نے مزاح اور مذاق کے طور پر گرم کر کے تیرے جسم کے قریب کیا۔ وتجرنی الیٰ نار سجرها جبارها لغضبه اتئن من الاذی ولا ائن من لظی اور تو مجھے اس آگ کی طرف کھینچتا ہے، جس کو اس کے مالک نے اپنا غضب ظاہر کرنے کے لیے بھڑکایا ہے۔ کیا تو اس تکلیف سے چلّا اٹھا ہے اور میں جہنم کی دھکتی آگ سے نہ چلاؤں اور نہ چیخوں (اور بیت المال میں ناحق تصرف سے اپنے آپ کو دُور نہ رکھوں)

واللہ لو اعطیت الاقالیم السبعة بما تحت افلاکها علیٰ ان اعصی اللہ فی نملة اسلبها جلب شعیرة ما فعلت وان دنیاکم عندی لاهون من ورقة فی فم جرادة تقضمها الخ

اللہ کی قسم! اگر مجھے ہفت اقلیم بھی دیئے جائیں بمع ان کے افلاک کے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، وہ سب کچھ دے دیا جائے، مگر اس شرط پر کہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں، چیونٹی کے منہ میں موجود جَو کے چھلکا کے متعلق بھی تو میں قطعاً و معمولی زیادتی روا رکھ کر اتنی عظیم سلطنت بھی لینے کے لیے تیار نہیں ہوں گا اور تمہاری یہ دنیا (اپنی تمام تر وسعت اور فراخی کے باوجود میری نظر میں پتے کے اس ٹکڑے سے بھی حقیر تر ہے جو مکڑی کے منہ میں ہو، جس کو وہ چبا رہی ہو

نہج البلاغہ کے اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ حضرت عقیل رضی اللہ عنہ جیسے بڑے بھائی کے بار بار اصرار کرنے پر بھی حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کی اولاد کی خستگی اور بدحالی کا مشاہدہ کرنے پر بھی صرف چار سیر گندم دینا گوارا نہ کیا۔ بلکہ اس تصرف کو جہنمی بننے کا سبب موجب قرار دیا اور اپنے بھائی کو لوہے کے گرم ٹکڑے کے ذریعے تکلیف و ایذا دے کر اور تپش و حرارت کا احساس دلا کر اپنی معذوری اور مجبوری ظاہر کر دی وغیرہ وغیرہ تو اس اقتباس سے ابن ابی الحدید اور اس کے

ہم مسلک اور دیگر غالیوں شیعوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور ان کی تنفیذ میں عظیم المرتبت اشخاص کی رورعایت کا وہم و گمان رکھنے والوں کے لیے اس میں تازیانہ عبرت ہونا چاہیئے۔ اگرچہ امید اس کی نہیں، کیونکہ شارح نہج البلاغۃ ہوتے ہوئے اور ایسے ارشادات ملاحظہ کرتے ہوئے بھی جس نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر بے مروتی کا الزام عائد کر دیا اور ان پر دین و ایمان کے تقاضوں کے برعکس عمل کرنے کا بہتان لگا دیا، تو ان کے عبرت حاصل کرنے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں (اقبال)

کیا یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف چار سیر گندم کا سوال تھا اور بیت المال کے اس معمولی مال کے حقداروں کو راضی بھی کیا جا سکتا تھا یا ان سے اجازت بھی تو لی جا سکتی تھی، لہٰذا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اگر دین و دیانت اور ایمان و امانت اس کی اجازت نہیں دیتے تھے، تو ان کی شانِ مروت اور رواداری و اخلاص اور ہمدردی تو اس بے پرواہی اور بے اعتنائی کی اجازت نہیں دے سکتی تھی، اور صلہ رحمی اور قرابت داری بہرحال اسی امر کی متقاضی تھی کہ انہیں محروم نہ رکھا جاتا۔ اگر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا اور نہ کسی نے آج تک کیا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کیسے ہو سکتا ہے جبکہ گندم تو جلد گل سڑ جانے والی شے تھی اور اس کے مستحق محدود تھے اور فدک قیامت تک برقرار رہنے والی جائیداد تھی اور قومی ملکیت ہونے کی وجہ سے قیامت تک پیدا ہونے والی نسلیں اس کی حقدار تھیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کس کس کو راضی کرتے اور کس کس سے اجازت لیتے اور اپنی عاقبت کو کیوں خطرات سے دوچار کرتے، بلکہ اگر حضرت زہراء رضی اللہ عنہا دوسروں کا حق لے لیتیں، تو وہ اپنے ابا جان کو کیا منہ دکھلاتیں، لہٰذا نہ صرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بلکہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی ارفع و اعلیٰ شان کا تقاضا تو یہ تھا کہ امت کے فقرا

حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی بھلائی بھی اسی میں تھی کہ اس مال کو اسی حال پر رکھا جاتا جس حال میں کہ وہ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا، بلکہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی ارفع و اعلیٰ شان کا تقاضا یہ تھا کہ امت کے فقراء و مساکین کی خاطر اپنا خالص حق بھی ان کے حوالے کر دیتیں نہ کہ ان کے حقوق کو ان کے ذرائع معاش اور اسباب کفالت کو اپنے لئے مخصوص ٹھہرا لیتیں اور امت پر ہر حال میں سب املاک اور قومی ملکیتیں ان کے حوالے کر دینی لازم ہو جاتیں۔

حضرت ام کلثوم بنتِ علی کا مرواریدی ہار بطورِ عاریت لینا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عتاب فرمانا

اسی ضمن میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا سلوک اپنی لختِ جگر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے بیت المال کے نگران و محافظ حضرت ابورافع اور بروایتے علی بن ابی رافع سے عید کے دن آرائش کی خاطر بیت المال میں موجود ایک مرواریدی ہار تین دن کے لیے ادھار طلب فرمایا۔ انہوں نے اپنی کی ضمانت حاصل کر کے اور گمشدگی کی صورت میں تاوان کی ادائیگی کا عہد لے کر وہ ہار ان کے حوالے فرما دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہار ان کے گلے میں دیکھ کر پہچان لیا اور دریافت فرمایا کہ یہ تمہارے پاس کیسے پہنچ گیا، تو انہوں نے صورتِ واقعہ عرض کی۔ آپ نے نگران کو بلا کر فرمایا: "آیا تو خیانت می کنی در بیت المال مسلمانان بے اذن و رضائے ایشاں گفتم پناہ بخدا می برم از آنکہ خیانت کنم در مال مسلمانان آنحضرت گفتند۔ پس چگونہ بعاریت دادہ بدخترِ من عقد مرواریدی راکہ در بیت المال بود۔" آیا تو خیانت کرتا ہے مسلمانوں کے بیت المال میں ان کی اجازت اور رضامندی کے بغیر، میں نے کہا کہ میں اللہ سے پناہ طلب کرتا ہوں اس سے کہ اہل اسلام کے مال میں خیانت کروں، تو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا تو پھر تو نے بطورِ عاریت میری بیٹی کو موتیوں کا ہار کیوں دیا ہے، جو بیت المال میں تھا؟

حضرت ابورافع نے عرض کیا، اے امیرالمومنین! تمہاری لختِ جگر نے مجھ سے بطورِ عاریت وہ ہار طلب فرمایا کہ عید کے دن اس کے ساتھ زینت و آرائش حاصل کریں اور میں نے ان سے واپسی کی ضمانت لے کر ان کے حوالے کیا ہے اور میں خود بھی اس کی واپسی یا تاوان کا خاص ضامن ہوں“ تو آپ نے فرمایا:

کہ امروز می باید آں را ازو باز پس گرفت و بجائے خود نہاد و اے بر تو اگر بعد ازیں چنیں کارے از تو ظاہر شود ترا عقوبت خواہم کرد و اگر دختر من آں عقد را نہ بر وجہ مضمونہ مردودہ می گرفت ہر آینہ او اول زن ہاشمی می بود دست اورا بدزدی بریدہ بودند ــــــ آج ہی وہ ہار ان سے واپس لے کر اپنی جگہ پر رکھ دو اور افسوس ہے تجھ پر اگر اس کے بعد تجھ سے ایسا فعل سرزد ہوا تو میں تجھے سزا دوں گا اور اگر میری بیٹی نے اس کو واپس کرنے کی ضمانت پر نہ لیا ہوتا تو وہ پہلی ہاشمیہ عورت ہوتی جس کا ہاتھ چوری کی وجہ سے کاٹ دیتے۔

جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس عتاب اور عزم و عقاب کا حضرت امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کو علم ہوا تو انہوں نے آپ سے عرض کیا:

من دخترِ تو ام و سزاوار تر از من کہ بپوشیدن آں عقد پس حضرت امیر باو گفتند اے دختر بواسطہ اشتہائے نفس خود از دائرہ حق بیروں مرو، مگر ہمہ زنانِ مہاجر در ایں عید بمثل ایں عقد مزیّن شدہ بودند کہ تو را نیز بالیستے بآں مزیّن شد۔

(مجالس المومنین مصنفہ نور اللہ شوستری جلد اوّل صفحہ ۲۵)

ترجمہ: میں آپ کی بچی ہوں اور مجھ سے زیادہ اس کو زیبِ تن کرنے کا حقدار کون تھا؟ تو حضرتِ امیر رضی اللہ عنہ نے ان کو فرمایا اے میری بیٹی! اپنے نفس کی خواہش کے تحت حق کے دائرہ سے باہر نہ نکلو، کیا سب مہاجر عورتوں نے اس عید میں اس طرح کے ہار زیبِ تن کر رکھے تھے کہ تمہیں بھی اس سے مزیّن ہونا چاہیے تھا۔

اس روایت اور صورتِ واقعہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد بھی ایسی مروتوں کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔ گندم حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کو دیتے تو وہ کھائی جاتی، لیکن ہار تو

نہ گھس رہا تھا، نہ ہی ہمیشہ کے لیے دیا گیا تھا، صرف بطورِ عاریت اور ادھار لیا تھا۔ اتنے بڑے غازیِ اسلام اور محسنِ ملت کی لختِ جگر محض تین دن کے لیے لیتی ہے تو دینے والا خیانت پیشہ قرار پاتا ہے اور بیٹی! خواہش نفس کے تحت دائرہ حق سے قدم باہر رکھنے والی قرار پاتی ہے تو حضرتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جس جائیداد کو بیت المال کا حصہ سمجھتے تھے، اس کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر کے خود بھی خیانت کے مرتکب قرار پاتے اور انہیں بھی دائرہ حق سے باہر نکالتے جس کی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے مخلص مومن اور کامل نیازمند سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

فدک کے ساتھ سخاوت کا دعویٰ

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے کہ ان عالی ظرف، بلند حوصلہ اور اربابِ جود و سخا کے شایانِ شان کونسا امر ہے، بلیٰ کانت فی ایدینا فدك من كل ما اظلته السماء فشحت عليها نفوس قوم وسخت عنها نفوس قوم آخرين وما اصنع بفدك وغير فدك والنفس مظانها في غد جدث الخ (نہج البلاغۃ مع شرح حدیدی ص ۲۰۸ ج ۱۶ و ابن میثم ص ۹۹ ج ۵)

یعنی ہمارے ہاتھوں میں آسمان کی نچلی دنیا میں سے صرف فدک تھا، جس پر ایک قوم کے نفوس نے بخل و حرص کا مظاہرہ کیا تو دوسری قوم نے جود و سخا اور وسعتِ قلب و عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا اور میں فدک اور اس کے ماسوا کو کیا کروں اور وہ میرے کس کام، جبکہ مجھے کل کے متعلق بھی زندہ رہنے کا یقین نہیں، بلکہ قبر میں پہنچ جانے کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔

یہ ہے وہ عمل اور طریقِ کار جو اہل بیت کے شایانِ شان ہے اور امتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور ان کے رشد و ہدایت کے لیے مقتداؤں کے لائق طرزِ عمل، اگر ائمہ کرام اور مقتدایانِ انام ہی معمولی سی دنیاوی منفعت کی خاطر جنگ و جدال اور حرب و قتال پر اتر آئیں اور اُن کا غم و غصہ اور غیظ و غضب اُترنے پر نہ آئے“

تو وہ عام اہلِ اسلام سے توکل اور تبتل و انابت سے کام لینے کا مطالبہ کیسے کر سکتے ہیں اور دنیا کی حقارت و رذالت کو ان کے اذہان و قلوب میں کس طرح نقش کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کا حکیمانہ ارشاد حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے بھی آپ نے فرمایا اور ان کو قناعت و توکل کا درس دیا، جبکہ بقولِ شیعہ آپ دربارِ صدیقی سے واپس جا کر ان پر برس پڑیں اور بہت سخت و سست کہا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

نہنهی عن وجدك یا ابنة الصفوة وبقیة النبوة فما ونیت عن دینی ولا اخطأت مقدوری فان کنت تریدین البلغة فرزقك مضمون وکفیلك مامون وما اعدلك افضل مما قطع عنك فاحتسبی الله فقالت حسبی الله وامسکت۔ (الاحتجاج طبرسی ص ۱۰۸)

اپنا غم و غصہ جانے دیجیے اے خلاصۂ موجودات کی لختِ جگر اور آخر الزماں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نورِ نظر، میں نے اپنے دین میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ اپنے مقدور جدّ و جہد اور سعی میں خطا کی ہے۔ اگر تم (حصولِ فدک کے ذریعے) اپنی ضروریات اور اخراجات تک رسائی اور کفالت کا ارادہ رکھتی ہو تو تمہارے رزق کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت دی جا چکی ہے اور تمہارا کفیل اور ضامن لائقِ اعتماد اور صاحبِ امانت ہے اور جو کچھ تمہارے لیے آخرت میں تیار کیا جا چکا ہے، وہ اس سے بہت بہتر ہے، جو تم سے قطع کیا گیا ہے لہٰذا اس معاملہ میں صبر کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھو اور جزع و فزع سے باز رہو، تو آپ نے فرمایا، مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور آپ نے غم و غصہ اور پریشانی و اضطراب کا اظہار بند کر دیا۔

کیا یہ مقامِ تعجب اور محلِ حیرت نہیں ہوگا کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی تو اسلام کی خاطر گھر بار، مال و اسباب اور خویش و اقربا قربان کر دیں اور جو کچھ پاس تھا، وہ سب کچھ لٹا دیں، مگر اس ہادیٔ برحق کی لختِ جگر اور قریب ترین

مقدس ہستیاں صرف اموال و امتعہ اور املاک و جائیداد یں سمیٹنے کے درپے ہوں۔ بالیقین کسی بھی اہل بیت کی عظمت کے قائل و معترف شخص کا ضمیر نہ اس وسوسہ کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان ہے۔

تعارض ہی تعارض

۱۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ تہذیب الاحکام من لا یحضرہ الفقیہ اور کافی کلینی کی روایاتِ صحاح میں بصراحت مذکور ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے زیرِ تصرف سات باغات تھے اور انہوں نے ان کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا اور پھر علی الترتیب حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لیے وصیت فرمائی لیکن نہج البلاغہ جیسی معتبر و مستند کتاب میں مرقوم ہے کہ آسمان کے نیچے کی وسیع و عریض دنیا میں سے آپ کے زیرِ تصرف صرف فدک تھا۔ اگر صحاحِ ثلاثہ والی روایات صحیح ہیں، تو یہ غلط ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو وہ غلط ہیں۔

۲۔ نہج البلاغہ کی عبارت سے یہ ثابت ہے کہ ہم نے فدک کے ساتھ سخاوت کر دی تھی اور عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے، تو ناراضگی اور قطعِ تعلقی اور ترکِ سلام و کلام کے افسانے غلط ہیں اور اگر وہ صحیح ہیں تو پھر نہج البلاغہ میں مرقوم خطباتِ مرتضویہ پر اعتماد و اعتبار کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

۳۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرمان پر اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے اللہ تعالیٰ کے ثواب اور اجر کو حاصل کرنے کے لیے صبر سے کام لیا تھا تو پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر تا زیست ناراضگی اور بائیکاٹ جاری رکھنے اور جنازہ کی نماز میں شامل ہونے سے روکنے کے افسانے بے بنیاد ہیں اور اگر وہ صحیح ہیں، تو علامہ طبرسی کا درج کردہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ اور ارشاد ناقابلِ اعتبار ہو گیا اور صرف اس جگہ نہیں، بلکہ ہر جگہ شیعی روایات تعارض و تضاد کا ہی نمونہ ہیں اور کیوں نہ ہو دروغ بافی اور کذب بیانی کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد"

کیا یہ سوال لاجواب تھا؟

آپ نے ابن ابی الحدید کا دعوائے باطل ملاحظہ کیا تھا کہ اس سوال کا جواب نہیں بن سکتا، تو ہماری ان گزارشات کو ملاحظہ کرنے کے بعد ترازوئے انصاف و عدالت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خود ہی اپنے دین و دیانت اور ایمان و امانت کے مطابق فیصلہ کریں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا گھر حاضر کر دیا۔ اخراجات کی کفالت کا عہد کیا اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو راضی کرنے کی ہر امکانی کوشش کی، حتیٰ کہ آپ کو راضی کر لیا، تو اس کے علاوہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کس مروت کا مظاہرہ کرتے، جبکہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ معاملہ اور سلوک بھی تمہارے سامنے ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اپنے دورِ خلافت کا عمل بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صدق و اخلاص پر مہرِ تصدیق ہے۔

تائید مزید کے طور پر حضرت زید بن زین العابدین رضی اللہ عنہما کے ارشاد کی طرف توجہ فرماویں جو آپ نے میدانِ کارزار میں تلواروں کی چھاؤں میں تیروں کی بارش اور نیزوں کی نوکوں کے سامنے برملا اور برسرِ عام یہ اعلان فرمایا اور چالیس ہزار افراد میں سے صرف پانچ سو باقی رہ گئے اور دوسرے سبھی الگ ہو گئے، لیکن حسین رضی اللہ عنہ کے غیور خمیر سے پیدا ہونے والے اس عظیم و جلیل امام نے حضرات شیخین کی عظمت و جلالت اور علو مرتبت و فضیلت اور کتاب و سنت کی مطابقت و متابعت کو ببانگِ دہل بیان کیا اور فرمایا؛

۱۔ در حقِ ایشاں جز بسخن خیر نمی گویم و از اہل خویش نیز در حقِ ایشاں جز بسخن خیر نشنیدہ ام و بالجملہ زید فرمود ایشاں بکتابِ خدا و سنتِ رسول کار کردند و بر کسے ظلم و ستم نراندند (ناسخ التواریخ جلد دوم از کتاب دوم صفحہ ۵۹)

یعنی میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں سوائے خیر اور بھلائی کے کلام نہیں کرتا اور اپنے اہل بیت اور آباؤ اجداد سے بھی ان کے حق میں سوائے خیر اور بھلائی کے

کلمات کے کبھی کچھ نہیں سنا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں حضرات نے کتابِ خدا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کیا اور کسی شخص پر ظلم و ستم نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے یہ سوال کیا تھا، وہ ان کے حق میں ظلم اور غصب کی بدظنی میں مبتلا تھے، لیکن فرزندِ رسول نے برسرِ دار ان حضرات کی برأت بیان کی اور ان سے ہر قسم کے ظلم و ستم اور جور و استبداد کی نفی کر دی۔ اگر فی الواقع ایسا کوئی غلط اقدام ان کی طرف سے ہو چکا ہوتا تو آپ اس کا اعلان کر کے اپنے لشکر کو مطمئن کر سکتے تھے، ان کی امداد و اعانت سے بھی مستفید ہو سکتے تھے اور اپنی جان بھی بچا سکتے تھے، لہٰذا حضرت زید رضی اللہ عنہ کے اس جواب سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ان حضرات کا دامن اس قسم کے سوءِ ظن اور بدگمانیوں اور غلط بیانیوں کی آلودگی اور آلائش سے پاک تھا اور بے داغ و بے غبار، اسی لیے فرزندِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی ایسے موقعہ پر بھی برأت بیان کرنا ضروری سمجھی جبکہ خود ان کی جان خطرات میں گھری ہوئی تھی۔

۲۔ حضرت زید بن زین العابدین رضی اللہ عنہ کا ایک اور ارشاد ملاحظہ فرماویں جس کو ابن ابی الحدید نے ابوبکر احمد بن عبدالعزیز الجوہری کی کتاب سے نقل کیا ہے کہ بحتری بن حسان نے حضرت زید بن زین العابدین رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ میں ابوبکر کی توہین کرنا چاہتا ہوں اور ان کے اس اقدام کی مذمت کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے فدک چھین لیا تھا، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

ان ابا بکر کان رجلاً رحیما و کان یکرہ ان یغیر شیئا فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الیٰ)، و ایم اللہ لو رجع الی لقضیت فیھا بقضاء ابی بکر۔ (شرح حدیدی جلد ۱۶، صفحہ ۲۲۰)

بے شک ابوبکر رحیم و کریم آدمی تھے (لہٰذا وہ غصب کے روادار کیونکر ہو سکتے تھے) وہ اس امر کو پسند نہیں کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل و کردار میں تبدیلی کریں (تا)، اور اللہ کی قسم اگر وہ معاملہ میرے پاس بھی پہنچتا، تو میں وہی فیصلہ کرتا جو ابوبکر نے

کیا تھا۔ رضی اللہ عنہ و عنہ۔

امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی تائید و تصدیق

اسی طرح کا سوال حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے بھی کیا گیا، جس قسم کا سوال حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تھا اور آپ نے بھی بالکل ویسا ہی جواب عطا فرما کر حضرت صدیق اور فاروق رضی اللہ عنہما کی برأت بیان فرمائی۔

عن كثير النوال قلت لابي جعفر محمد بن علي جعلني الله فداك ارأيت ابا بكر وعمر هل ظلما كم من حقكم شيئا فقال لا والذي انزل القرآن على عبده ليكون للعالمين نذيرا ما ظلمانا من حقنا مثقال حبة من خردل قلت جعلت فداءك افاتولاهما قال نعم ويحك تولهما في الدنيا والآخرة وما اصابك ففي عنقي ثم قال فعل الله بالمغيرة وبنان فانهما كذبا علينا اهل البيت (شرح حدیدی ج ۲ ص ۲۲) یعنی کثیر النوال سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابو جعفر محمد بن علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا، اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر فدا فرمائے، یہ تو فرمایئے کہ ابوبکر و عمر نے تمہارے حق میں کسی قسم کی تعدی یا زیادتی اور جور و ظلم کیا ہے، تو انہوں نے فرمایا نہیں، مجھے اس ذاتِ اقدس کی قسم ہے، جس نے اپنے عبد خاص پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ سب اہل جہان کے لیے نذیر ہوں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں۔ ان دونوں حضرات نے ہم اہل بیت کے حق میں رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم و تعدی سے کام نہیں لیا۔ میں نے عرض کیا میں آپ پر قربان کیا جاؤں۔ کیا میں ان دونوں سے محبت رکھوں؟ آپ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے ان دونوں سے دنیا و آخرت میں دوستی اور قلبی عقیدت و محبت رکھ اور اگر تجھے ان کی محبت و اُلفت سے کوئی ضرر اور نقصان لاحق ہوا تو وہ میری گردن پر ہوگا اور میں اس کا ضامن ہوں گا۔

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ مغیرہ اور بنان پر لعنت کرے اور انہیں تباہ و برباد کرے، ان دونوں نے ہم اہل بیت پر بہتان باندھے اور ہماری طرف جھوٹی روایات منسوب کیں اور قبل ازیں رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم، علی مرتضیٰ، عبد اللہ بن عباس وغیرہم کے ارشادات بھی ملاحظہ کر چکے اور اب ان اہل بیت کے اکابرین کا نظریہ معلوم ہو جانے کے بعد اور ان کا حضراتِ شیخین کے ساتھ قلبی تعلق معلوم ہونے کے بعد بلکہ ان کی طرف سے شیخین کی محبت و اُلفت کا حکم دینے کے بعد اور ہر قسم کے اُخروی مؤاخذہ اور عذاب و عتاب سے تحفظ کی ضمانت فراہم کرنے کے بعد بھی صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے دامن پر کسی آلودگی اور آلائش کا وہم و گمان کیا جا سکتا ہے اور ان حضرات کی محبت و عقیدت سے کسی مومن کا قلب و جگر خالی رہ سکتا ہے، جبکہ حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ جیسی ہستی نے ان مذہبی چوروں ڈاکوؤں اور بہتان تراش اور افترا پرداز یہودیوں اور مجوسیوں کی نشاندہی بھی کر دی ہو تو پھر ایسے الزامات عائد کرنے والے مذہب اہل بیت اور دین مرتضیٰ اور دین باقر و جعفر پر ہونے کا قطعاً دعویٰ نہیں کر سکتے، بلکہ صرف اور صرف مغیرہ و بنان جیسے کذابوں کے دین و مذہب پر ہونے کا ہی دعویٰ کر سکتے ہیں، کیونکہ جب اکابرین اہل بیت کو اور حق فدک یا حق خلافت کے مفروض حقداروں کو ان پر اعتراض نہیں ہے، تو ہمیں ان پر تنقید اور اعتراضات کا کیا حق پہنچتا ہے اور ان کی تحقیر و توہین کی جرأت و جسارت کیسے کر سکتے ہیں اور ان معاملات کو اچھالنے اور شور و شر پیدا کرنے کا کیا حق ہے؟ اللّٰھم ارزقنا حبك وحب حبيبك وحب آله واصحابه اجمعين۔

تنزیہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

مسئلہ فدک کا اجمالی بیان

حضرات! حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے فدک کے متعلق ارشادات ملاحظہ

فرمالیے اور بطورِ تتمہ ہماری گزارشات بھی، تو اب علامہ ڈھکو صاحب کے جوابات ملاحظہ ہوں : ۱- مؤلف کی حالت بھی عجیب ہے کہ بغیر ربط و ارتباط کے کبھی کوئی مسئلہ چھیڑ دیتے ہیں اور کبھی کوئی مسئلہ۔

۲- جن مسائل پر فریقین کی طرف سے ضخیم اور مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ پیر صاحب انہیں چند سطروں میں حل کر دینا چاہتے ہیں۔

۳- پیر صاحب سیالوی نے مسئلہ فدک کے سلسلہ میں دو باتوں پر بہت زور دیا ہے۔ اوّل یہ کہ فدک از قسم انفال تھا نہ از قسم فئ اور انفال کا حکم یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیاتِ طیبہ میں اس کے واحد مالک تھے اور آپ کے بعد جو امام ہوگا، وہی مالک ہوگا، جس طرح چاہے اُس کو خرچ کرے۔

دوسرا یہ کہ فدک کے متعلق جتنی روایات ہیں ان کا راوی ابن شہاب زہری ہے، جو کہ شیعہ تھا، لہذا یہ روایات ناقابلِ قبول ہیں۔

۴- یہ امر تو طے شدہ ہے کہ فدک مالِ غنیمت کے قسم سے نہیں تھا جس میں تمام اہلِ اسلام شریک ہوتے اور جب یہ تسلیم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے واحد مالک تھے، تو ہم بانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسی حق کو استعمال کرتے ہوئے باغِ فدک حضرت زہراء (رضی اللہ عنہا) کو دے دیا تھا یعنی ہبہ کر دیا تھا اور وثیقہ بھی لکھ دیا تھا۔ چنانچہ جب آیتِ کریمہ، وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ۔ یعنی اپنے قرابت داروں کو اُن کا حق دے دو، تو آپ نے حضرت زہرا (رضی اللہ عنہا) کو بُلا کر فدک ان کے حوالے کر دیا۔

۵- حضرت زہراء (رضی اللہ عنہا) نے پہلے ہبہ کا دعویٰ کیا، مگر جب دربارِ خلافت سے گواہوں کا مطالبہ ہوا، تو آپ نے حضرت علی، حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اور ام ایمن لونڈی کو بطورِ گواہ پیش کیا، مگر تاریخِ اسلام کا یہ المناک واقعہ ہے کہ ان بزرگواروں کی شہادت کی رد کر دیا گیا، تب خاتونِ جنت (رضی اللہ عنہا) نے اپنے دعوے کا عنوان بدل کر فرمایا از روئے قانونِ وراثت دے دو اور یہ میرا حق ہے، جو

مجھے ملنا چاہیئے، مگر افسوس کہ حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں نے خود ساختہ حدیث کے ذریعے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو فدک سے کوئی چیز دینے سے انکار کر دیا

۶- حضرت زہراء (رضی اللہ عنہا) نے آیات پڑھ پڑھ کر اپنا حق ثابت کیا مگر اس کے جواب میں صرف ایک حدیث پیش کی گئی اور فدک دینے سے انکار کر دیا گیا، جس کا اثر حضرت زہرا (رضی اللہ عنہا) پر یہ ہوا کہ آپ نے مکمل بائیکاٹ کر دیا اور وصیت فرمائی ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) میرے جنازے میں شامل نہ ہوں۔

۷- بخاری ومسلم کی روایات سے عیاں ہے کہ حضرت زہرا (رضی اللہ عنہا) کی ایذاء اور ناراضگی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ایذاء ہے اور ان کی ناراضگی کی موجب ہے اور ان دونوں کی ناراضگی کا حکم قرآن مجید میں یُوں بیان کیا گیا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ آج اگر پیر صاحب ان حقائق پر پردہ ڈالیں، تو یہ ناممکن ہے۔ (رسالہ تنزیہ الامامیہ ص۱۶۶ تا ص۱۶۸)

نوٹ: مندرجہ بالا آیتِ کریمہ ڈھکو صاحب کے رسالہ میں یُوں لکھی ہوئی ہے، ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعلھم اللہ۔ تو کیا علامہ موصوف کے اس طرز و طریق کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے علامہ ڈھکو صاحب کی قرآن دانی پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم تو علامہ موصوف سے تمام تر اختلاف کے باوجود اسی حُسنِ ظن سے کام لیں گے کہ وہ اتنے جاہل و بے خبر بھی نہیں کہ انہیں یہ آیت معلوم نہ ہو، بلکہ یہ کاتب کی لاعلمی اور کتابت کی غلطی ہے، تو کیا علامہ موصوف بھی حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے متعلق اسی طرح کے حُسنِ ظن سے کام لے سکتے ہیں اور اسی قسم کی دیانت و امانت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں؟ قطعاً نہیں کیونکہ ضمیر و خمیر کے بھی کچھ تقاضے ہوا کرتے ہیں۔

ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی غفرلہٗ

تحفۂ حسینیہ

علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب کے جوابات کا مطالعہ کر لینے کے بعد اب جوابات ملاحظہ فرماویں اور انصاف و دیانت کے تحت خود ہی فیصلہ فرمادیں کہ حق و صداقت کس

طرف ہے اور یہ بھی دیکھیں کہ علماءِ شیعہ کے پاس شاعرانہ تخیّل اور لفّاظی کے سوا کیا ہے؟

جواب الاوّل: پہلے جواب کا تعلق رسالہ "مذہبِ شیعہ" میں مذکور مسائل اور ان کے باہمی ربط و تعلّق سے ہے، جس پر ہم نے کلمۃ التقدیم میں تفصیل سے گفتگو کر دی ہے، لہٰذا وہاں پر ملاحظہ فرماویں۔ مختصر یہ کہ پہلے حضرات خلفاء کے مناقب بیان کیے پھر ان کے مثالب کا جواب دیا تاکہ ان کے دامنِ عظمت پر اڑائی گئی یہ گرد و غبار لوگوں کی نظروں سے چھٹ جائے اور آفتابِ حقیقت کھُل کر سامنے آجائے۔

جواب الثانی: دوسرے جواب کا حاصل یہ تھا کہ جب فریقین کی مستقل اور ضخیم کتابوں سے مسئلہ فدک حل نہیں ہو سکا، تو پیر صاحب چند سطروں میں اس کو کس طرح حل کر سکتے ہیں؟ مگر اس جواب میں کوئی وزن نہیں، کیونکہ مسئلہ کو حل کرنے کی نیت ہو اور اہلِ اسلام کے باہمی اختلافات سے پہنچنے والے نقصانات کا احساس ہو اور باہمی اتحاد و اتفاق کی اہمیت و ضرورت پیشِ نظر ہو اور انفرادی منفعت کو قربان کرنے کا جذبہ دل میں بیدار ہو جائے تو واقعی چند سطروں بلکہ ایک جملہ میں ہی یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے، لیکن ؎ تم ہی اگر نہ چاہو تو باتیں ہزار ہیں

اس ضمن میں درج ذیل جملوں پر غور کر لیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک جملہ رفعِ نزاع اور دفعِ خصومت کے لیے کافی ثابت ہو:

(۱) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل اور روش و رفتار اپنے دورِ حکومت و خلافت کیا تھی (۲) کیا آپ نے خلفاء سابقین کے جور و ظلم کو برقرار رکھا اور ان کے ساتھ حصّہ دار بن گئے۔ (۳) کیا فدک وغیرہ کی سابقہ حیثیت صرف خلفاء سابقین کے معتقدین کو خوش رکھنے اور ہمنوا بنائے رکھنے کے لیے برقرار رکھی؟ (۴) کیا خلیفۂ وقت پر حقداروں کو ان کا حق مہیّا کرنا لازم ہے یا نہیں؟؟ (۵) کیا امارت و خلافت حاصل ہونے پر بھی صحیح اسلامی احکام نافذ نہ کرنے والا عند اللہ مجرم ہے یا نہیں؟ (۶) اپنی دنیوی عزّت و آبرو اور حکومت و سلطنت والے اعزاز و افتخار کو برقرار رکھنے کی خاطر اُخروی گرفت اور مؤاخذہ کو نظر انداز کیا جا سکتا

ہے؟ (۷) کیا حضرات حسنین کریمین اور اُن کی ہمشیرگان نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہما کے ترکہ و وراثہ سے اپنا حصّہ اور استحقاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہبہ کر دیا تھا؟ (۸) حضرت عمر بن عبد العزیز نے بقولِ شیعہ فدک واپس کر دیا تھا، تو وہ واپس کیوں لیا گیا تھا، جبکہ اس پر سے اپنا استحقاق ختم کر دیا گیا تھا؟ (۹) حضرت عمر بن عبد العزیز نے فدک واپس کر دیا تو کیا ان کو خلافت ختم ہونے کا اندیشہ نہیں تھا، صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی اندیشہ تھا؟ (۱۰) اگر مغصوب شے اہلِ بیت واپس نہیں لیتے تھے، تو خلافت کیوں لے لی وغیرِ ذالک (۱۱) فدک حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد حق امام ہے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ امام المسلمین اور حاکمِ اسلام تھے۔ کما ذکر شیخ الاسلام قدس سرہ ــــــــ الغرض دیانتداری سے ایک ہی جملے میں غور و خوض کرنے سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے ؎

اگر در خانہ کس است، یک نکتہ بس است

جواب الثالث والرابع: علامہ صاحب نے کہا کہ پیر صاحب سیالوی کے اعتراف کے مطابق حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے واحد مالک تھے اور آپ کے بعد جو امام و خلیفہ ہوگا، وہی اُس کا مالک ہوگا، جبکہ یہ بھی مسلّم کہ یہ مالِ غنیمت کے قسم سے نہیں تھا تاکہ سب اہلِ اسلام اس میں شریک ہوتے، لہٰذا ہم ببانگِ دہل کہتے ہیں کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا یہی حق استعمال کرتے ہوئے فدک حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تھا، لیکن یہ جواب بوجوہ غلط ہے اور ناقابلِ اعتبار و اعتداد۔

ا: پیر صاحب سیالوی نے شیعی کتب کا حوالہ دے کر شیعی نقطہ نظر بیان کیا تھا کہ فدک ظاہری زندگی میں آپ کا حق تھا اور آپ کے بعد جو امام و خلیفہ بنا، اس کا حق تھا۔ اب اس کو پیر صاحب کا نظریہ و عندیہ قرار دینا سراسر غلط ہے، وہ تو شیعی عندیہ بیان فرما رہے تھے۔

ب: علاوہ ازیں اگر فدک پر خصوصی حق کو استعمال کرتے ہوئے آپ نے اس کو

حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا تھا، تو حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ روایت لغو اور باطل ٹھہری، کیونکہ بقولِ شیعہ امام حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، لہٰذا ان کو ملنا چاہیے اور بقولِ اہل السنت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امام و خلیفہ تھے، لہٰذا ان کو ملنا چاہیے تھا، لیکن ان کی بجائے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو عطا ہو گیا، تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے چوتھی پشت میں پیدا ہونے والے فرزند ارجمند کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور کردار کے خلاف یہ استحقاق بیان کرنے کا کیا حق تھا؟ جبکہ حضرت فاطمہ زہراءؓ رضی اللہ عنہا کی امامت کا کوئی فریق بھی قائل نہیں ہے، تو گویا جعفریوں نے اپنے امام کے قول کو ہی رد کر دیا۔

۲۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فدک کی انتظامی حیثیت واضح کر کے بتلا دیا کہ وہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہیں تھا، ورنہ اس میں وراثت جاری ہوتی، نہ کہ آپ کے بعد آنے والے امام اور خلیفہ کو اس میں تصرف کا حق حاصل ہوتا، لہٰذا علامہ موصوف نے اپنے مذہب کی مستند و معتبر کتاب میں امام عالی مقام حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے مندرج فرمان کو مہمل اور بے مغز بنانے کی ناکام کوشش کی ہے اور سراسر تلبیس اور دھوکہ بازی سے کام لیا ہے، جبکہ اس روایت کا صریح اور متبادر معنی و مفہوم یہی ہے کہ فدک اور جملہ اقسام انفال قومی ملکیت کے قسم سے ہیں اور حاکمِ وقت اس میں تصرف کرنے کا مالک ہو گا اور مصالح اہل اسلام میں خرچ کرنے کا جیسے کہ مالِ وقف کے متولی کا اس میں حق تصرف بھی ثابت ہوتا ہے، لیکن ذاتی ملکیت بھی نہیں ہوتی کہ جس کو چاہے اس جائیداد کا مالک بنا دے۔ اگر یہ صورت جائز ہوتی تو پھر حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے اس فرمان ثم للامام بعدہ یضعہ حیث یشاء کا کیا معنیٰ رہ گیا، کیونکہ جب پہلا امام اور متولی جائیداد کا وجود ہی باقی نہ رکھے، اسے بیچ دے یا ہبہ کر دے، تو دوسرے کے لیے تصرف کہاں سے ثابت

ہو سکے گا اور روایات کو ان کے صریح اور متبادر مفہوم سے بغیر کسی قطعی صارف کے پھیرنا اور تبدیل کرنا قطعی درست نہیں ہوتا۔

۳۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علماء شیعہ نے ابھی تک یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تصرف قومی ملکیت سے تعلق رکھنے والے اموال بھی تھے اور آپ ان سے مجاہدین کی ضروریات اور آلاتِ جہاد اور سواریوں کی خریداری فرماتے تھے اور فقراء و مساکین پر اور وفود و اضیاف پر خرچ فرماتے تھے وہ ہر شے کی طرف صرف ذاتی ملکیت کے آئینہ ہی میں دیکھتے ہیں اور قبل ازیں بیان ہو چکا کہ فدک سے ازواجِ مطہرات اور دیگر اہل بیت کرام کے اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ آپ اس سے جہاد کی تیاری میں مدد لیتے تھے اور اسی طریقہ مصطفوی کو اپنانے کا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عہد کیا اور آپ ان پر راضی ہو گئیں اور آپ کے ساتھ ان اموال کے مختص ہونے کا صرف یہ مفہوم ہے کہ مالِ غنیمت کی طرح مجاہدین کا اس میں حق نہیں، لہٰذا علامہ موصوف نے جو جواب ببانگِ دہل دیا، وہ ڈھول کی طرح کھوکھلا اور بے مغز ہے اور اسی کی طرح شور و شغب، اس کو ان کی مذہبی روایات جو شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر کی تھیں، ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴۔ علامہ صاحب نے دعویٰ کیا کہ جب آیت مبارکہ آتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ نازل ہوئی، تو آپ نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو بلا کر فدک ان کو ہبہ کر دیا تھا اور وثیقہ لکھ دیا تھا، لیکن فدک کا ہبہ کیا جانا اور آیتِ کریمہ کے اس کے ہبہ کرانے کے لیے نازل کیا جانا دونوں باتیں سراسر غلط اور خلافِ واقع ہیں۔

کیا فدک حضرت زہرا کو ہبہ کیا گیا تھا؟

۱۔ فدک کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو ہبہ کیا جانا محض دعویٰ ہے اور واقعات کی رُو سے قطعاً اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ابن میثم بحرانی کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ کے ہبہ والے دعویٰ کے جواب میں فرمایا کہ تم

نے بھی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور امِ ایمن نے بھی سچ کہا اور حضرتِ عمر اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہما نے بھی سچ کہا۔ صورتِ حال واقعی یہ تھی کہ،

کان رسول اللہ یاخذ قوتکم ویقسم الباقی ویحمل منہ فی سبیل اللہ ولک علیّ اللہ ان اصنع کما کان یصنع فرضیت بذالک الخ (شرح ابن میثم بحرانی ص۱۰۷ ج ۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری روزی اور گزران کے مطابق اس سے لے کر تمہارے حوالے کرتے تھے اور باقی کو تقسیم فرما دیتے تھے اور اسی سے راہِ خدا اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سواریوں کا بندوبست فرماتے تھے اور میں آپ کو اللہ ضامن دیتا ہوں کہ میں بھی اسی طرح اس کو تقسیم کروں گا جیسے کہ آپ تقسیم فرماتے تھے، تو آپ اس پر راضی ہوگئیں ـــــ جس سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ اسے ہبہ سمجھنا محض اس وجہ سے تھا کہ اس سے ضروریات کی کفالت ہوتی تھی اور حقیقتِ حال واضح ہونے پر ہبہ کا دعویٰ آپ نے ترک فرما دیا۔

نیز اگر ہبہ ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس میں اس طرح کے تصرف فرمانے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی کہ آپ کی اجازت کے بغیر اس سے جہاد کے لیے ضروری اسباب و آلات خریدتے اور دیگر مصارف میں خرچ فرماتے، یہ تصرف اور تقسیم مقاصدِ ہبہ کے سراسر خلاف ہے۔

۲- اسی مضمون کی متعدد روایات بخاری شریف، مسلم شریف اور دیگر صحاح میں موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک کو اپنے تصرف میں رکھا ہوا تھا بلکہ یہ تصریح بھی موجود ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے مطالبہ کے باوجود آپ نے فدک ان کے حوالے نہیں کیا تھا۔

(۱) عن مالک بن اوس بن الحدثان قال کان فیما احتج بہ عمر ان قال کانت لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث صفایا بنو النضیر وخیبر وفدک فاما بنو النضیر فکانت حبسا لنوائبہ واما فدک فکانت حبسا لابناء السبیل واما خیبر فجزأھا رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثۃ اجزاء جزاین بین المسلمین وجزء نفقۃ لاھلہ فما فضل عن نفقۃ اھلہ جعلہ بین فقراء المھاجرین۔ رواہ ابوداؤد)

حضرت مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اموال فیئ تقسیم کرکے ان کے حوالے کرنے اور باہمی اختلاف ختم کرانے کے مطالبہ پر) ان پر حجت قائم کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین مخصوص اموال تھے بنو النضیر کا علاقہ خیبر اور فدک۔ بنو النضیر والا علاقہ اپنے ضروریات کے لیے مخصوص تھا اور فدک مسافروں کی ضروریات کے لیے مختص تھا، لیکن خیبر کے تین حصے کر دیتے تھے، جن میں سے دو اہلِ اسلام کے درمیان تقسیم ہوتے تھے اور ایک تہائی اپنے اہل کے اخراجات کے لیے مخصوص تھا، تو اس میں سے جتنا قدر بچ جاتا اسے فقراء مہاجرین کے درمیان تقسیم فرماتے تھے۔

ب: قالت وکانت فاطمۃ تسئال ابابکر نصیبھا مما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خیبر وفدک وصدقتہ بالمدینۃ فابی ابوبکر علیھا وقال لست تارکا شیئا کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل بہ الا انی عملت فانی اخشی ان ترکت شیئا من امرہ ان ازیغ۔ (بخاری شریف باب فرض الخمس جلد اول ص۴۳۵) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا تھا، ان اموال سے جو رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے تھے یعنی خیبر، فدک اور مدینہ منورہ میں صدقاتِ نبویہ تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انکار کیا اور کہا میں اس عمل کو ترک نہیں کرسکتا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، بلکہ میں بھی اسی طرح کروں گا، کیونکہ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اگر میں حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے ذرہ بھر بھی ترک کروں گا، تو میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں گا۔

ج۔ فکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینفق علیٰ اھلہ نفقۃ سنتھم من ھٰذا المال ثم یاخذ مابقی فیجعلہ مجعل مال اللہ فعمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذالک حیاتہ انشدکم باللہ ھل تعلمون ذالک قالوا نعم ثم قال لعلی وعباس انشدکما باللہ ھل تعلمان ذالک قال عمر ثم توفی اللہ نبیّہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ابوبکر انا ولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقبضھا ابوبکر فعمل فیھا بما عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ یعلم انہ فیھا لصادق بار راشد تابع للحق الحدیث۔

(بخاری شریف، ج ۱، ص ۴۳۶) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مال فیئ (فدک اور بنو نضیر اور خیبر) سے اپنے اہل کو سال بھر کا خرچ عطا کرتے تھے۔ پھر جو بچ جاتا اس کو اللہ تعالیٰ کے مال کی جگہ صرف فرماتے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اسی طریقہ پر اپنی ساری زندگی میں، میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے نام کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، کیا تم اس کو جانتے ہو، تو انہوں نے (حضرت عثمان، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: ہاں! پھر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا، "میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے نام کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم دونوں اس کو جانتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فوت کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ولی امر اور خلیفہ ہوں، تو آپ نے اس کو اپنے قبضے میں لیا۔ پس اس میں وہی روش اختیار فرمائی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنائی تھی اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس روش و رفتار اور عمل و کردار میں البتہ سچے محسن، راست رو اور حق کے تابعدار تھے الخ

ان تینوں روایات کو غور سے پڑھیں تو بالکل واضح ہوتا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ظاہری حیاتِ طیبہ میں فدک کو دوسرے اموالِ فیئ کی طرح اپنے قبضہ و تصرف میں رکھا ہوا تھا اور اس کی آمدنی کو اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کرتے تھے اور اس حقیقت کا اعتراف ان چھ حضرات نے بھی فرمایا، لہٰذا ہبہ کر دینے اور حوالے کر دینے کا دعویٰ ان حقائق کی رو سے قطعاً غلط ہے۔

ف: تیسری روایت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے فدک پر متصرف اور قابض ہونے کی بھی وہی دلیل بیان کی گئی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے کافی کلینی کے حوالے سے ذکر کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ثم للامام بعدہ یضعہ حیث یشاء کہ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ مال امام اور خلیفہ کے زیرِ تصرف ہوگا، وہ اس کو اپنی صوابدید کے مطابق اہلِ اسلام کے مصالح اور ضروریات میں استعمال کرے گا، لہٰذا شیعہ و اہل سنت کی مستند ترین کتب اور معتمد ترین شخصیتوں کے اقوال سے فدک کے ہبہ ہونے کی بھی نفی ہو گئی اور اس کے ذاتی جاگیر و جائیداد ہونے کی نفی واضح ہو گئی، تو جب کوئی اس کی ذات کا مالک ہی نہ ہو، بلکہ صرف اس کے محاصل کو مصالح عباد میں صرف کرنے کا مختار ہو تو وہ اس کا کسی دوسرے شخص کو از روئے شرع مالک بنا ہی نہیں سکتا، چہ جائیکہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شریعت کا خلاف کریں اور پھر اپنی لختِ جگر کے لئے۔ العیاذ باللہ

د۔ اسی ضمن میں مزید تصریح ملاحظہ فرماتے چلیں کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا نے تملیکِ فدک اور اس کے ہبہ کا مطالبہ کیا، لیکن آپ نے انکار فرما دیا۔

عن المغیرۃ بن شعبۃ قال ان عمر بن عبدالعزیز حین استخلف جمع بنی مروان فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت لہ فدک فکان ینفق منھا ویعود علی صغیر بنی ھاشم ویزوج منھا ایمھم وان فاطمۃ سألتہ ان یجعلھا لھا فابیٰ فکانت کذالک فی حیوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی مضیٰ لسبیلہ فلمّا

ان ولی ابوبکر عمل فیھا بما عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حیاته حتیٰ مضیٰ لسبیله فلما ان ولی عمر بن الخطاب عمل فیھا بما عملا حتیٰ مضیٰ لسبیله ثم اقطعھا مروان ثم صارت لعمر بن عبد العزیز فرأیت امرًا منعه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فاطمة لیس لی فیھا بحق وانی اشھد کم انی رددتھا علیٰ ما کانت علیٰ عھد رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وصحبه وسلم وعھد ابی بکر وعمر رضی اللہ عنھما رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ باب الفیئ)

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے بنو مروان کو جمع کیا اور فرمایا کہ فدک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرّف میں تھا اور آپ اس سے ازواجِ مطہرات اور اہل وعیال پر خرچ فرماتے تھے۔ نیز بنو ہاشم کے یتامیٰ کی کفالت فرماتے تھے اور ان کی بچیوں کی شادی پر اس سے خرچ کرتے تھے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے آپ سے اس کے متعلق مطالبہ کیا کہ ان کے لیے مختص فرمادیں اور مالک بنا دیں، تو آپ نے اس سے انکار فرمادیا، لہذا یہ فدک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیاتِ طیبہ میں اسی حالت پر برقرار رہا، حتیٰ کہ آپ کا وصال ہوگیا۔ آپ کے بعد جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ والی بنے، تو انہوں نے بھی اپنی خلافت کے دوران تا زیست وہی روش اور طریقہ اپنایا جو رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا تھا، حتیٰ کہ ان کا بھی وصال ہوگیا۔ بعد ازاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کے متولّی بنے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے مطابق عمل کیا، حتیٰ کہ ان کا وصال ہوگیا۔ پھر مروان نے اس کو بطورِ جاگیر اپنے تصرّف میں رکھا، پھر وہ عمر بن عبدالعزیز کے تصرّف میں آگیا، یعنی مروان نے اپنے دورِ امارت و حکومت میں اس پر بطورِ ذاتی جاگیر قبضہ جمالیا اور پھر اس کی اولاد بطورِ وراثت اس پر قابض ہوگئی۔ تو میرا نظریہ وعندیہ یہ ہے کہ جو چیز رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

اپنی لختِ جگر حضرتِ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دی تھی اور ان کے مطالبہ کو اس بارے میں پورا نہیں فرمایا تھا، تو میرا حق نہیں بنتا کہ میں اس کو ذاتی جاگیر کے طور پر اپنے تصرف میں رکھوں اور میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے فدک کو اس کی اسی حالت میں لوٹا دیا ہے جس پر کہ وہ زمانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں تھا۔

ف: ابوداؤد شریف کی اس روایت سے بھی واضح ہے کہ فدک آنحضرت کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیاتِ طیبہ میں آپ کے ہی تصرّف میں رہا اور اس سے ازواجِ مطہرات اور اہل وعیال کے اخراجات کی کفالت کے ساتھ ساتھ بنو ہاشم کے یتامیٰ کی کفالت ہوتی تھی اور ان کی بچیوں کی شادی کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے تملیک اور ہبہ کا مطالبہ کیا، لیکن رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پورا نہ فرمایا تو ان صحاح روایات سے جب ہبہ اور تملیک کی نفی ہو رہی ہے، تو علامہ موصوف کا بانگِ دہل یہ اعلان کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرتِ زہرا رضی اللہ عنہ کو ہبہ کر دیا تھا، ڈھول کی طرح کھوکھلا اور بے مغز دعویٰ ہے اور محض شور وشر۔

فدک کس کے سامنے ہبہ کیا گیا؟

ھ: اسی ضمن میں طبقاتِ ابن سعد سے ایک روایت پیشِ خدمت ہے جس سے ہبہ کے دعویٰ کی مزید قلعی کھل جاتی ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ عقیدت ومحبت اور اخلاص ونیازمندی کا کامل اظہار بھی ہوتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خیبر، فدک اور صدقاتِ مدینہ کی وارث ہوں جیسے کہ تمہاری بیٹیاں تمہاری وفات کے بعد تمہاری وارث ہوں گی۔

فقال ابوبکر ابوك والله خير مني وانت والله خير من بناتي وقد قال رسول الله صلی الله علیه وسلم "لا نورث ما ترکنا صدقة یعنی هذه الاموال القائمة فتعلمین ان اباك اعطاکها فوالله لئن قلت نعم لاقبلن قولك ولاصدقنك قالت جاءتنی ام ایمن فاخبرتنی انه اعطانی فدك قال سمعته یقول هي لك ؟ فاذا قلت قد سمعته فهي لك فانا اصدقك واقبل قولك قالت قد اخبرتك ۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸ صـ ۱۳۲

توحضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا بخدا آپ کے والدِ گرامی مجھ سے بہتر تھے اور بخدا تم میری بیٹیوں سے بہتر ہو اور یقین جانئے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ہم کسی کو اپنے زیرِ تصرف اموال کا وارث نہیں بناتے ۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں، وہ صدقہ ہے، یعنی اموال جو قائم اور باقی ہیں۔ کیا تمہیں اس امر کا قطعی علم ہے کہ تمہارے والدِ گرامی نے تمہیں یہ اموال اور یہ اراضی عطا کی ہیں؟ اگر تم اثبات میں جواب دو اور ہاں کہہ دو، تو میں آپ کا قول قبول کر لوں گا اور آپ کے دعویٰ کی تصدیق کر دوں گا۔ آپ نے فرمایا میرے پاس ام ایمن آئی تھی اور اس نے مجھے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک مجھے دے دیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کیا خود تم نے زبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا فدک تمہارا ہے؟ اگر تم اس طرح کہو کہ خود میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا ہے، تو پھر فدک یقیناً تمہارے لیے ہے، میں آپ کے دعوے کی تصدیق کروں گا اور آپ کے فرمان کو قبول کروں گا۔ آپ نے فرمایا: میں نے صحیح صورتِ حال اور واقعہ کی اصلیت بتلا دی ہے (میری معلومات اس معاملہ میں بس یہی ہیں)۔

ف ۱: کیا اس طرح کی روایات کے موجود ہوتے ہوئے فدک کے ہبہ ہونے کا دعویٰ اور اس پر قبضہ و تصرف ثابت کیا جا سکتا ہے اور کوئی عقلِ سلیم اور فہمِ مستقیم

کا مالک یہ باور کر سکتا ہے کہ ہبہ کرنے والے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور ہبہ کیا جائے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا جیسی لختِ جگر اور بالواسطے مرتضیٰ کو۔ لیکن نہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو براہِ راست بتایا جائے اور نہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو، بلکہ صرف ام ایمن لونڈی کو ہی بطور رازداری اس حقیقت سے آگاہ کرتا تھا؟ لہٰذا یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو گئی کہ فدک کا نہ ہبہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے لیے پایا گیا تھا اور نہ ہی ان کو قبضہ دیا گیا تھا، جبکہ ہبہ بلا قبض مفید ملک ہوتا ہی نہیں۔

نیز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر گواہی رد کرنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہ کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کے الزام و اتہام کی حیثیت بھی واضح ہو گئی کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تو صرف ان کے اس قول پر بھی فدک دینے کو تیار ہیں کہ خود میں نے والدِ گرامی اور رسولِ معظم سے سُنا ہے کہ اے فاطمہ! فدک تمہارے سپرد ہے، لیکن آپ نے نہ اپنی طرف سے سننے کا دعویٰ کیا اور نہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے براہِ راست سننے کا دعویٰ ۔ تو اس صورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اس بہتان اور الزام تراشی کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟

ف ۲: نیز حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث ہوں، جس طرح تمہاری وفات کے بعد تمہاری بیٹیاں تمہاری وارث ہوں گی، تو اسی ارشاد کو فدک میں قولِ فیصل کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد فدک کی حضرت عائشہ، حضرت اسماء اور حضرت ام کلثوم اور بیٹے (رضی اللہ عنہم) وارث بنے تھے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا وارث بنی تھیں؟ جبکہ وہ بھی متولی فدک رہے، تو پھر حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کی صداقت کو کون شخص چیلنج کر سکتا ہے؟ اور اگر وہ وارث نہیں بنیں اور یقیناً نہیں بنیں تو صورتِ حال واقعی واضح ہو گئی کہ وراثت کا تعلق ہوگا، تو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی

ذاتی جائیداد ہے نہ کہ قومی ملکیت اور عام اہلِ اسلام کے حق ہے، جن میں وہ بطور حاکم متصرف رہے۔ اسی لیے نہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادیوں نے اس پر حق وراثت جتلایا اور نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی نے اور یہی ان حضرات کا نقطۂ نظر رسولِ معظّم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فدک میں تصرّف کے متعلق ہے۔

ہبہ کی دلیل اور اس کی حقیقت

شیعہ اور سُنّی مستند کتب کے ان حوالہ جات کو ملاحظہ کرنے کے بعد اور حضرت زید بن امام زین العابدین اور امام محمد باقر رضی اللہ عنہما کے ارشاداتِ عالیہ جن میں حضراتِ شیخین سے جور و ظلم کی نفی اور ان کے کتاب و سنّت پر عمل درآمد کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، انہیں پڑھ لینے کے بعد اب علامہ ڈھکو صاحب کی دلیلِ ہبہ ملاحظہ فرماویں اور حقائق اور واقعات کے آئینہ میں اس استدلال کی لغویت اور بیہودگی ملاحظہ کریں اور علماءِ شیعہ کی دیدہ دلیری دیکھیں کہ الزام کن بلند مرتبت ہستیوں پر ہے اور دلیل کی حیثیت کیا ہے؟ علامہ موصوف نے فرمایا: چنانچہ یہ آیتِ کریمہ اتری: وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ۔ یعنی قرابت داروں کو ان کا حق عطا کرو، تو آپ نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو بُلا کر فدک ان کے حوالے کر دیا۔

لیکن یہ دلیل بوجوہ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ ضعیف اور کمزور ہے۔

اوّل: اس دلیل نے ہبہ کے دعوے کو ہی ختم کر دیا، کیونکہ ہبہ تو ہوتا ہے اپنے حق کا غیر کو تفویض کرنا اور آیتِ کریمہ بتلا رہی ہے کہ قرابت داروں کو ان کا حق دے دو تو جس حقدار کو اس کا ہی حق ادا کیا جائے، اُس کو ہبہ کہنا کس لغت اور عرف و اصطلاح میں درست ہوگا، لہٰذا اگر واقعی آیتِ مبارکہ کا شانِ نزول یہی ہے تو پھر ہبہ کا دعوٰی ہی غلط ہو گیا، کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقدار کو اس کا حق دیا نہ کہ اپنا حق۔

دوم: علامہ ڈھکو صاحب کے جواب میں سراسر تعارض پیدا ہو گیا۔ ایک طرف تو فدک کو خالص اور مختص ملکیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلیم کیا جیسے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے فرمان سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے ثابت کیا اور ڈھکو صاحب نے اسی کو بنیاد بناتے ہوئے کہا کہ ہم ببانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسی حق کو استعمال کرتے ہوئے باغِ فدک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا تھا۔ اگر آپ اس کے واحد مالک تھے تو فدک آپ کا حق ہوا نہ کہ ذوی القربٰی کا اور اگر ان کا حق تھا، تو آپ اس کے واحد مالک کیسے بن گئے؟ لہٰذا اس آیتِ کریمہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واحد مالک ہونے کی نفی کر دی اور اس حق کو استعمال کر کے ہبہ کرنے کی بنیاد ہی ختم کر دی۔

سوم: اگر آیت نازل ہونے پر فدک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا گیا تھا تو ظاہر ہے اس پر قبضہ ان کا ہوگا اور محاصل کی مالک بھی وہ ہوں گی اور مزدور وغیرہ مقرر کرنا بھی ان کی اپنی صوابدید اور ذمہ داری، تو پھر وصالِ نبوی کے بعد نہ وراثت کا جھگڑا کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ ہبہ ہونے کا بلکہ قبضہ اور ملکیت کی بحالی کا دعوٰی ہونا چاہیے تھا اور بے دخلی کے خلاف احتجاج ہونا چاہیے تھا اور جب اس طرح کا کوئی احتجاج نہیں پایا گیا تو واقعاتی شہادت نے علامہ موصوف کے استدلال کو لغو و باطل ٹھہرا دیا۔ نیز قبضہ وغیرہ ہوتا تو شہادت کے نصاب کے پورا نہ کر سکنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ مزدور اور کارکنوں کی کھیپ سے گواہی دلوائی جا سکتی تھی اور جب حضرت علی اور امِ ایمن رضی اللہ عنہا کے علاوہ کوئی گواہ بھی نہ مل سکا، تو فدک پر قبضہ کر لینے کے بعد وہاں کام کرنے والے کدھر چلے گئے تھے، لہٰذا واضح ہو گیا کہ قبضہ اور تصرّف قطعاً نہیں پائے گئے تھے بلکہ صرف اور صرف رسولِ مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس پر قابض اور متصرّف تھے، جیسے کافی کلینی، ابن میثم اور دیگر حوالہ جات سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے لہٰذا طبرسی کا یہ دعوٰی سراسر غلط ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی حکومت مستحکم کر لینے کے بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہ سے فدک چھیننے کا عزم کر لیا اور آپ

کے وکیل اور مختارِ عام کو وہاں سے نکال دیا، کیونکہ وہ وکیل یقیناً امِّ ایمن اور علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرا شخص ہی تھا اور یقیناً مسلمان بھی ہوگا تو اس کو ساتھ ملا کر نصابِ شہادت تو پورا کر لیا جاتا، جبکہ باعترافِ شیعہ نصابِ شہادت پورا نہ ہونے کی وجہ سے دعویٰ ثابت نہ ہوسکا اور اسے خارج کر دیا گیا۔ نیز تعجب کی بات یہ ہے کہ بقولِ طبرسی شکایت تو تھی بے دخلی کی، لیکن مطالبہ آپ نے وراثت کا کر دیا۔ اصل عبارت احتجاج مطبعِ جدید صفحہ ۹۱ پر ملاحظہ فرمائیں:

چہارم: علامہ موصوف نے اور جملہ شیعی مفسرین نے اس آیتِ کریمہ کو فدک سے متعلق و مرتبط کر دیا ہے، لیکن تاریخی شہادت کی رو سے اس کو فدک سے مرتبط و متعلق کرنا سراسر غلط ہے، کیونکہ یہ آیتِ مبارکہ قرآن مجید میں دو جگہ وارد ہے اور دونوں سورتیں مکی ہیں، یعنی ہجرت سے قبل نازل ہونے والی جبکہ اس آیت کے مدنی ہونے کا بھی کسی نے قول نہیں کیا، تو جب یہ سورتیں بھی مکی اور اور یہ آیت بھی مکی اور ہجرت سے پہلے نازل ہوچکنے والی، تو اس وقت مکہ میں ہوتے ہوئے فدک ہاتھ کیسے آگیا اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے حوالے کس طرح کر دیا گیا، جبکہ فدک ہجرت کے بعد ساتویں سال میں فتحِ خیبر کے موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ و تصرف میں آیا۔ علماء اہل السنّت کی طرف سے بار بار اس دلیل میں یہ سقم اور وجہ بطلان بیان کرنے کے باوجود نہ شیعہ حضرات اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں اور نہ اس گھسی پٹی دلیل بلکہ شبہ اور مغالطہ کو ترک ہی کرتے ہیں۔

نیز ہجرت سے قبل حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی عمر اتنی تھی کہ فدک پر قابض ہوکر اس میں تصرف کر سکتیں، کیونکہ عند الشیعہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج شریف سے لوٹنے پر حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے خمیر کا استقرار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے رحم میں ہوا، پھر مدتِ حمل پوری کر کے پیدا ہوئیں تو معراج اور ہجرت کے درمیانی عرصہ میں آخر حضرت سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کی عمر شریف اتنی ہو ہی کب سکتی ہے کہ وہ قابض اور متصرف ہوں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اتنی صغیرِ سن صاحبزادی کو خود کفیل بنانے کی کوشش فرمائیں، یہ کیسے ممکن ہے!

سوال: کسی سورت کے مکی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی ہر آیت بھی مکی ہو، کتنی سورتیں مکی ہیں، مگر ان کی بعض آیات مدنی ہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ یہ آیت بھی مدنی ہو؟

جواب: مکی اور مدنی کا فیصلہ محتاجِ نقل ہے عقلی امکانات اور احتمالات تو یہاں کارآمد نہیں، لہٰذا صریح نقل پیش کی جائے کہ یہ آیت مدنی ہے۔ اگر بعض سورتوں کے مکی ہونے کے باوجود ان کی بعض آیات مدنی ہیں، تو علماء اعلام نے ان کی تصریح کر دی ہے کہ فلاں فلاں آیت مدنی ہے اور اس میں اتفاق و اختلاف کی بھی تصریح کر دی جاتی ہے، لیکن علماء شیعہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس آیت میں مدنی ہونے کا کوئی حوالہ اور قول موجود نہیں۔

سوال: ہوسکتا ہے آیت نزول کے لحاظ سے تو مکی ہو لیکن حکم کے لحاظ سے مدنی ہو، یعنی عمل درآمد کا لزوم مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد ہوا اور اس طرح کی بھی کئی آیات ہیں کہ نازل تو قبل از ہجرت ہوئی تھیں، لیکن عملدرآمد ان پر مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد ہوا تو یہاں بھی یہی صورت ممکن ہے؟

جواب: اتنے اہم معاملہ میں جس کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کو ظالم و غاصب وغیرہ کہہ دیا جائے اور ان کے اخلاص بلکہ ایمان کو بھی نشانہ بنا دیا جائے اور تمام صحابہ کرام کو بھی ان کی ہمنوائی کی وجہ سے موردِ طعن و تشنیع بنا دیا جائے، اس میں ممکن اور محتمل سے کام لینا اور عقلی امکان و احتمال پر دعویٰ کی بنیاد رکھنا قطعاً قابلِ قبول نہیں، اس پر قوی دلیل پیش کرنی لازم ہے۔

نیز علامہ موصوف نے دعویٰ ہی یہ کیا کہ جب آیتِ مبارکہ آتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ اتری، تو آپ نے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو بلا کر فدک ان کے حوالے کر دیا اور عطیہ عوفی والی روایت جو اس ضمن میں پیش کی جاتی ہے، اس میں بھی یہی تصریح ہے کہ آیتِ کریمہ کے نازل ہوتے ہی اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے فدک حوالے کر دیا گیا، لیکن اس توجیہ و تاویل کو تسلیم کرنے سے شیعی علماء کا یہ دعویٰ بھی غلط ہوجائے گا اور عطیہ عوفی کا یہ عطیہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا، لہٰذا اس توجیہ و تاویل کا کوئی جواز نہیں ہے۔

پنجم: قرابت داروں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں اور چچے اور چچا زاد بھائی بھی تھے تو صرف حضرت زہراء کو فدک دے کر آپ اللہ تعالیٰ کے اس امر اور حکم سے کس طرح عہدہ برآ ہو گئے، بلکہ یہ تو سراسر ناجائز تفریق اور تقسیم ٹھہری اور دنیا میں عدل و انصاف کی مستحکم بنیاد رکھنے والے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی ناانصافی کیونکر سرزد ہو سکتی تھی؟ علی الخصوص جبکہ صاحبزادیوں کے رشتے میں یکسانیت تھی اور وہ سبھی حقیقی صلبی اور سگی بہنیں تھیں۔ کما ہو المذہب المتحقق عند الشیعہ ایضاً۔

شبہ: ذوالقربیٰ واحد کا صیغہ ہے، لہٰذا اس میں سبھی قرابت دار کیونکر داخل ہو سکتے ہیں؟ **جواب:** یہاں وحدتِ نوعی اور صنفی مراد ہے، لہٰذا وحدتِ کلمہ کے باوجود ان سب افراد کو شامل ہو گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبی قرابت میں شامل ہیں اور قرآن مجید میں متعدد جگہ اس کو کلمۂ عموم کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ذوالقربیٰ مذکر کا لفظ ہے۔ اگر مؤنث میں استعمال کرنا ہو تو ذات کا لفظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً کانت زینب ذا جمال نہیں کہا جائے گا، بلکہ ذات جمال کہا جائے گا، تو اندریں صورت اس سے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی بجائے کوئی قرابت دار مرد ہی مراد ہو سکتا ہے نہ کہ آپ کی ذاتِ مطہرہ تو اس طرح شیعہ حضرات کا مدعا خود ان کی توجیہ و تاویل کے تحت باطل ہو گیا۔

سوال: ہبہ فدک کی روایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے واسطے سے مروی و منقول ہے اور اسے تفسیر درِ منثور میں بحوالہ بزار، ابو یعلیٰ، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نقل کیا گیا ہے تو شیعہ کی کتبِ تفاسیر کے علاوہ حضرات اہل السنت کی کتبِ حدیث میں بھی جب یہ روایت مل گئی، تو پھر انکار کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اہل السنت کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان کی کتبِ احادیث میں مروی و منقول ہر روایت صحیح ہے اور قابلِ استدلال بلکہ ان کے ہاں درجہ بندی ہے اور صحاح ستہ

کے معارض اور مقابل کوئی روایت قابلِ استدلال نہیں ہو گی جیسے بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت کے مقابل دوسری صحاح کی روایات بھی قابلِ قبول نہیں ہوں گی اور خود علمائے شیعہ بھی کتبِ حدیث اور ان میں مندرج روایات کی درجہ بندی کے قائل ہیں اور علامہ ڈھکو صاحب نے تو ببانگِ دہل کہا ہے کہ ہم اپنی صحاح اربعہ کے بھی تمام مندرجات کی صحت تسلیم نہیں کرتے، تو جب یہ حقیقت دونوں فریق کو تسلیم ہے کہ تمام کتبِ حدیث کی تمام روایات کا صحیح ہونا ضروری نہیں اور یہ بھی ثابت ہو چکا یہ روایت بخاری شریف، مسلم شریف اور ابو داؤد شریف کی صریح روایات کے خلاف ہے تو لہٰذا اس کو بطورِ استدلال پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ علی الخصوص جبکہ اس آیتِ کریمہ کا اور اس کی سورتوں کا مکی ہونا مسلّم ہے اور مکی زندگی میں آپ کو اپنی قریبی برادری اور قریش اپنے گھر میں بھی آرام اور سکون کے ساتھ نہیں رہنے دے رہے تھے، تو ان دنوں میں آپ نے وہ فدک حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے حوالے کیسے کر دیا؟ جہاں آپ نے ابھی تک تبلیغِ رسالت کے لئے بھی قدم نہیں رکھا تھا، چہ جائیکہ بطورِ فاتح اور ناقابلِ شکست لشکر کے سپہ سالار کے، لہٰذا اس روایت میں نہ ازروئے عقل کوئی وجہ صحت ہے نہ ازروئے نقل، کیا کسی کو دین و دیانت، ایمان و امانت یہ اجازت دیتے ہیں کہ ایسے مقتدایانِ انام اور اسلام کی بزرگ ترین ہستیوں پر اس قسم کی بے بنیاد روایات کے ذریعے اعتراض و تنقید کا سلسلہ شروع کر دیا جائے اور ان کے ایمان و ایقان اور اخلاص و نیک نیتی پر طعن و تشنیع سے کام لیا جائے

سوال: یہ روایت صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور ان کو خلفاء ثلاثہ کے ساتھ کوئی ذاتی پرخاش بھی نہیں تھی، تو پھر اس کے قبول کرنے میں تامل کیوں؟

جواب: روایت کی صحت کا دار و مدار صرف پہلے راوی پر نہیں ہوتا، بلکہ ازروئے متن صحت کا دار و مدار اس پر ہے کہ دوسری صحیح ترین روایات کے خلاف نہ ہو اور ازروئے سند تمام راویوں کے مسلمان، عاقل، بالغ، حافظ، ضابط

ہونے پر دار ومدار ہوتا ہے اور ایسی بدعت سے منزّہ ومبّرا ہونے پر جس کا اثبات یا جس کی تائید وتقویت اس روایت سے ہوتی ہو۔ اگر محض پہلے شخص کو دیکھیں، تو پھر صحابہ کرام کی بجائے اصل قول اور فرمان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر کیا جاتا ہے، لہٰذا کوئی روایت وحدیث موضوع، منکر اور ضعیف نہیں ہونی چاہیے۔ نیز شیعہ حضرات کی کتب حدیث میں ہر روایت کسی نہ کسی امام کی طرف منسوب ہے، اور وہ ان کے عقیدہ میں معصوم ہیں، جن سے غلط اور خلاف واقع قول اور فعل کا سرزد ہونا ممکن ہی نہیں، تو پھر وہ سب صحیح تسلیم کی جانی چاہئیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ تمام راویوں کو بھی مدنظر رکھنا اور ان کے عقائد ونظریات کو معلوم کرنا اور ان کی ذاتی دلچسپیوں اور قلبی میلان اور ذہنی رجحان پر نظر رکھنی ازحد ضروری ہے اور اس روایت کی سند میں جو راوی ہیں، ان میں عطیہ عوفی بھی ہے جو سخت غالی شیعہ ہے، اس لیے بھی یہ قابلِ قبول نہیں ہے، جیسے کہ از رُوئے متن ناقابلِ قبول ہے۔

عطیہ عوفی: میزان الاعتدال ج۲ ص۲۰ میں علامہ ذہبی نے اس کے متعلق فرمایا: ابوحاتم نے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے اور سالم مرادی نے کہا ہے کہ عطیہ عوفی میں تشیع ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ نے فرمایا ضعیف الحدیث ہے اور ہشیم اس پر جرح وتنقید کرتے تھے اور امام احمد فرماتے ہیں:

بلغنی ان عطیۃ کان یاتی الکلبی فیاخذ عنہ التفسیر کان یکنیہ بابی سعید فیقول قال ابوسعید۔

مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ عطیہ کلبی کے پاس آتا تھا اور اس سے تفسیری اقوال اخذ کرتا تھا اور اس کو ابوسعید کی کنیت دے کر کہتا کہ ابوسعید نے یوں کہا ہے۔

ذہبی فرماتے ہیں یعنی یوھم انہ الخدری کہ اس کا مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ اس کنیت کے ذریعے اس قول کو صحابیٔ رسول ابوسعید خدری کا قول بنایا جا سکے اور لوگوں کو دھوکا دیا جا سکے۔ قال النسائی وجماعۃ ضعیف۔ نسائی اور محدثین کی ایک جماعت نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

نوٹ: درِ منثور میں بھی قولِ باری تعالیٰ آتِ ذاالقربیٰ کی تفسیر میں عطیہ عوفی کی یہ روایت منقول ہے، تو امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول سے اس کی حقیقت واضح ہو گئی کہ در اصل مفسر کلبی کا قول ہے اور اس کو ابوسعید کہہ کر یہ روایت کی گئی اور غلط فہمی پیدا کر کے اسے صحابیٔ رسول قرار دے دیا گیا اور کلبی کا حال پہلے بیان ہو چکا، لہٰذا ایسے جھوٹے راوی اور ضعیف، بلکہ جھوٹی روایت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

جواب الخامس: علامہ موصوف نے پانچواں جواب یہ دیا تھا:

۱۔ کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہبہ کا دعویٰ دائر کیا گیا تھا۔

۲۔ جب گواہوں کا مطالبہ ہوا تو آپ نے حضرت علی، حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اور حضرت امِ ایمن رضی اللہ عنہا کو بطورِ گواہ پیش کیا۔

۳۔ مگر تاریخ اسلام کا یہ المناک واقعہ ہے کہ ان بزرگواروں کی شہادت کو رد کر دیا گیا۔

۴۔ شہادت رد ہونے پر آپ نے دعویٰ کا عنوان بدل کر از روئے قانونِ وراثت اپنے استحقاق کا دعویٰ کیا۔

۵۔ حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی پیش کردہ آیات کے جواب میں صرف ایک خود ساختہ حدیث پیش کی۔

تو اب اس جواب کی پانچوں شقوں کا بالترتیب جواب حاضرِ خدمت ہے:

شق اوّل کا جواب یہ ہے کہ دعوائے ہبہ کا دار ومدار عطیہ عوفی کی روایت پر ہے اور وہ ناقابلِ اعتبار ہے اور اس روایت کا متن دیگر صحاح کے خلاف ہے لہٰذا علامہ موصوف کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس پر کوئی صحیح اور قابلِ اعتماد دلیل ہی قائم نہیں ہو سکتی اور اس شق پر مفصل بحث سابقہ صفحات میں تحریر ہو چکی ہے۔ پھر اس پر غور فرما لیں۔ علامہ عینی نے عمدۃ القاری ج ۱۵، ص۱۵ پر تحریر فرمایا: ھذا لا اصل لہ ولا یثبت بہ روایۃ انھا ادعت ذالک وانما ھو امر مفتعل

لا یثبت۔ دعویٰ ہبہ کی کوئی بنیاد اور اصل نہیں ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی روایت ثابت ہے کہ آپ نے ہبہ کا دعویٰ کیا اور یہ صرف اور صرف من گھڑت قول ہے جس کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔

شق دوم کا جواب یہ ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا جب فدک پر عرصہ دراز سے قابض تھیں اور آپ کے کارندے بھی وہاں کام کرتے تھے، تو پھر صرف خاوند اور اولاد اور خادمہ کی شہادت پر اکتفاء ہی کیوں کیا گیا۔ اوّل تو بقول شیعہ فدک بڑا وسیع و عریض علاقہ تھا، تو وہاں پر سینکڑوں نہیں تو بیسیوں کارندے موجود ہوں گے اور اگر بالفرض ایک ہی تھا، جیسے کہ علامہ طبرسی نے کہا، بعث الی فدک من اخرج وکیل فاطمة بنت محمد رسول الله منها۔ (احتجاج طبرسی ص۹۰) کہ ابوبکر نے استحکامِ خلافت کے بعد آدمی فدک کی طرف بھیجا جس نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل اور مختارِ عام کو وہاں سے نکال دیا۔

تو ظاہر ہے کہ وہ مخلص مومن بھی ہوگا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت اور صلاح و مشورہ سے بھی بھیجا گیا ہوگا تو اسے ساتھ ملا کر نصابِ شہادت کو پورا کرنے کی کوشش کیوں نہ کی گئی؟

ب: نیز حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو ہبہ فدک کے گواہوں میں شامل کرنے کا عقلی اور شرعی جواز کیا ہے؟ ایک طرف تو قولِ باری تعالیٰ آتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ کے نزول پر فدک کے ہبہ کا دعویٰ کیا گیا اور وہ آیت مکی ہے، اس وقت حضراتِ حسنین کریمین موجود ہی کب تھے؟ جبکہ حضرت زہراء کا حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہما) کے ساتھ عقدِ تزویج ہی ہجرت کے دوسرے سال ہوا تھا، اور نزولِ آیت سے ربط و تعلق سے قطعِ نظر فدک پر آپ کا قبضہ سات ہجری کو ہوا تو اگر اس وقت ہبہ کیا گیا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر شریف اس وقت تقریباً چار سال ہوئی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تقریباً تین سال، تو اس عمر کے بچوں کو چشم دید گواہ بنانے کا کیا مطلب؟ اور جب ان کو ادائیگی شہادت

کے لیے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بقولِ شیعہ لایا گیا تو ان شہزادوں کی عمر شریف تقریباً سات اور چھ سال بنتی ہے، تو کیا از روئے قواعد و اصول شہادت اس عمر کے بچے گواہی دے سکتے ہیں؟ جبکہ قرآن مجید فرماتا ہے،

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ (الاٰیۃ) یعنی اپنے مردوں میں سے دو مرد گواہ بناؤ اور اگر دو مرد نہ موجود ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو علماء شیعہ بتلائیں کہ اس قدر صغیر السن بچوں کو اس نصِ قرآنی کے مطابق مردوں میں شمار کیا جائے گا یا امّ ایمن کے ساتھ ملا کر دو عورتوں کی تعداد پوری کی جائے گی؟ اے علماء شیعہ! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عداوت والا مرض مزمن اور لا دوا تمہاری مجبوری سہی، مگر عقل و دانش کی اس قدر دشمنی تو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ آخر یہ اصول اور قواعدِ اسلام ہوئے اور ناقابلِ نسخ دین کے ضوابط و قواعد ہوئے یا بچوں کا کھیل؟

ج: کیا قرآن مجید کے اس عام حکم سے اہل بیت کرام مستثنیٰ ہیں، وہ دعویٰ کریں، تو دلیل و ثبوت اور شہادت سرے سے ضروری ہی نہیں یا صرف نصابِ شہادت کی تکمیل ان کے لیے ضروری نہیں اور وہ شرعی پابندیوں سے بالاتر ہیں؟ اس استثناء پر کیا دلیل ہے؟

د: یہ مسلّم کہ امِ ایمن رضی اللہ عنہا جنّتی عورت ہیں اور حضرت امیر المومنین جنتیوں کے بھی عظیم سرداروں میں سے ہیں، لیکن کیا یہ شرعی پابندیاں اور احکام جنتیوں کے لیے نہیں، صرف دوزخیوں کے لیے ہیں اور مومنین کے لیے نہیں، کفار کے لیے ہیں؟ صلحاء و اتقیاء کے لیے نہیں، صرف فسّاق و فجّار کے لیے ہیں؟ جب یہ احکام اہلِ اسلام کے لیے ہیں اور متقیوں اور پاکبازوں کو بھی شامل ہیں تو پھر اس حیلہ گری کا کیا جواز ہے؟

ھ: کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے والدِ گرامی کے بیان کردہ اصول و قوانین اور قواعد و ضوابط میں لچک پیدا نہ

کر کے اور انہیں اپنے عموم پر رکھ کر جرم کیا تھا کہ اس کو تاریخ اسلام کا المناک واقعہ قرار دیا جائے، بلکہ اسے تو اسلامی تاریخ کا سنہری اور نورانی واقعہ قرار دینا چاہیے اور لائق تقلید مثال اور نمونہ جو کلیسا کی طرح جس نے پوپ پال کو حدود و قیود شرع سے مستثنیٰ قرار دے دیا اور اسے خدائی اختیارات کا مالک قرار دے دیا۔ اگر اسلام بھی امراء و سلاطین اور اکابرین ملت کو مستثنیٰ قرار دے دیتا تو اسے کیا امتیاز حاصل رہتا، بلکہ اسلام نے ایسے تصورات کو حرف غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا ہے، لہٰذا ایسے بے لاگ اور رو رعایت سے منزّہ و مبرّا اصولوں پر عملدرآمد کو المیہ قرار دینا اسلام کے سنہری اصولوں کے نسخ و مسخ کرنے کی ناپاک سعی ہے۔ اگر صاحب شرع خداداد اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے کسی جزوی واقعہ میں استثناء کر دیں تو وہ علیحدہ امر ہے۔ امراء اسلام کو بہرحال یہ حق حاصل نہیں ہے۔

و: حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے جب دربار صدیقی میں دعویٰ دائر کیا تھا، تو ان کے حکم اور فیصلہ کو ماننا لازم تھا اور علی الخصوص جب کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا مطالبہ شرعی قواعد و ضوابط کے عین مطابق تھا، اسی لیے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا ہبہ کے دعوے سے دستبردار ہو گئیں اور دوسرا دعویٰ دائر کر دیا، لیکن ڈھکو صاحب پر تعجب ہے کہ اس نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو مخالف شرع ثابت کرتے ہوئے اُن کی بجائے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو مخالف شرع ثابت کر دیا۔ کیونکہ وہ اس دعویٰ سے دستبردار نہیں ہوتیں اور قواعد شرع کے مطابق اس کا اثبات بھی نہیں کرتیں تو العیاذ باللہ وہ خود مخالف شرع ٹھہریں اور اگر دستبردار ہو چکی تھیں تو ڈھکو صاحب کا اس کو المیہ قرار دینا لغو و باطل ہو گیا، بلکہ یہ عدالت صدیق کا اور اہل بیت رسول کے قبول حق کا سنہری اور روشن نمونہ ٹھہرا اور قابل تقلید مثال قائم ہو گئی۔

سوال: یہ بجا کہ قرآن مجید میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہر عام میں سے بعض استثناءات بھی ہوتے ہیں تو حضرت زہراء اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو بھی مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا جس طرح حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دے دیا گیا۔

جواب: عام اپنے عموم میں قطعی ہوتا ہے اور اسے اپنے عموم پر رکھنا لازم ہوتا ہے۔ اگر اس کا عموم ختم کر دیں اور اپنی مرضی سے استثناء اور تخصیصات شروع کر دیں تو شرعی آئین اور قوانین کھیل بن کر رہ جائیں گے، لیکن عدل اسلامی اور اس کا امتیازی شان ہی یہ ہے کہ اس میں ایسی تفریق نہیں ہے اور اگر کسی بڑے آدمی کی بات واجب التسلیم ٹھہرے خواہ خواہ وہ اکیلا ہی کیوں نہ ہو تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جتنا بڑا اس وقت کون تھا، پھر ان کی یہ بات بلکہ اُن کی نقل کردہ حدیث کیوں تسلیم نہیں کی جاتی اور آج تک ان کو مورد طعن و تشنیع کیونکر بنا لیا گیا ہے۔

رہا معاملہ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کا تو ان کا استثناء خود صاحب شرع نے کیا ہے امت اُن کو تو پابند نہیں کر سکتی تھی، وہ خود احکام میں تحریم و تحلیل اور تعمیم و تخصیص کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختار و ماذون تھے۔ اُمت مختار نہیں، بلکہ امت ان کے احکام کی پابند ہے، عام ہوں تو بطور عموم اور مطلق ہوں تو بطور اطلاق۔

سوال: خود ابوبکر صدیق نے حضرت جابر رضی اللہ عنہا کا دعویٰ تسلیم کیا اور ایک گواہ بھی ان سے طلب نہ کیا، تو آخر یہ پابندی صرف حضرت زہراء (رضی اللہ عنہا) اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی شہادت میں ہی ضروری تھی، دوسروں کے حق میں نہیں تھی؟

جواب: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا یہ دعویٰ ہے کہ مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کا مال آنے پر عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا، وہ علیحدہ امر ہے، کیونکہ وہ صرف مال بحرین کے مصرف کا معاملہ ہے اور ایسے اموال جو بطور صدقات وغیرہ وصول کر کے مرکز میں بھیجے جاتے تھے، وہ خرچ ہی اہل مدینہ پر ہوتے تھے اور ان کی حاجات و ضروریات ان سے پوری کی جاتی تھیں، اس میں گواہ نہ بھی ہوتے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدے کا حوالہ نہ بھی دیا جاتا، اپنے طور پر کہہ دیتے میں ضرورت مند ہوں، مجھے عطا کر دو تو بھی خلیفہ انہیں دینے کے پابند ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو اخراجات کے لیے مطالبہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ ضامن دیتا ہوں کہ تمہارے جملہ اخراجات اور ضروریات کو پہلے پورا کروں گا اور جو بچے گا وہ دوسرے مصارف میں استعمال کروں گا، نہ دعویٰ کی ضرورت نہ گواہوں کی حاجت۔

لیکن بقولِ شیعہ ہبہ کا دعویٰ خلاف ظاہر تھا اور عملِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اور انفال وفیئ کے قرآنی احکامِ ظاہرہ کے بھی خلاف اور اس سے متعلق خلیفۂ وقت کے علم اور مشاہدے کے بھی خلاف تھا۔ اس لیے اگر آپ نے ثبوت طلب کرلیا، تو کونسا جرم کیا۔ مزید تسلی کے لیئے شق سوم کا جواب ملاحظہ ہو۔

شق سوم کا جواب شق دوم میں آ تو چکا ہے، لیکن مزید توضیح کے لیے درج ذیل امور ذہن میں رکھنے ضروری ہیں:

(ا) اس تحقیق و تفتیش کو ردِ شہادت سے تعبیر کرنا علامہ صاحب کی سینہ زوری ہے، کیونکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت امِ ایمن رضی اللہ عنہا کو جھوٹا اور غلط بیانی کرنے والا تو کسی نے نہیں کہا تاکہ اس کو ردِ شہادت سے تعبیر کیا جاتا البتہ نصابِ شہادت کے کامل نہ ہونے پر دعویٰ کو خارج کردینا تو اسے کہہ سکتے ہیں، ردِ شہادت تب کہتے جب شہادت عند الشرع پائی بھی جاتی۔

(ب) پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم گواہ بھی پیش نہ کرو، صرف اپنی زبان سے اتنا کہہ دو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا ہے کہ فدک تمہارا ہے تو میں آپ کے حوالے کردیتا ہوں، لیکن آپ نے کہا نہیں، مجھے تو امِ ایمن نے بتلایا تھا کما فی طبقات بن سعد اور ابن میثم کے حوالے سے گزر چکا کہ آپ نے کہا تم بھی سچی ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی سچے اور ام ایمن بھی، مگر صورتِ حال واقعی یہ تھی کہ فدک سے تمہارے قوت اور روزی کی کفالت ہوتی تھی جیسے کہ حضرت عمر اور حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہما نے حاصل کی تقسیم پر گواہی دی ہے اور وہ بھی سچے ہیں، لہٰذا اندریں صورت بھی اس کو ردِ شہادت کہنا اور تاریخ اسلام کا المیہ قرار دینا سراسر لغو اور باطل ٹھہرا، بلکہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے اقوال کا محمل اور صحیح مقام متعین فرمایا اور تمام بزرگواروں کے اقوال میں موجود تعارض کو دور کرکے دونوں کو سچا بنادیا، ورنہ ایک فریق کے قول کو غلط کہنا پڑتا۔

شق چہارم کا جواب: علامہ موصوف نے کہا کہ دعوائے ہبہ رد ہونے پر آپ نے عنوان بدل کر وراثت کے قانون کے تحت فدک کی حقداری کا دعویٰ دائر کردیا، لیکن یہ قول بھی سراسر مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے اور شیعی روایات اور سنی روایات سے اس تبدیلی اور تعبیرِ عنوان کا ثبوت نہیں مل سکتا اور یہ بھی انمل، بے جوڑ اور بے ربط دعویٰ ہے۔

(ا) وراثت کا دعویٰ مورث کے ترکہ میں کیا جاسکتا ہے اور جب آیتِ کریمہ کی رو سے وہ حق بھی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا تھا، تو پھر وراثت کا دعویٰ کیسا؟ اور اگر وراثت کا دعویٰ کیا تھا، تو آیتِ کریمہ کا فدک کے متعلق نزول کیونکر قابل قبول ٹھہرا؟ نیز آپ نے ہبہ کو اس آیت سے کیوں نہ ثابت کیا، وراثت کے لئے تو آیات پیش فرمائیں لیکن ہبہ کے حق میں وارد یہ آیت بالکل پیش نہ کی، جبکہ اسکے ہوتے ہوئے شہادت پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

(ب) احتجاج طبرسی وغیرہ کے مطابق حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے فدک پر قبضہ کیا ہوا تھا اور آپؓ کے تحصیلدار اور مختارِ عام وہاں موجود تھے، جن کو ابوبکر نے وہاں سے نکال دیا، تو اندریں صورت فدک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ ہی نہ تھا، اس میں کونسا قانونِ وراثت جاری ہوسکتا تھا کہ دعوائے ہبہ سے عدول کرکے یہ دعویٰ کیا جاتا، بلکہ اس صورت میں ناجائز بے دخلی اور غصب وغیرہ کا قول کیا جاتا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ تو مدعی علیہ تھے، ان کے ساتھ ثالثی فیصلہ کے لیے کوشش کی جاتی، جس طرح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو تحکیم قبول کرنا پڑی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی اس پر مجبور کرلیا جاتا نیز فدک اور غیر فدک میں مالِ فیئ یا انفال سے ہونے کے باوجود قبضہ کے فرق کو اپنی ذاتی جائیداد اور جاگیر ہونے کا بیّن برہان بنایا جاتا، کیونکہ دوسرے اموال پر قبضۂ مصطفوی ہونا اور فدک پر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا قبضہ ہونا آخر بے سبب تو نہیں ہوسکتا تھا؟

ج - ہبہ کے دعوے میں ذاتی ملکیت کا اقرار پایا گیا اور وراثت کے دعوے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت کا اقرار و اعتراف پایا گیا اور ان دونوں میں سراسر تخالف اور تضاد ہے۔ ایک دعوے میں کئی سال پیشتر رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ملک سے باہر ہونے کا اقرار اور پھر وراثت کے طور پر مستحق ہونے کا ادعاء گویا اپنے آپ کو جھٹلانے کے مترادف ہے جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے لیے کیونکر قابلِ قبول ہو سکتا ہے اور اگر الزام اور جدل کے طور پر ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس مال کو سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی ملک سمجھتے ہی نہیں تھے، تو اس طرح دعوائے وراثت نہ بُرہانی انداز میں صحیح ہوا، کیونکہ سابقہ دعوٰی نے اس کی بنیاد ختم کر دی، اور نہ جدلی انداز میں، کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کو صرف انتظامی معاملہ کے طور پر زیرِ تصرف مانتے تھے نہ کہ ذاتی ملکیت کے طور پر۔

د - ہبہ ثابت ہونے کی صورت میں سارا فدک آپ کا ہوتا اور وراثت کے قانون کے تحت ازواجِ مطہرات کو بھی حصہ ملنا تھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بھی تو اس صورت میں پورے فدک پر ازروئے قانونِ وراثت حقداری کا دعوٰی کیسے کیا جا سکتا تھا؟ کیا حضرتِ زہرا رضی اللہ عنہا قرآن مجید کے اس واضح قانون سے بھی بے خبر تھیں کہ ازواج کو بھی ترکہ سے حصہ ملنا ضروری ہے اور صرف ایک بیٹی ورثاءِ نسبی میں ہو تو اس کو صرف نصف حصہ مل سکتا ہے نہ کہ ساری جائیداد لیکن بقول علمائے شیعہ آپ نے سارے فدک پر اپنی حقداری ثابت کرنا چاہی تھی، تو کیا یہ مطالبہ قانونِ وراثت کے سراسر خلاف نہیں تھا؟ اور آپ سے اس کی توقع کی جا سکتی تھی؟

ھ - بقول علمائے اہل التشیع حضرتِ زہرا رضی اللہ عنہا نے قانونِ وراثت کا سہارا لیا، مگر کیا آپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جب میرے ابا جان عورتوں کے ساتھ نکاح کے عام قانون سے مستثنٰی ہیں اور جتنی عورتوں کو چاہیں اپنی زوجیت میں لے سکتے ہیں، تو پھر وراثت کے حصوں میں بھی آپ کا معاملہ مختلف ہونا چاہیے، ورنہ آپ کی ازواج کے ساتھ ناانصافی لازم آئے گی۔ نیز جب عام اہلِ اسلام کی بیویوں کے

قانونِ عدت سے اور بعد از عدت جوازِ نکاح سے ازواجِ مطہرہ کا معاملہ مختلف ہے تو پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائیداد یا زیرِ تصرف اموال کی تقسیم کا حکم بھی مختلف ہونا ضروری ہے، کیونکہ جو صرف چار ماہ دس دن تک عدت کی پابند وہ بھی خاوند کی اولاد ہوتے ہوئے آٹھویں حصہ کی حقدار اور چار ہونے کی صورت میں بتیسویں حصے کی حقدار، مگر ازواج مطہرات کے لیے تا زیست دوسری جگہ نکاح نہ کر سکنے اور حکم معتدات میں ہونے کے باوجود اور بیک وقت نو امہات المومنین ہونے کے باوجود بھی وہی آٹھواں حصہ ہوتا، تو پھر بھی ناانصافی تھی، چہ جائیکہ سرے سے ان کا حصہ ہی نہ ہوا اور پورے فدک پر حضرت زہراء رضی اللہ عنہا بلا شرکتِ غیرے بطورِ وراثت حقِ ملکیت جتلائیں، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات نے حضرت [illegible] رضی اللہ عنہ کو مخالفِ شرع ثابت کرتے کرتے خود حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو العیاذ باللہ مخالف شرع ثابت کر دکھلایا ہے اور اپنی ماؤں کے حق میں سرد مہر و بے وفا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکائے حیات اور امہات المومنین اور اپنی امہات کے ساتھ صلہ رحمی سے عاری اور حقِ ولدیت کی رعایت سے غافل بلکہ انکاری بنا ڈالا، جو ایک عام مسلمان کے بھی لائق نہیں، چہ جائیکہ ایسی مقدس ہستیوں کے لائق ہو۔

و - حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے سہل اور مفید ترین دعوٰی کی جگہ مشکل اور غیر مفید دعوٰی کی طرف عدول کیوں فرمایا۔ ہبہ ثابت کرنے کے لیے آپ کو صرف ایک اور عورت کی شہادت درکار تھی اور یا ایک مرد کی جبکہ اس صورت میں پورا فدک آپ کو مل جاتا تھا اور وراثت کی صورت میں فدک کے بہت سے حقدار سامنے آ سکتے تھے، تو کیا ہبہ کرتے وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کا خیال نہ رہا یا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو یہ قانونِ شہادت معلوم نہیں تھا؟ اور اس ہبہ کا بقولِ شیعہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، تو اس نے بھی علیم و خبیر ہوتے ہوئے مستقل بندوبست فدک کا نہ کرایا اور نہ ہی ذا القربٰی کی جگہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے نام کی

تصریح فرمائی اور نہ ہی حَقَّہٗ کی جگہ فدک کا لفظ ذکر فرمایا۔ کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ حوالے کرانے کے لیے تو آیتیں نازل کر دیں، مگر گواہوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بے پرواہی سے کام لیا کہ سب کوشش بے نتیجہ ہو کر رہ گئی۔ العیاذ باللہ! کیا اس نزاع کے وقت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ موجود نہیں تھے جو آیت کے فدک کے بارے میں نازل ہونے اور فدک حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے حوالے کیے جانے کے راوی ہیں، انہیں کیوں نہ گواہ بنا لیا گیا؟ یا اس نص کو کیوں نہ پیش کر دیا گیا تاکہ گواہوں کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو نہ اس آیت کے فدک کے بارے میں نازل ہونے کا علم تھا اور نہ حضرتِ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کا اور ان کے اس معاملہ کے گواہ ہونے کا علم تھا، ورنہ اس دعوٰی سے عدول کی ضرورت پیش نہ آتی، تو عطیہ عوفی کو یہ علم کس طرح حاصل ہو گیا؟

ن: ہبہ ہو یا وراثت، دونوں کا اجراء ذاتی مال میں ہوتا ہے نہ کہ حاکمِ وقت کے زیرِ تصرف قومی املاک میں لہٰذا پہلے یہ ثابت کرنا لازم تھا اور تمام علمائے شیعہ کی از روئے عقل اور شرع، یہ بنیادی ذمہ داری تھی اور ہے، کیونکہ جس فدک کے نہ دیئے جانے کی وجہ سے عالمِ اسلام کی بزرگ ترین ہستیوں کو موردِ الزام گردانا جاتا ہے، اور سخت مجرم و گنہ گار توکم از کم اس الزام اور اثباتِ جرم کی بنیاد تو فراہم کر دیں حالانکہ ہم بارہا اس پر تنبیہ کر چکے ہیں کہ فدک قطعاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جاگیر اور جائیداد نہیں تھی۔

ملکیّتِ فدک وغیرہ کی حقیقت

اس ضمن میں مزید چند دلائل معروضِ خدمت ہیں۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ فدک کے لیے جنگ نہیں کیا گیا تھا اور اس میں مجاہدین کے وہ حصص ثابت نہیں ہو سکتے تھے، جو جنگ لڑنے کی صورت میں مالِ غنیمت کے اندر ہوا کرتے ہیں، لیکن یہ

امر بھی تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ جس طرح مالِ غنیمت میں سے خمس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تصرف ہونے کے باوجود اس کے حقداروں میں یتامیٰ، مساکین اور مسافر بھی داخل ہیں: کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ، وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْئٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبیٰ وَالْیَتَامیٰ وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (سُوْرَۃ الانفال) اسی طرح مصالحت کی صورت میں حاصل ہونے والے علاقہ جات وغیرہ کے متعلق بھی رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تصرّف ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے حقداروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ: وَمَا اَفَاءَ اللّٰہُ عَلیٰ رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُریٰ فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبیٰ وَالْیَتَامیٰ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ یعنی قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، بلکہ فقراءِ مہاجرین بھی ان مستحقین میں داخل ہیں۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ، وَلِلْفُقَرَاءِ الْمُھَاجِرِیْنَ (الآیۃ) اور انصارِ مدینہ بھی جو کہ فقیر اور مسکین تھے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ، وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ (الآیۃ) اور ان کے بعد حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والے فقراء و مساکین بھی۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ: وَالَّذِیْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِھِمْ (سُوْرۂ حشر) اور یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ ذاتی ملکیت میں اصلی مالک کے ساتھ مصارف کو اس طرح ذکر نہیں کیا جاتا جیسے کہ مالک کا تذکرہ ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَعْلُوْمٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ "مومنین کے اموال میں سائلوں اور محروم لوگوں کے لیے حق ہے۔" تو اس میں اموالھم فرما کر مالکانہ حیثیت کو الگ واضح کر دیا گیا، جبکہ ان آیاتِ مقدسہ میں لامِ اختصاص اور تملیک جس طرح الرسول پر داخل ہے۔ دوسرے اقسام و اصناف پر بھی اسی طرح داخل ہے۔ نیز ان دونوں قسم کے اموال میں اور انفال کے قسم میں بھی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر فرمایا ہے: قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حقیقی مالک ان تمام اموال کا اللہ تعالیٰ ہے اور جس طرح رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نفسِ نفیس

احکامِ الٰہیہ میں نائبِ خداوند تعالیٰ ہیں۔ اسی طرح ان اموال میں بھی نائب ہیں اور مستحقین تک یہ اموال پہنچانے والے ہیں، جس طرح کہ روزی رسان مدبراتِ ملائکہ کا یہی کام ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متصرف بھی تھے اور مصرف بھی، لہٰذا ان کو اللہ تعالیٰ سے الگ ذکر کیا جو کہ مالکِ محض اور متصرفِ حقیقی ہے اور دیگر اقسام چونکہ مصرفِ محض تھے، لہٰذا انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ کر دیا اور لفظ اللہ پر لام۔ پھر لفظ الرسول پر لام اور تیسری جگہ ان اصناف پر لام اختصاص کا لانا، اسی فرق کو ہی واضح کرنے کے لیے ہے اور جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا، تو پھر ان کی جگہ امراءِ اسلام اور خلفاء متصرف بھی ہوں گے اور مصرف بھی، جس کو کافی میں بروایت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ، ثم للامام بعدہ یضعه حیث یشاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

الغرض فدک مال فیئ ہو جیسے کہ قرآن مجید سے ثابت ہے یا انفال سے ہو، جیسے کافی کلینی میں مرقوم ہے۔ ہر دو صورت میں وہ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تصرف ہونے کے باوجود آپ کی ذاتی ملکیت نہیں تھا، بلکہ اللّٰہُ یُعطِی وَاَنَا قَاسِم۔ کے مطابق رزق اللہ تعالیٰ کا تھا اور قاسم اس کے آپ تھے اور مصارف وہ جو قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں، جس طرح آج اگر بادشاہِ اسلام کفار پر حملہ کرے اور وہ مرعوب ہو کر صلح کر لیں اور کچھ دے دیں، تو وہ اس بادشاہ کی ذاتی جاگیر نہیں ہو گی، بلکہ قومی ملکیت ہو گی اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نائبین کے ساتھ مختص ہوتے اور ان کے خالص حق ہونے کا صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ بطورِ مالِ غنیمت کے مجاہدینِ اسلام کو اس سے حصہ نہیں دیا جائیگا۔ اسی لیے فرمایا کی لایکون دولة بین الاغنیاء منکم۔ تاکہ اموال فیئ بھی تمہارے اغنیاء کے درمیان نہ گردش کرتے رہیں، جبکہ مال غنیمت میں تو غنی اور فقیر کا فرق نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ذاتی ملکیت کے لیے فقیر ہونا ضروری اور نہ حق وراثت حاصل کرنے کے لیے، بلکہ نسبی قرابت والا امیر ترین ہی کیوں نہ ہو، وہ وراثت کا حق حاصل کرے گا، لیکن اموال فیئ میں یہ علت بیان کر کے بتلا دیا کہ فقراء و مساکین اور

یتامیٰ و ابن السبیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزی رسانی کا یہ ذریعہ بھی بنایا ہے جس طرح دیگر صدقات اور اگر رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت ہو جائے تو پھر آپ کا اغنی الاغنیاء ہونا لازم آئے گا اور صرف آپ کے غنی کرنے کے لیے اس قسم کا اجراء مقصود ہو جائے گا جو قرآن مجید کے کلمات طیبات اور اس کی بیان فرمودہ علت و حکمت کے سراسر خلاف ہے۔

اسی مضمون کی مزید روایات بھی ملاحظہ ہوں۔ ابوبکر جوہری نے ذکر کیا ہے:

۱- ارسلت فاطمة الی ابی بکر انت ورثت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ام اهله قال بل اهله قالت فما بال سهم رسول اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول ان اللہ اطعم نبیه طعمة ثم قبضه وجعله للذی یقوم بعده فولیت انا بعده علی ان ارده علی المسلمین قالت انت وما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اعلم۔
(شرح حدیدی جلد ۱۶ ص ۲۱۹)

یعنی حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف آدمی بھیجا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث تم ہو یا آپ کے اہل بیت تو آپ نے کہا میں نہیں، بلکہ آپ کے اہل بیت وارث ہیں، تو آپ نے فرمایا پھر رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ کس حال میں ہے (ہمیں کیوں نہیں مل رہا) تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چیز کھانے اور استعمال کرنے کے لئے عطا فرمائی، پھر انہیں اپنی طرف بلا لیا اور اس مال کو اس شخص کے سپرد کیا جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام بنا۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں اس کا متولی ہوں اس عہد اور اس شرط پر کہ میں اس کو اہلِ اسلام پر خرچ کروں، تو آپ نے فرمایا تم اس کو بہتر طور پر جانتے اور سمجھتے ہو جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور یہی

روایت ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ ص ۱۳۹ پر ذکر کی ہے۔

۲ - دوسری روایت میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیج کر اسی طرح کا سوال کرنے کے بعد آپ کا یہ جواب ذکر کیا ہے: انما ھی طعمۃ اطعمناھا اللہ فاذا مت کانت بین المسلمین یعنی میں نے رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ یہ اموال کھانے اور استعمال کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں۔ جب میرا وصال ہوگیا تو یہ اہلِ اسلام کے حوالے اور سپرد ہوں گے اور ان کے تصرف میں ہوں گے، یعنی صرف میرے اقرباء اس کو بطورِ وراثت تقسیم نہیں کر سکیں گے، بلکہ دیگر ضرورت مند اور اہلِ اسلام بھی ان میں برابر کے حصہ دار ہوں گے، لہٰذا ان آیات و روایات سے واضح ہوگیا کہ فدک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جائیداد نہیں تھا، لہذا وراثت کی آیات پڑھ پڑھ کر حق وراثت کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف ذاتی جائیداد ثابت کرنے کی تھی، مگر وہ ثبوت فراہم ہی نہیں کیا گیا۔

سوال: فدک کو ذاتی جائیداد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ سمجھنا انفال، فیئ اور مالِ غنیمت کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ہے، ورنہ فدک جب انفال کے قبیل سے ہے اور ان کا حکم قرآن مجید میں ان کلمات کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے: یَسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول۔ وہ آپ سے سوال کرتے ہیں انفال کے متعلق فرما دیجیے کہ انفال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں، تو یہاں پر صرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جانا اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ وہ آپ کی ذاتی جائیداد ہے، جبکہ اموالِ غنیمت میں اور اموالِ فیئ میں دوسرے حقداروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

جواب اوّل: حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے کافی کلینی کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ فدک انفال سے ہے اور انفال رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام و خلیفہ کے زیرِ تصرف ہوتے

ہیں۔ اگر قرآن مجید میں انفال کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جائیداد قرار دیا گیا تھا، تو پھر قرآنِ ناطق حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی مخالفت فرمائی، کیونکہ آپ کی ذاتی جائیداد ہو تو پھر امام کے لیے حقِ تصرف نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس میں وراثت جاری ہونی چاہیے تھی اور ازواجِ مطہرات، حضرت زہرا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم اس کے وارث ہوتے نہ کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، جبکہ خلیفہ اور امام تو آپ ہیں نہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر حضرات، لہٰذا فرمانِ امام سے صاف ظاہر ہے کہ انفال بالعموم اور فدک بالخصوص حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جائیداد نہیں تھا، ورنہ فرمانِ امام غلط ہو جائے گا۔

جواب ثانی: یہاں پر حقیقی مالک تصرف کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور بطورِ نائب و خلیفہ کے حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا، لیکن اس کے مصارف کیا ہیں؟ ان کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا، مگر ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ مالِ غنیمت یا مالِ فیئ کے مصارف بالکل جدا ہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ خمس غنیمت یا مالِ فیئ تو ذوی القربیٰ میں صرف ہو سکتا ہے، لیکن انفال کو ان پر خرچ بھی نہیں کیا جا سکتا تو یہ آیتِ کریمہ فدک وغیرہ کے ہبہ اور تملیک کے منافی ہوگئی اور اس سے شیعی نظریہ سرے سے باطل ہوگیا، لہذا صاف ظاہر ذکرِ رسول از روئے متصرف ہے نہ کہ مصرف محض کے۔

جواب ثالث: شیعی مفسرین نے انفال کو مالِ فیئ یا مالِ غنیمت کا قسیم اور ان سے مغایر بالذات نہیں مانا، بلکہ اس کو غنیمت کا ہم معنیٰ اور یا فیئ کا ہم معنیٰ قرار دیا ہے اور یا اس کو عام معنیٰ پر محمول کیا ہے، جو اموالِ غنیمت اور اموالِ فیئ کو شامل ہے، لہذا ان میں تباین ثابت کر کے انفال کو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جائیداد قرار دے دینا بالکل غلط ہے۔

(۱) تفسیر صافی میں مُلا محسن کاشانی نے کہا: ھی غنائم خاصۃ والنفل الزیادۃ علی الشیئ سمیت بہ الغنیمۃ لانھا عطیۃ من اللہ وفضل یعنی انفال سے مراد اموالِ غنیمت ہیں اور نفل کا معنیٰ کسی شیئ پر اضافہ اور زیادت ہے

اور مالِ غنیمت کو نفل کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیّہ اور فضل ہے۔ (تفسیر صافی مطبع جدید، جلد ۲، ص۲۶۶)

(۲) فی التھذیب عن الباقر والصادق علیھما السلام الفیئ والانفال ما کان من ارض لم تکن فیھا ھراقۃ دم او قوم صولحوا و اعطوا بایدیھم وما کان من ارض خربۃ او بطون اودیۃ فھو کلہ من الفیئ والانفال فھذا کلہ للہ ولرسولہ فما کان للہ فھو لرسولہ یضعہ حیث شاء وھو للامام بعد الرسول۔ (تفسیر صافی ص۲۶۶)

تہذیب الاحکام میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ فیئ اور انفال وہ زمین ہے جو خون بہائے بغیر ہاتھ آجائے یا کوئی قوم صلح کرلے اور اپنے طور پر کچھ علاقے دے دیں یا بنجر زمینیں اور وادیوں کے درمیانی حصے یہ سبھی فیئ اور انفال ہیں اور تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پس جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، وہ اُس کے رسُول کے لیے ہے جہاں چاہیں صرف کریں اور آپ کے بعد امامِ وقت کے سپرد ہوگا۔

(۳) فی الجوامع عن الصّادق علیہ السّلام الانفال کل ما اخذ من دار الحرب بغیر قتال وکل ارض انجلی عنھا اھلھا بغیر قتال وسماھا الفقھاء فیئاً والارضون الموات والاٰجام وبطون الاودیۃ وقطائع الملوک ومیراث من لا وارث لہ وھی للہ وللرسول ولمن قام مقامہ بعدہ (ص۲۶۷ وکذا فی مجمع البیان جلد ثانی ص۵۱)

جوامع میں حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ انفال ہر وہ زمین ہے، جو دار الحرب سے بغیر جنگ کے ہاتھ آئے اور ہر وہ زمین جس سے اس کے مالک جلا وطن ہو جائیں بغیر جنگ کے اور فقہاء نے اس کو فیئ کا نام دیا ہے اور غیر آباد زمینیں جنگلات

وادیوں کے درمیانی حصے اور بادشاہانِ وقت کی جاگیریں اور لاوارثوں کی میراث، اور یہ سبھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور رسول علیہ السلام کے لیے اور اُن کے بعد قائم مقام امام اور خلیفہ کے لیے۔

پہلی روایت میں انفال کو عین غنیمت، دوسری میں عین فیئ قرار دیا گیا ہے جبکہ تیسری میں انفال کو فیئ سے عام قرار دیئے جانے کا احتمال ہے، اس کی تنصیص بھی نہیں ہے۔

۴۔ امام جعفر صادق اور امام محمد باقر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ نازل ہی بدر کے مالِ غنیمت کے متعلق ہوئی ہے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا اور بعد ازاں اس کو مجاہدین کے لیے مختص کردیا گیا ہے۔ قالا ان غنائم بدر کانت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم خاصۃ فسألوہ ان یعطیھم — جب یہ امر واضح ہوگیا کہ ان دونوں جلیل القدر ائمہ کے نزدیک انفال کا مصداق بدر کے اموالِ غنیمت ہی ہیں، تو اب یہ امر قابلِ تنقیح ہے کہ آیا حکم غنائم پر مشتمل آیت اس کے لیے ناسخ ہے یا نہیں اور دونوں آیات میں منافات ہے یا نہیں، تو اس امر کی تحقیق شیعی مفسر طبرسی کی زبانی سنیں:

فقال بعضھم ھی منسوخۃ بایۃ الغنیمۃ وھی قولہ واعلموا انّما غنمتم من شیئ وقال بعضھم لیست بمنسوخۃ وھو الصحیح لان النسخ یحتاج الی دلیل ولا تنافی بین ھذہ الایۃ وآیۃ الخمس۔ یعنی ان اموالِ غنیمت کے متعلق جب یہ بیان کردیا گیا، وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے لیے، تو اب علماء کرام کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور قول باری تعالیٰ: جان لو کہ جو کچھ بطورِ غنیمت تم نے حاصل کیا تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے الخ۔ اس کے لیے ناسخ ہے اور بعض نے کہا یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور صحیح قول بھی یہی ہے، کیونکہ نسخ محتاجِ دلیل ہے اور اس پر کوئی دلیل موجود نہیں) اور قول باری تعالیٰ:

الانفال لِلّٰہ والرّسول میں اور آیتِ خمس میں منافات اور تضاد بھی نہیں کہ اس کی آڑ میں نسخ کا قول کر دیا جائے۔ گویا حقیقی مالکِ تصرف اللہ تعالیٰ ہے پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان دونوں نے ازراہِ لطف و کرم چار حصے غانمین کو دے دیئے اور صرف پانچواں حصہ اپنے لیے رکھ لیا۔

نیز اس آیتِ کریمہ کو اگلی آیات کے ساتھ ملا کر دیکھیں، جن میں غزوۂ بدر کی تفصیلات کا بیان ہے اور وہ پہلی جنگ تھی جس میں یہ اموالِ غنیمت ہاتھ آئے تھے اور پہلی اُمتوں پر ان کا استعمال حرام تھا، تو اب اس امر کے دریافت کرنے کی ضرورت تھی کہ آیا ہمارے لئے حلال ہیں یا نہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی حلت کو واضح فرما دیا۔ اجمالی طور پر بھی اور تفصیلی طور پر بھی لہٰذا اس آیتِ کریمہ کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور ائمہ کرام کے ارشادات اور ان کی تفسیرات کو نظر انداز کر کے اور اپنے فقہاء و مفسرین کے اقوال سے بھی صرفِ نظر کر کے من مانے معانی پر محمول کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے اور اسے تیسرا قسم قرار دینا اور مالِ غنیمت اور مالِ فیئ سے الگ سمجھنا اور اس کے مصارف بھی ان سے مختلف سمجھنا، بالکل غلط ہے اور سراسر تحکم اور سینہ زوری ہے، بلکہ اپنے دعوٰی کے اثبات سے مکمل عجز و بے بسی کے بعد قرآن مجید کو بازیچۂ اطفال بنانے کی مذموم کوشش ہے اور ارشاداتِ ائمہ کو لغو ٹھہرانے کی سعی نامشکور۔

جواب رابع: قطع نظر ان تمام امور سے جو ہم نے ذکر کئے ہیں۔ اگر انفال کو علیحدہ قسم شمار کریں اور اس حصر کو ملحوظ رکھیں تو لازم آئے گا کہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی امام و خلیفہ اور حاکمِ اسلام کے دور میں انفال نام والے اموال اور قطعاتِ اراضی متحقق ہی نہ ہو سکیں اور یہ بدیہی البطلان ہے، جس طرح مالِ غنیمت دورِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص نہیں اور نہ مالِ فیئ اسی طرح انفال بھی اس دور کے ساتھ مختص نہیں تو لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑا کہ اس آیتِ کریمہ میں رسول کا ذکر بطورِ حصر نہیں ہے اور دوسرے مصارف کی اس سے نفی لازم نہیں آتی۔

شقِ پنجم کا جواب یہ ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے دھڑا دھڑ آیات پڑھیں یا نہیں؟ تمام علماءِ شیعہ مل کر ایسی آیت بتا دیں، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ حاکمِ وقت اور بادشاہِ اسلام قومی املاک اور بیت المال کا ذاتی طور پر مالک ہوتا ہے اور فدک کے قسم کے اموال جو کفار کی طرف سے لشکرِ اسلام کے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بطورِ مصالحت پیش کئے جائیں، وہ ان کی ذاتی جاگیر ہوتے ہیں اور ان کے ورثا مالک ہوا کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ آج تک علماءِ شیعہ نہ کوئی ایسی آیت پیش کر سکے اور نہ ہی تیار کر سکے اور حضرت سیدہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کی طرف جن آیات کے دھڑا دھڑ تلاوت کرتے جانے کی نسبت ہے، وہ قطعاً اس مقصد و مدعا کو ثابت نہیں کر سکتیں، مثلاً يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ۔ (الآیہ) میں وراثت کا حکم ہے، مگر جس کا ذاتی مملوک مال ہوگا۔ وہی اس کا مخاطب ہوگا نہ کہ متولی اوقاف اور قومی املاک کے نگران اور بادشاہانِ اسلام بھی اپنے زیرِ تصرف اموال کو اس آیت کی رُو سے اپنی اولاد میں بطورِ وراثت تقسیم کرنے کے پابند ہوں گے۔ نیز وَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کا وارث ہونا ثابت ہے مگر وہ تو حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد ان کے خلیفہ اور قائم مقام حاکم تھے، لہٰذا ان کی وراثت کا وہی معنیٰ ہوا، جو کافی کلینی والی امام عالی مقام حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ والی روایت کا ہے؛ ثم للامام بعده يضعه حيث يشاء کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ مال آپ کے قائم مقام خلیفہ اور امام کے لیے ہوگا۔ اگر مال کی وراثت قانونِ شرع کے مطابق تھی تو صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیوں ہے؟ ان کی دوسری اولاد کیوں ذکر نہیں کی گئی، کیا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے کتنے بیٹے تھے؟ کتبِ تاریخ میں ان کے انیس فرزند مذکور ہیں۔ نیز اس میں وراثتِ نبوت والا معنیٰ مراد ہے اور اس کے ضمن میں علوم و معارف

لدنیہ کی وراثت والا جیسے کہ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم العلماء ورثۃ الانبیاءُ میں اسی وراثتِ علمی کو بیان کیا گیا ہے جو علماء کو انبیاء کرام کی طرف سے حاصل ہوتی ہے مگر شیعہ حضرات ہیں کہ انہیں جہاں لفظِ وراثت نظر آیا، اس کو قانونِ وراثتِ مالی کا ماٰخذ قرار دے دیتے ہیں جو خود فریبی اور عوام فریبی کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ب۔ حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں نے تو کتاب اللہ کی روشنی میں بتلایا تھا کہ فدک اموالِ فیئ سے ہے اور وہ قرآن مجید کی رُو سے اہلِ قرابت، یتامیٰ، مساکین، اور مسافروں کا حق ہے۔ مہاجرین و انصار کا حق ہے اور ان کے متبعین بالاحسان کا حق ہے، مگر سہ اصم عن الشیئ الذی لا اریدہ کے تحت اگر علماءِ شیعہ کے کان ہی بہرے ہو چکے ہوں، تو اس کا کیا علاج ہے اور کتبِ صحاح میں اس کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، مگر بصارت بھی بصیرت کی طرح زائل ہو چکی ہو تو ہم کیا کریں جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے باہمی نزاع کے موقعہ پر اور حضرت عثمان، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کے ان کی سفارش کرنے پر مفصل طور پر بیان فرمایا اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا مالِ فیئ ہونا اور اہلِ اسلام کا مشترکہ مال ہونا واضح کیا اور حضور سیدِ عالم صلی اللہ کی اس پر قبضہ کی نوعیت بھی واضح فرمائی اور یہ واضح ہے کہ مدعا کے مطابق ہو تو ایک مطابق ہو تو ایک ہی آیت کافی ہوتی ہے اور مدعا سے ربط و تعلق ہی نہ ہو تو بیسیوں بلکہ سینکڑوں کی دھڑا دھڑ تلاوت بھی کار آمد ثابت نہیں ہوتی، بنیادی ضرورت ذاتی ملکیت ثابت کرنے کی تھی، مگر اس کو ثابت ہی نہ کیا گیا، جس وجہ سے مدعا کا اثبات ممکن نہ رہا۔

عدمِ توریث والی حدیث پر اجماع کا بیان

ج۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو حدیث بیان فرمائی، اس کو علامہ موصوف نے خانہ ساز کہہ دیا اور موضوع و من گھڑت، حالانکہ اس حدیث کو حضرت صدیق اور حضرت عمر کے علاوہ حضرت سعد، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے بھی صحیح تسلیم کیا اور حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے بھی صحیح تسلیم کیا اور تمام ازواجِ مطہرات نے بھی صحیح تسلیم کیا، اس لیے ان میں سے کسی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ اور مواضعات میں سے اپنا حصہ طلب نہیں فرمایا تھا، بلکہ تمام مہاجرین و انصار اور اصحابِ رسول اور جملہ اہلِ بیت کرام کا اس پر اجماع و اتفاق ہو گیا جیسے کہ ابن ابی الحدید نے کہا ہے۔ شرح حدیدی، ج ۱۶، ص ۲۶۳ والصحیح انہ لم ینطق احد بعد ذالک من الناس من ذکر او انثی بعد عود فاطمۃ علیہا السلام من ذالک المجلس بکلمۃ واحدۃ فی المیراث۔ یعنی صحیح یہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اس مجلس سے لوٹنے کے بعد کسی بھی مرد اور عورت نے اموالِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ گویا ابتداء میں کچھ اختلاف ہوا بھی تو بعد ازاں حقیقتِ حال آشکارا ہو گئی اور سبھی اہلِ اسلام حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفق ہو گئے، تو جس حدیث پر اصحابِ رسول اور اہلِ بیت کا اجماع ہوا اس کو خانہ ساز کہنا بہت بڑی جسارت اور بے باکی ہے۔ نیز کوئی بھی عقلِ سلیم کا مالک یہ کیسے تسلیم کر سکتا ہے کہ اکیلی حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا تو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے نہ ڈریں اور انہوں نے تقیہ نہ کیا، لیکن حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما مع تمام بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب اور بنو عبد مناف ڈر گئے اور تقیہ کر گئے اور سبھی مہاجرین و انصار بھی ڈر گئے اور ایک جملہ بھی زبان پر نہ لا سکے اور مشورہ بھی نہ دے سکے اور پہلے ابن میثم کے حوالے

سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ماکنت الا رجلا من المهاجرين اوردت كما وردوا و صدرت كما صدروا ما كان الله ليجمعهم على ضلال ولا يضربهم عمًى۔
کہ میں عام مہاجرین میں سے ایک مہاجر آدمی تھا، وہ جہاں وارد ہوئے، میں وارد ہوا، جہاں سے وہ لوٹے، میں لوٹا، اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان یہ نہیں کہ انہیں گمراہی پر متفق کرے اور نہ یہ کہ انہیں حقیقتِ حال سے بے خبر رکھ کر مارے اور خلافت کے متعلق مہاجرین و انصار کے اجماع کو آپ نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی، اور پسندیدگی قرار دیتے ہوئے فرمایا: فان اجتمعوا على رجل وسموه اماما كان ذالك لله رضى - لہٰذا اس حدیث پر اور صدقِ صدیق پر اجماع ثابت ہو جانے کے بعد اور اجماع مہاجرین و انصار کے متعلق حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ان تاثرات کے بعد علامہ موصوف کے اس قول کی لغویت اور بطلان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟

تنبیہ: یہی روایت شیعہ کے شیخ صدوق اور ابو جعفر کلینی نے نقل کی ہے، ملاحظہ ہو انوارِ نعمانیہ جلد اوّل ص۹۴ اور اصولِ کافی جلد اوّل ص۳۲ و ص۳۴
قد روى الصدوق باسناده الى الصادق عليه السلام قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم (الى) وان العلماء ورثة الانبياء و ان الانبياء لم يورثوا دينارًا ولا درهمًا ولكن ورثوا العلم فمن اخذ به اخذ بحظٍ وافر۔

شیخ صدوق نے حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ تک واصل اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نا) علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور تحقیق انبیاء نے دینار اور درہم کا وارث کسی کو نہیں بنایا، لیکن انہوں نے علم کا وارث بنایا۔ پس جس شخص نے علمِ نبوت کو حاصل کیا، تو اُس نے حظِ وافر کو حاصل کر لیا۔

اور ظاہر ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فدک کے حاصل نہ ہو سکنے کی بنیادی دلیل کو جانتے تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا استدلال ان سے مخفی نہیں ہو سکتا تھا، تو اس کے باوجود اس امام صادق رضی اللہ عنہ کا اسے روایت کرنا اور شیخ صدوق کا اسے نقل کرنا، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صداقت کی بیّن دلیل اور ناقابل تردید بُرہان ہے اور اس حقیقت سے بھی کوئی مسلمان بے خبر نہیں رہ سکتا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا اور افتراء کرنا، اپنے آپ کو جہنمی بنانے کے مترادف ہے۔ اگر العیاذ باللہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دُنیوی مال کی خاطر افتراء سے کام لیا تھا، تو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو کس شوق میں جہنّم کا ایندھن بنا رہے تھے، ان کو تو نہ دنیا ہاتھ آ رہی تھی اور نہ دین قبضہ میں رہ رہا تھا اور آخرت بھی خراب ہو رہی تھی، لہٰذا یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ واقعی سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا تھا اور اس کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا تقیہ قرار دینا بالکل غلط ہے، کیونکہ انہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے مختوم وصیّت نامہ میں علانیہ اپنے مذہب کے پرچار کا حکم دیا گیا تھا اور تقیہ سے منع کیا گیا تھا جیسے کہ مبحث تقیہ میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

سوال: یہ حدیث خبرِ واحد ہے، اس سے تخصیصِ کتاب کا کیا جواز بلکہ مخالفِ قرآن ہونے کی وجہ سے خود ہی ناقابلِ اعتبار ہو گی؟

جواب: خبرِ واحد ظنّی تب ہوتی ہے، جب غیر رسول سے سُنی جائے اور اگر کوئی شخص براہِ راست رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے تو وہ اس کے حق میں اسی طرح قطعی ہو گی، جس طرح آیت کلام مجید اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے براہِ راست سُنی تھی، لہٰذا اس میں ظنّی ہونے کا توہّم باطل ہے، بلکہ دوسرے صحابہ کرام علیہم الرضوان نے بھی اس کو تسلیم کیا اور اہل بیت کی روایت سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی اور مخالف قرآن ہونے کا توہم بھی بذاتِ خود غلط ہے۔ قرآن مجید میں کہاں لکھا ہے کہ علماء ربّانیین انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث نہیں اور یہ کہاں لکھا ہے کہ جو انبیاء حاکم و بادشاہ

ہوتے تھے، ان کے زیرِ تصرف ہر شے ان کی ذاتی ملکیت ہوتی تھی۔

سوال: ہوسکتا ہے کہ انبیاء باعتبارِ وصفِ نبوت کے مراد ہوں یعنی نبی ازروئے نبی ظاہر ہونے کے درہم و دینار کا وارث کسی کو نہیں بناتے، لیکن ازروئے بشریت و انسانیت وہ وارث بناتے ہیں؟

جواب: دینار و درہم کو علم کے مقابل ذکر کیا گیا، لہٰذا یہ تقابل اس توجیہ و تاویل کے منافی ہے، کیونکہ ازروئے نبی ہونے کے علوم کے وارث بنائیں ازروئے بشر و انسان ہونے کے دراہم و دنانیر کا، تو وراثت دونوں طرح کے ہوگئے، پھر درہم و دینار کے وارث بنانے کی نفی غلط محض ہوگئی۔ علاوہ ازیں وصفِ نبوت کے ساتھ اس حکم کو متعلق کرنے کا مقصد ہی فوت ہوگیا، کیونکہ غیر نبی عالم و معلم ہو اور مالدار بھی تو وہ ازروئے عالم وارث علم بنا رہا ہے اور ازروئے بشریت و انسانیت مال کے وارث، بلکہ وصفِ نبوت کے ساتھ تعلیق کا صرف اور صرف یہ مقصد ہوگا کہ غیر انبیاء میں یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ نبی کے حق میں توریث کی صورت میں یہ توہم ہوسکتا ہے کہ اس نے نبوت کو بہانہ بنایا ہو اور اصلی مقصد دراہم و دنانیر کا جمع کرنا ہو، لہٰذا یہ بنیاد ہی ختم کر دی گئی، بخلاف غیر انبیاء کے وہاں اس قسم کا توہم ہی نہیں ہوسکتا۔

سوال: اس روایت میں درہم و دینار کے وارث بنانے کی نفی کی گئی ہے — زمین، باغات اور منازل و مساکن کے وارث بنانے کی نفی نہیں کی گئی، لہٰذا فدک وغیرہ کے وارث بنانے کی اس سے نفی کیسے ہوسکتی ہے؟

جواب: ہر صاحبِ عقل و ہوش جانتا ہے کہ درہم و دینار کی وہ اہمیت نہیں ہوتی جو زمین، باغات اور منازل کی ہوتی ہے۔ اصل اور پائیدار جائیداد درہم و دینار نہیں، بلکہ زمین اور باغات اور منازل ہیں۔ تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ حضور نبی الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء دنیا سے اپنی بے رغبتی اور زہد کا اظہار اس طرح کریں کہ ہم عارضی اور ناپائیدار دنیوی مال اکٹھا نہیں کرتے اور نہ اس کا کسی کو وارث بناتے ہیں، بلکہ منقولہ منافع اور پائیدار اور غیر منقولہ جائیداد جمع کرتے ہیں اور اسی کے وارث بناتے ہیں۔

نیز آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درہم اور ایک دینار کے وارث بنانے کی بھی نفی کر کے جاگیروں اور مواضعات، بساتین اور باغات و مساکن اور منازل کے وارث بنانے کی بطریقِ اُولیٰ نفی کر دی، کیونکہ ایسی کونسی زمین اور باغ اور منزل ہوگی جو ایک درہم یا ایک دینار سے خریدی جاسکے۔

بحمد اللہ تعالیٰ محدث جزائری کے بیہودہ سوالات اور اعتراضات کا جواب آچکا اور حدیث کی صحت پر سے شکوک و شبہات کا غبار چھٹ گیا اور شیعہ و سنی روایات کے مطابق حدیث کی صحت بھی ثابت ہوگئی اور اس پر مہاجرین و انصار کا بلکہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کا اتفاق بھی ثابت ہوگیا، اسی لیے محدث جزائری نے بھی تسلیم کیا: فخطبت خطبة بليغة اظهرت فيها الشكاية من ابي بكر وصاحبه ومن المهاجرين والانصار في ترك نصرتهم لها في ميراثها۔ (ج ۱، ص ۹۵) کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے بلیغ خطبہ دیا، جس میں ابوبکر اور اُن کے ساتھ حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کی شکایت کی اور تمام مہاجرین و انصار کی بھی کہ انھوں نے میراثِ فدک کے متعلق ان کی امداد و اعانت نہ کی اور دوسرے مقام پر ان حضرات کے علاوہ خود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شکایت اور ان پر سخت الفاظ میں تنقید بھی ذکر کی جاچکی ہے، گویا پورا اس وقت کا عالمِ اسلام عملی طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور زبان سے ایک لفظ ان کے خلاف اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی حمایتِ دعویٰ میں نہیں نکال رہے تھے تو آخر وہ امت جس کو بالخصوص "كنتم خير أمة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر" کے امتیازی نشان سے نوازا گیا، وہ سبھی گمراہی اور ضلالت پر متفق ہوچکے تھے اور فرمانِ خداوندی غلط ثابت ہوچکا تھا، نعوذ باللہ من ذالک اور بالآخر حضرت زہراء رضی اللہ عنہا بھی اخراجات کی کفالت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تقسیم کے مطابق تقسیم کی ضمانت ملنے پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے متفق ہوگئیں اور ان سے راضی ہوگئیں، گویا کہ

حدہے اپنی طرف نہیں بنی بھی اور اُن کی طرف خدائی ہے
اس سے بڑھ کر صداقتِ صدیق اور حقانیتِ حدیث اور اس کی صحت و واقعیت کی کونسی دلیل درکار ہوسکتی ہے۔ فبایّ حدیث بعدہٗ یومنون ٥

حضرتؓ علی کی حضرت ابوبکرؓ سے فدک میں موافقت اور علماءِ اہلِ تشیع کا اضطراب

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت پر اور ان کی بیان فرمودہ حدیث کے صحیح ہونے پر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اپنے دَورِ خلافت کے طرزِ عمل اور روش و کردار نے مہرِ تصدیق لگادی جو اہل السنت کی حقانیت کا بیّن اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے اور شیعہ مذہب اور ان کے مزعومات اور اوہام و ظنون وغیرہ کو جڑوں سے اکھیڑ دینے والا ہے، اس لیے انہوں نے عملی موافقت تسلیم کرنے کے باوجود جن تاویلات و تسویلات اور ہیریوں پھیریوں سے کام لیا ہے، وہ ملاحظہ کریں اور اس حدیقۃ الحیوانات کی سیر کر کے بھانت بھانت کی بولیاں اور مختلف النوع چہچے اور راگ سماعت فرماویں اور عین بھنور میں ڈولتی بلکہ ڈوبتی ہوئی مذہب شیعہ کی نیا کا مشاہدہ کریں۔

ابنِ بابویہ قمی کی تاویل اور اس کی لغویت

انہوں نے اپنی معروفِ زمانہ کتاب علل الشرائع میں کہا،

لان الظالم و المظلومۃ کانا قدما علی اللہ عزوجل و اثاب اللہ المظلومۃ و عاقب اللہ الظالم فکرہ ان یسترجع شیئاً قد عاقب اللہ علیہ غاصبہ و اثاب علیہ المغضوبۃ ص۶۳

چونکہ فدک کے بارے میں ظالم (یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اور مظلومہ (یعنی حضرت زہراء رضی اللہ عنہا) دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی جناب میں پیش ہو چکے تھے، اور ظالم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب و عتاب اور مظلومہ کو اُس کی طرف سے اجر و ثواب مل چکے تھے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس چیز کو واپس لینا پسند نہ کیا، جس پر غاصب کو عقاب اور مظلومہ کو ثواب مل چکا تھا۔

لیکن اس جواب اور توجیہ میں سقم یہ ہے کہ از روئے قانونِ وراثت جہاں فدک میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حصہ دار تھے، حضرات حسنین کریمین اور اُن کی ہمشیرگان بھی حصہ دار تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی عصبہ ہونے کے لحاظ سے حصہ دار تھے، اگر پہلا حق حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا تھا، تو اُن کے وصال کے بعد یہ حضرات حقدار تھے، تو ان مستحقین کو ان کا حق نہ دے کر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی اس ظلم و جور اور غصب میں حصہ دار بن گئے العیاذ باللہ! جبکہ ہر صاحبِ عقل و خرد یہ سمجھ سکتا ہے کہ کسی کی جائیداد غصب ہو جائے اور غاصب و مظلوم فوت بھی ہو جائیں تو نہ غاصب کی اولاد اور ورثاء کے لئے وہ جائیداد حلال ہوتی ہے اور نہ مظلوم کے ورثاء کا شرعی حق اس پر سے ختم ہو سکتا ہے، بلکہ حکام وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسے ظلم اور جور کو مٹائیں، مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بطور حاکم اسلام ہونے کے اس میں تصرف فرماتے رہے اور دوسرے ورثاء محروم رہے، تو گویا جور و استبداد اور غصب و ظلم میں حصہ داری اور اشتراک نہیں ہے۔ نیز اگر فدک واپس ہو جاتا تو مظلومہ کا اجر و ثواب ختم ہو جاتا یا نہیں؟ دوسری صورت میں واپس نہ کرنا بے سبب ہو گیا اور پہلی صورت بدیہی البطلان ہے، کیونکہ اس ظالم کا فعل تو اسی طرح قائم ہے، اس کی توبہ یا فدیہ تو پایا نہیں گیا اور مظلوم کی مظلومیت بھی اسی حال میں قائم رہی تو واپس کرنے کے باوجود جب مظلومہ کے اجر و ثواب میں کمی واقع نہیں ہو سکتی تھی، تو یہ سبب بھی باطل ہو گیا اور اگر مظلومہ کے اجر و ثواب کے باوجود ظالم کا عذاب و عتاب ختم ہو سکتا تھا، تو پھر واپس کرنا ضروری ٹھہرا تاکہ ایک مسلمان کو گو عند الشیعہ ظاہر الاسلام ہی سہی مگر اسے عذاب سے تو بچایا جا سکتا۔

سیّد مرتضیٰ کی توجیہ اور اس کی لغویت

سیّد مرتضیٰ علم الہدیٰ نے الشافی میں یہ توجیہ بیان کی ہے کہ چونکہ خلافت مل جانے کے باوجود ابھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تقیہ کسی نہ کسی صورت اور شکل میں موجود تھا، اس لیے خلفاء سابقین کے عمل و کردار اور روش و رفتار کے خلاف کرنا شریعتِ تقیہ کی خلاف ورزی کے مترادف تھا، لہٰذا آپ فدک واپس کرنے سے عاجز اور قاصر تھے: فالوجہ فی ترکہ علیہ السلام رد فدک ھو الوجہ فی اقرارہ احکام القوم وکفہ عن نقضہا وتغییرہا وقد بینا ذالک فیما سبق وذکرنا انہ کان فی انتہاء الامر فی بقیۃ من التقیۃ قویۃ (بحوالہ شرح حدیدی جلد ۱۶، ص۲۷۸) یعنی آپ کے فدک کو واپس نہ کرنے کی وجہ وہی ہے جو وجہ ان خلفاء کے نافذ کردہ احکام کو برقرار رکھنے اور ان کے کالعدم قرار دینے اور تبدیل کرنے سے باز رہنے کی وجہ ہے اور ہم قبل ازیں اسے بیان کر چکے ہیں اور ذکر کر چکے ہیں کہ امرِ خلافت آپ تک پہنچ جانے کے باوجود آپ ابھی سخت اور قوی تقیہ میں تھے۔

لیکن مقامِ حیرت ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے تقیہ نہ کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف مہاجرین و انصار کی موجودگی میں بروایاتِ شیعہ سخت ترین کلمات استعمال کیے اور مناظرہ و مباحثہ کیا اور ذرہ بھر خوف و خشیت اور فکرِ جان لاحق نہ ہوئی، مگر حضرت امیر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دوران بھی سخت تقیہ کی حالت میں ہوں۔ کیا التقیہ من دینی ومن دین آبائی۔ تقیہ میرا دین ہے اور میرے آباء کا دین۔ اور تسعۃ اعشار الدّین فی التقیۃ، لاایمان عن لا تقیۃ لہ۔ دین کا نوّے فیصد تقیہ میں ہے اور جو تقیہ نہ کرے، وہ مومن نہیں ہے۔ وغیر ذالک یہ روایات و احادیث حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو معلوم نہیں تھیں یا تبارہی بعد میں کی گئی تھیں۔

نیز تقیہ کا جواز تو جان سے مارے جانے یا جابر و سرکش لوگوں کی طرف سے مار پٹائی کی صورت میں ہو سکتا ہے، لیکن جب زمامِ حکومت ہاتھ میں ہو، ایسے مخلصین کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہو جو آپ کے اشارے پر جانیں قربان کر دیں اور زوجۂ رسول علیہ السلام کے ساتھ اور بدری صحابہ کے ساتھ جنگ سے بھی گریز نہ کریں، تو اس دوران تقیہ کا کیا مطلب؟ اور اس خلافتِ حقہ منصوصہ کا فائدہ ہی کیا ہوا کہ حصول سے قبل تبلیغِ حق بھی نہ ہو سکی جو عام علماء امت بھی کر کے افضل ترین جہاد کا ثواب کما لیتے ہیں: افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔ اور حصول کے بعد تنفیذِ حق بھی نہ ہو سکے، بلکہ خلفاء سابقین کی موافقت و متابعت کر کے لوگوں کو یہی باور کرائیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا، وہ درست تھا کیا؟ تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر پر اسی طرح عمل ہونا چاہیے اور یجاھدون فی سبیل اللہ ولایخافون لومۃ لائم۔ والی شان حضرت امیر علیہ السلام میں بقولِ شیعہ نظر آسکتی ہے کہ وہ جہاد کریں گے راہِ خدا میں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوں گے اور کیا جس امارت کی اللہ تعالیٰ نے یہ شان بیان فرمائی ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ حضرت امیر میں بقولِ شیعہ وہ ڈھونڈے سے مل سکتی ہے کہ جنہیں ہم زمین میں حکومت اور تصرف عطا کریں تو وہ نمازیں قائم کرتے (اور کراتے ہیں) اور زکوٰۃ دیتے (اور دلاتے ہیں) نیکی کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے ہیں، لہٰذا شیعہ حضرات نے یہ جواب دے کر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دین و ایمان اور عمل و کردار کو سخت داغدار کر دیا ہے اور آپ کے لیے دو اسلام جاری کرنے کا الزام عائد کیا۔ ایک ظاہر جو کہ اہلِ سنت کے مطابق اور موافق تھا اور دوسرا باطنی اور خفیہ جو اہل التشیع کو دستیاب ہو گیا۔ سبحانک ھٰذا بُھتان عظیم۔

قاضی نور اللہ شوستری کی توجیہ اوّل اور اس کی لغویت

قاضی نور اللہ شوستری نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اپنے زمانہ خلافت میں فدک اس کے ورثاء کے حوالے نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بیان کی کہ آپ نے رعیت اور عام اہل اسلام کو درست رکھنے اور ہمنوا بنانے کے لیے اسے سابقہ حالت پر برقرار رکھا، کیونکہ اہل اسلام کی عظیم اکثریت شیخین یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حسن سیرت اور خوبی کردار کی معترف و معتقد تھی اور فدک لینے میں ان پر الزام عائد ہوتا تھا، لہٰذا بنا بر مصلحتِ وقت اس کو اسی حال پر چھوڑا، اصل عبارت بھی ملاحظہ کرلیں۔

دیگر آنکہ چوں حضرت امیر درایّام خلافت خود دید کہ اکثر مردم حسن سیرت ابوبکر و عمر را معتقد اند و ایشاں را برحق میدانند قدرت برآں نداشت کہ کارے کند کہ دلالت دلالت بر فساد خلافت ایشاں داشتہ باشد بنا برآنکہ مخالفت قول و فعل ایشاں دلیل است بر آنکہ ایشاں ظالم بودہ اند و لیاقت خلافت حضرت پیغمبر نداشتہ الخ..
(مجالس المومنین جلد اوّل ص ۵۴)

جب حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے ایام خلافت میں دیکھا کہ اکثر لوگ ابوبکر اور عمر کے حسن سیرت کے معتقد ہیں اور ان کو خلیفہ برحق سمجھتے ہیں، تو آپ ایسے کام کی قدرت اور ہمت نہیں رکھتے تھے جو اُن کی خلافت فاسد ہونے پر دلالت کرے کیونکہ ان کے قول اور فعل کی مخالفت ان کے ظالم ہونے اور پیغمبر خدا کی خلافت کے لائق اور اہل نہ ہونے کی دلیل ہوتی (جبکہ آپ اہل اسلام کی اکثریت کے عقیدہ کے برعکس کا اظہار نہیں کرسکتے تھے، ورنہ خود آپ کی حکومت ختم ہوجاتی اور وہ لوگ مخالف ہوجاتے)

لیکن اس جواب کا سقم اور ضعف واضح ہے کیونکہ حقوق العباد اور اقامت عدل میں رعایا کا خوف یا ان کی دلجوئی کا خلل انداز ہوجانا، قرآن مجید کے ارشادات اور شریعت مطہرہ کے سنہری اصول کے سراسر خلاف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر تم ایمان دار ہو تو، اور فرمایا

وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ کہ اللہ تعالیٰ کے محب اور محبوب لوگ راہ خدا میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں نہیں لاتے۔

نیز اس جواب کی روشنی میں علماء شیعہ نے حضرت علی مرتضیٰ فاتح خیبر اسد اللہ الغالب کو عمر بن عبد العزیز سے بھی کم تر ثابت کر دکھلایا کہ بقول شیعہ انہوں نے فدک اولاد فاطمہ کے حوالے کردیا، حالانکہ ان کے دور میں بھی سارے لوگ حضرات شیخین کی خلافت حقہ اور حسن سیرت اور خوبی کردار کے معترف تھے، مگر انہوں نے نہ تقیہ ضروری سمجھا اور نہ اس مصلحت کی رعایت ضروری سمجھی، کیا صرف حیدر کرار اور اسد اللہ الغالب رضی اللہ عنہ کے لیے ہی ایسی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا لازم تھا اور ایسی کمزوریوں کا مرکز بن کررہ جانا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ!

توجیہ دوم اور اس کی لغویت

یہ توجیہ قاضی صاحب نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ذکر کی ہے کہ جب آپ سے یہی سوال کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فدک واپس نہ لینے میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا تھا، کیونکہ آپ کی ہجرت کے بعد حضرت عقیل بن ابی طالب نے آپ کا مکان فروخت کردیا تھا مگر جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا، تو آپ سے عرض کیا گیا:

الحال بخانہ خود نزول باید کرد آنحضرت فرمود مگر عقیل بجہت ما خانہ گزاشتہ۔ ما از آں اہل بیتیم کہ مالے را کہ از ما بظلم گرفتہ باشند باز آں رجوع نمیکنیم (ج ۱، ص ۵۴)

اب تو اپنے گھر میں قیام کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی مکان چھوڑا ہے؟ ہم اس گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں کہ جو مال ہم سے ظلم کے ساتھ لے لیا جاتے، وہ واپس نہیں لیتے۔

اس تاریخی توجیہ میں علماء شیعہ نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو بھی شامل کر دیا، لیکن اس کے باوجود بھی بات بن نہیں سکی کیونکہ تاریخی حقائق اس کو جھٹلاتے

ہیں۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر اموال فیئ کا انتظام سنبھال رکھا تھا۔ پھر بلا شرکت غیرے اس پر متصرف رہے ۔ اپنی خلافت کے دوران آپ اس پر قابض و متصرف رہے، جبکہ رسولِ معظم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بطورِ عاریت بھی اپنے سابقہ مکان میں قدم نہیں رکھا تھا اور نہ بطورِ مہمان۔ نیز حضرت امام حسن پھر حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہما) اور ان کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کے پاس فدک کے انتظامات رہے، لہٰذا یہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پر بہتان ہے اور سراسر غلط اور خلافِ واقع توجیہ

نیز خلافت بھی بقولِ شیعہ غصب کر لی گئی تھی، پھر آپ نے اس کو کیوں واپس لیا جبکہ وہی مالی تصرفات اس میں بھی ہیں۔ کیا صرف اس لیے کہ اس کا دائرہ وسیع تھا اور فدک کا علاقہ محدود تھا؟ نعوذ باللہ من سخافۃ العقول۔

قاضی نور اللہ شوستری کی بیان کردہ تیسری توجیہ اور اس کی لغویت

قاضی صاحب نے اپنے اسلاف کے حوالے سے تیسری توجیہ یہ ذکر کی ہے:

ایشاں کارہ بودند کہ فاطمہ بغصبۂ چیزے پیشِ خدا اور سول رود و اولادِ او بداں مسرور گردند پس ایشاں نیز اقتداء بحضرتِ فاطمہ کردند۔

یعنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس امر کو پسند نہیں کرتے تھے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تو ایک چیز کے غصب ہو جانے پر غصہ و غضب کی حالت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جا پہنچیں اور ان کی اولاد اس مال کو واپس لے کر مسرور اور خوش دل ہو، لہٰذا انہوں نے بھی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی اقتدا کی، یعنی وہ بھی فدک کے غم و غصہ میں اللہ تعالیٰ اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔

(ا) لیکن اس توجیہ و تاویل میں سقم و سخافت اور ضعف یہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؓ رضی اللہ عنہا پر تو بقولِ شیعہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے ظلم کیا اور آپ کے احتجاج اور مناظرے و مباحثے کے باوجود واپس نہ کیا۔ اگر وہ واپس کر دیتے، تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا لازماً واپس لے لیتیں، اسی لیے تو آپ نے کبھی ہبہ کا دعویٰ دائر کیا اور وہ ثابت نہ ہو سکا، تو وراثت کے قانون کا سہارا لیا وغیرہ وغیرہ تو اس میں حضرت زہراؓ رضی اللہ عنہا کی اقتدا کیسے ہو گئی؟

(ب) بلکہ اس توجیہ سے تو یہ لازم آیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی سنت پر عمل کیا۔ اگر شیخین نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو رُلایا تھا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے بچوں کو رُلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تاکہ وہ بھی جہان سے اسی طرح غم و غصہ کے ساتھ جائیں، جس طرح حضرت بتول زہراؓ چلی گئی تھیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ!

(ج) علاوہ ازیں یہ جواب تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے جیسے کہ عرض کر چکا ہوں نیز کافی کلینی میں مندرج حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق فدک و دیگر اموال کے متعلق شرعی حکم ہی یہ تھا کہ وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام و خلیفہ کے تصرف میں ہوگا تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس شرعی حکم کی خلاف ورزی کیوں کی، جس سے اہلِ اسلام کے حقوق میں بھی اور اہلِ بیت کرام کے حقوق میں بھی کوتاہی اور تقصیر لازم آ گئی جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شایانِ شان نہیں۔

(د) پھر یہ بتلانا بھی شیعہ حضرات کا فرض ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فدک کس کے پاس تھا اور اس کا منتظم و متولی کون تھا؟

چوتھی توجیہ اور اس کی لغویت

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فدک اس لیے واپس نہیں لیا تھا تاکہ لوگوں کی

اس تہمت سے بچ جائیں کہ آپ نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے حق میں جو گواہی دی تھی وہ ذاتی منفعت کی خاطر تھی جیسے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان پر افترا کیا تھا۔

دیگر برائے دفع تہمت نابر عالمیان واضح شود کہ گواہی امیرالمومنین علی مرتضےٰ برائے جر نفع نبود، چنانچہ ابوبکر برا و افترا کرد۔ ص۵۴

لیکن یہ توجیہ بھی لغو اور باطل ہے اور قرآن مجید کے اس ارشاد کے سراسر خلاف ہے: وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ نیز آپ اپنا حصہ چھوڑ دیتے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد کا حق انہیں دے دیتے، تو وہ الزام بھی ختم ہو جاتا اور عدل و انصاف کے تقاضے بھی پورے ہو جاتے۔ علاوہ ازیں آپ کی گواہی تو ہبہ کے لیے تھی نہ کہ وراثت کے لیے اور آخری دعویٰ بھی بقول بعض علمائے شیعہ آپ نے وراثت کے متعلق دائر کیا تھا، تو آپ ازروئے قانون وراثت ہی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا حصہ ان کی اولاد کو اور ازواج مطہرات کا حصہ انہیں دے دیتے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حصہ ان کی اولاد کو دے دیتے۔ وراثت میں تو آپ نے نہ شہادت دی تھی اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی اور نہ ہی آپ پر کوئی الزام عائد ہو سکتا تھا۔

الغرض حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلفاء سابقین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ عملی موافقت نے اس شیعی الزام و اتہام کو باطل قرار دیا اور سراسر لغو ٹھہرا دیا اور جور و ستم اور ظلم و استبداد کے سب افسانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور اہل سنت کے عقیدہ و نظریہ کی صداقت و حقانیت کو دوپہر کے سورج کی طرح واضح اور آشکار کر دیا اور علمائے شیعہ اس عمل کی توجیہات میں طرح طرح کی تلبیسات سے کام لیتے ہیں، مگر بات بنتی نظر نہیں آتی۔

ہبہ اور حق وراثت کے دعاوی میں سے مقدم کونسا تھا؟

علامہ موصوف نے چلتے چلتے یہ بھی دعویٰ کر دیا تھا کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے

پہلے پہل ہبہ کا دعویٰ دائر کیا، مگر شہادت رد ہو جانے پر وراثت کا دعویٰ دائر کر دیا، لیکن اس تقدیم و تاخیر میں بھی محض دعویٰ پر اکتفا کیا گیا ہے جیسے کہ موصوف کی عادت ہے۔ اس ضمن میں بھی شیعی اقوال مختلف ہیں۔ سید مرتضیٰ نے ہبہ کے دعویٰ کو مقدم مانا اور توریث کو مؤخر، مگر علامہ ابن میثم بحرانی نے حق وراثت کے دعویٰ کو مقدم اور ہبہ کے دعویٰ کو مؤخر تسلیم کیا ہے، ملاحظہ ہو جلد خامس ص۱۰۷ اور شارح ابن ابی الحدید نے اس تقدیم و تاخیر میں توقف سے کام لیتے ہوئے فرمایا: فاما انا فالاخبار عندی متعارضة یدل بعضها علیٰ ان دعوی الارث متاخرة ویدل بعضها علیٰ انها متقدمة وانا فی هٰذا الموضع متوقف۔ (شرح حدیدی ج ۱۶، ص۲۸۶)

بہرکیف اگر ہبہ کا دعویٰ مؤخر ہو تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیان فرمودہ حدیث کو خانہ ساز کہنا غلط ہو جائے گا اور حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف سے بھی اس کا اعتراف لازم آ جائے گا، کیونکہ ہبہ کے دعویٰ کے دائر کرنے کا جواز تبھی پیدا ہوگا۔ جب پہلے سے دستبردار ہو جائیں، اس لیے شیعہ حضرات کی قلبی خواہش اور سعی و کوشش یہی ہے کہ دعویٰ ہبہ کو مقدم رکھا جائے۔

سید شریف مرتضیٰ نے روایات متعارضہ میں سے تقدم ہبہ کی روایت کو ترجیح دیتے ہوئے کہا: انّ الحال تقتضی ان تکون البدایة بدعوی النحل یعنی ظاہر حال اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ہبہ کا دعویٰ مقدم ہو، لیکن یہ حال بھی علماء شیعہ کی حالت کو تقویت فراہم نہیں کر سکتا، کیونکہ ہبہ کے ساتھ قبضہ بھی پایا جاتا، تو گواہوں کی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ خود قبضہ ہی دلیل ملک بن جاتا اور دوسرے اموال فیئ پر قبضہ نہ ہونا اور صرف اس پر قبضہ کا پایا جانا دلیل یقین بن جاتا، جیسے کہ قاضی القضاۃ نے مغنی میں کہا: فلو کانت فی یدها تتصرف فیها و فی ارتفاقها کما یتصرف الناس

فی ضیاعھم و املاکھم لما احتاجت الی الاحتجاج بآیۃ المیراث ولا یدعوی النحل لان الید حجۃ (ابن ابی الحدید ج ۱۶، ص ۲۸۵) کہ اگر فدک آپ کے قبضے میں ہوتا اور آپ اس میں اور اس کی آمدنی میں تصرف فرماتی تھیں، جیسے کہ لوگ اپنی جائیدادوں اور املاک میں متصرف ہوتے ہیں، تو آپ کو آیاتِ میراث سے استدلال کی اور ہبہ کے دعوی کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ شہادت پیش کرنے کی، کیونکہ قبضہ ہی دلیلِ ملک تھا، نیز متعدد روایات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل اور راہ و روش کی مخالفت نہیں کر سکتا اور جو عمل اس فدک و دیگر اموال فی میں آپ کا تھا، وہی میں بھی کروں گا اور بقولِ ابن میثم آپ اس پر راضی ہو گئیں، تو ثابت ہو گیا کہ ظاہر حال حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا فدک پر قبضہ ثابت نہیں ہونے دیتا اور ہبہ بلا قبض مفید ملک نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہبہ بلا قبض کے لیے شہادت کا ہونا لازم تھا، جبکہ وراثت کے استحقاق میں شہادت کی ضرورت نہیں تھی، تو یہ ظاہر حال اس امر کا متقاضی ہے کہ وراثت کا دعویٰ مقدم ہو اور ہبہ کا اس سے مؤخر۔ گو اس میں حصہ کم ہی کیوں نہ ہو جاتا، لیکن قانونِ وراثت بظاہر عام تھا تو رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی املاک میں وراثت کا تحقق محتاجِ شہادت نہیں تھا، جبکہ ہبہ کی صورت میں سارے فدک کے حصول کا امکان تھا لیکن اس پر شہادتیں قائم کرنا پڑتی تھیں، لہذا ان دونوں جہتوں کے پیشِ نظر دعویٰ وراثت میں ہی سہولت تھی۔ لہذا ظاہر حال کا مقتضیٰ یہی ہے کہ دعویٰ وراثت مقدم ہو۔

بہ حال یہ بھی اہلِ تشیع کے لئے مستقل دردِ سر ہے کیونکہ دونوں دعوےٰ باہم متعارض ہیں ہبہ تھا تو وراثت کی نفی ہو گئی اور حق وراثت تھا تو ہبہ سے دستبرداری ثابت ہو گئی، اور تقدیم و تاخیر میں بھی جزم اور یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

نوٹ: ہبہ کے دعویٰ کا دار و مدار عطیہ عوفی کی روایت پر ہے جس کی حالت بیان ہو چکی، لہذا صورتِ حال واقعیہ یہ ہے کہ ہبہ کا دعویٰ نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی پایا گیا۔

ہبۂ فدک کا بطلان تعلیماتِ نبویہ اور اسوۂ مصطفویہ کی رو سے

قارئین کرام! آپ نے اس ضمن میں شیعہ حضرات کی پیش کردہ دلیل کا حال تو ملاحظہ کر لیا، لیکن آئیے اس ضمن میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور آپ کے اپنے طرزِ عمل اور روش و کردار کی ایک جھلک دیکھ کر اندازہ کریں کیا ایسے ہبہ جات کی اس پس منظر میں کوئی وجہ جواز ہو سکتی ہے

۱۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے اپنے لیے سہولیات کا مطالبہ کیا یعنی فراخیٔ رزق وغیرہ کا، جبکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں مہینہ مہینہ اور دو دو ماہ تک چولہوں میں آگ بھی نہیں جلتی تھی، تو اس کے بعد آنحضرت کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ماہ تک اُن کے ساتھ میل جول نہ رکھا اور کلام و خطاب تک ترک کر دیا اور مکمل بائیکاٹ کر دیا اور مہینہ گزرنے پر اللہ تعالیٰ نے بھی یہ ارشاد فرمایا،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ( )

اے میرے نبی! اپنی بیویوں سے فرما دیں، اگر تم حیاتِ دنیا اور اس کی زیب و زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمہیں .. متاعِ دنیا دوں اور تمہیں چھوڑ دوں اچھی طرح سے اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب گار ہو اور اس کے رسول کی اور دارِ آخرت کی، تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لئے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

کیا یہ مقامِ تعجب نہیں کہ جن بیویوں کا خرچہ آپ کے ذمہ واجب الادا اور لازم ہے۔ اگر وہ اس کا مطالبہ کریں اور امت کی عورتوں جیسے سہولیات بھی امت کے بادشاہ کی بیویاں ہو کر طلب کریں تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ناگوار گزرے اور بائیکاٹ فرمادیں اور اللہ تعالیٰ کو بھی ناگوار گزرے اور دنیا اور اس کی سہولیات اور مال و متاع کو اپنی ذات، رسولِ گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اور دارِ آخرت کے مقابل رکھ کر فرمائے کہ ہم سے اور آخرت سے تعلق ہے، تو دنیا چھوڑ دو اور اس کی طلب ہے، تو ہمارا تعلق ختم ہو جائے گا، لیکن جب اس صاحبزادی کا معاملہ ہو جن کا خاوند بفضلہ تعالیٰ موجود اور اخراجات کا کفیل ہے تو فوری طور پر اللہ تعالیٰ بھی فدک جیسی بقول شیعہ خطیر آمدنی والی جائیداد ان کو ہبہ کرنے کا حکم دے دے اور آپ بھی اس میں دیر نہ کریں اور ازواجِ مطہرات کو نہ وصالِ نبوی کے بعد دوسری جگہ نکاح کی اجازت ہو اور نہ ان کے لیے کوئی جائیداد ہبہ کی جائے اور نہ وراثت میں ہی بقولِ شیعہ ان کا حق ہو تو آخر بتلایا جائے کہ ازواجِ مطہرات اور حضرت فاطمہ زہراؓ رضی اللہ عنہا کے لیے زہد و ورع کے یہ دوہرے پیمانے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان ہیں اور کیا اسلام کے عدل و انصاف کو یہ تفریق اور امتیاز گہنا کر نہیں رکھ دے گا، جبکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دونوں جہانوں کی بادشاہی پیش کی، لیکن آپ نے فقر کو اختیار فرمایا۔ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا ہاتھی دانت کے کنگن اور ہار استعمال کریں، تو آپ انہیں اتروا دیں، دروازے پر پردہ لٹکائیں، تو قدم مبارک اندر رکھنا گوارا نہ کریں اور فرمادیں تم کسی جابر بادشاہ کی بیٹی نہیں ہو، بلکہ نبی کی بیٹی ہو۔ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا چکی پیسنے اور آٹا گوندھنے وغیرہ کی مشقت کے تحت ایک لونڈی اور خادمہ کا مطالبہ کریں تو آپ ان کو صبر و استقامت کا حکم دیں اور مزید برآں رات کو سوتے وقت چونتیس مرتبہ اللہ اکبر، تینتیس مرتبہ سبحان اللہ اور تینتیس مرتبہ الحمد للہ پڑھ کر سونے کا حکم دیں اور فرمائیں یہ خادمہ کی نسبت بہت بہتر ہے (بخاری شریف)

حضرت زہراء رضی اللہ عنہا مطالبہ بھی فرمادیں کہ اپنے ان دونوں بیٹوں کو کوئی چیز ہبہ فرمائیں، کہ میں نے حسن (رضی اللہ عنہ) کو اپنی حوصلہ مندی اور سیادت کا مظہر بنایا ہے اور حسین (رضی اللہ عنہ) کو اپنی جرأت و شجاعت بخشی ہے۔ مال و متاع قطعاً نہ بخشا، ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ جلد چہارم ص ۱۷۶ و ۱۷۵، انوارِ نعمانیہ جلد اوّل، ص ۹۱)

ان حقائق و واقعات اور اس تعلیم و تربیت اور عمل و کردار مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ہر مسلمان یقیناً یہی سمجھتا ہے کہ وہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم ان مقدس ہستیوں کو دنیا سے بے رغبت اور متنفر دیکھنا ہی پسند فرماتے تھے اور انہیں امیر و رئیس اور نواب و سرمایہ دار بنانا قطعاً پسند نہیں فرماسکتے تھے، لہٰذا ہبہ کی روایت بالکل بے بنیاد ہے اور بذاتِ خود بھی غلط اور موضوع ہے اور درایت کے بھی خلاف ہے اور واقعات و حقائق کے بھی۔

جواب السادس، چھٹا جواب علامہ صاحب کا یہ تھا کہ جب حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی آیات کے جواب میں صرف ایک حدیث پڑھ دی گئی تھی اور فدک دینے سے انکار کر دیا گیا تو اس کے ردِ عمل کے طور پر آپ نے مکمل بائیکاٹ کر دیا، حتیٰ کہ وصیت فرمائی کہ میرے جنازے میں یہ دونوں شامل نہ ہوں وغیرہ، لیکن یہ ساری تقریر بوجوہ لغو و بیہودہ ہے۔

اوّل، علامہ صاحب مسئلہ فدک میں کلام کر رہے تھے۔ آپ کو اس کی نوعیت و حیثیت کے مطابق دلائل و براہین کا سہارا لینا چاہیئے تھا، یعنی حضرت فاطمہ زہراؓ رضی اللہ عنہا کے موقف کی قوت بیان کرنی چاہیے تھی، مگر آپ نے مجلس پڑھنی شروع کر دی ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کا موقف صحیح تھا کہ بھائی کے آنے سے پہلے جہاد و قتال شروع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ یہ نہ کہیں کہ میرے صلاح و مشورہ کا انتظار کیوں نہ کیا، لہٰذا صرف زبانی وعظ و نصیحت پر اکتفاء کیا، لیکن حضرت کلیم علیہ السلام ناراض ہو گئے اور ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا، لیکن کیا حضرت کلیم اللہ

کے اس اقدام سے حضرت ہارون علیہ السلام کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے اور ان کو منصبِ خلافت کے نااہل سمجھیں گے؟ جب نہیں اور یقیناً نہیں تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی کبیدگی اور پریشانی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے موقف کے صحیح ہونے میں توقف کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی، بلکہ دلائل کی قوت اور دلالت پر نظر رکھی جائے گی، لہذا علامہ موصوف عوام اور جہالِ شیعہ کے سامنے مجلس پڑھتے ہوتے جو مرضی ہو کہیں، مگر اہل السنّت کے مقابل دلائل پیش کرنے کی تکلیف فرمائیں، انہیں ایسی مجالس سننے سے کیا غرض؟

دوم: جب حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے رشتہ کا معاملہ تھا، تو ڈھکو صاحب کو یاد آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ان کے پڑنانے لگتے تھے، مگر یہاں پر یہ یاد نہ آیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے نانے لگتے تھے اور نواسی کو اپنے نانے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار اور یارِ غار کے ساتھ اور ایک فانی متاعِ دنیا میں تنازع اور اختلافِ رائے کی وجہ سے اتنی دور تک نہیں جانا چاہیئے تھا، جبکہ وہ اسی فدک سے اخراجات کی کفالت کی ضمانت بھی دے رہے تھے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کے مطابق عمل کرنے کا عہد و پیمان بھی کر رہے تھے اور اپنا گھر بار بھی حاضر کر رہے تھے اور ابتداء اسلام سے اب تک کی قربانیوں کو نظر انداز کرنا اور اس نسبت اور تعلق کو نظر انداز کرنا اور ان کی عمر عزیز اور بزرگی کو نظر انداز کرنا لجپال گھرانے اور سرچشمہائے مہر و وفا کے شایانِ شان کس طرح ہو سکتا تھا، مگر نہ اُدھر اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ اِدھر خاموشی اختیار کی جا سکتی ہے: ولنعم ما قال ابن ابی الحدید فسبحان اللہ ما اشد حب الناس لعقائدھم۔

سوم: حضرت زہراء رضی اللہ عنہا اپنی امہات کو خرچہ دینے کا ارادہ رکھتی تھیں یا نہیں؟ دوسری صورت تو قطعاً درست نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی انسان بقائمی عقل و خرد اس کا قول کر سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیر تصرف اموال املاک میں سے ازواجِ مطہرات نہ وراثت کی حقدار تھیں اور نہ اخراجات کی حقدار، اور پہلی صورت میں اگر فدک وغیرہ

کا انتظام دوسرا شخص کرتا اور سب کے اخراجات پورے کرتا رہتا اور وہ بھی ایسا شخص جو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا نانا ہوا اور ان کی امہات میں کسی کا باپ اور دوسریوں کا انتہائی معتمد علیہ تو پھر اس قدر ناراضگی اور بائیکاٹ کرنے کی نوبت کیوں آئی۔

چہارم: بیٹی ماؤں کے مقدس ہاتھ سے خرچہ لیتی، تو اس کے شان ادب و احترام کے زیادہ لائق تھا؟ یا مائیں اپنی بیٹی کے ہاتھ سے اخراجات وصول کرتیں تو اس میں ان کی عظمت کا زیادہ اظہار تھا؟ بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی جھگڑتیں، تو حق تو یہ تھا کہ اپنی ماؤں کی وراثت یا ان کے اخراجات کی خاطر جھگڑتیں نہ کہ محض اپنی ذات کے لیے۔ کیا آپ کے یہ شایان تھا کہ صرف اپنی فکر کرتیں اور ان ماؤں کا ذرہ بھر خیال نہ کرتیں، جن کا نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بیٹا تھا جو کفالت کرتا نہ انہیں دوسری جگہ نکاح کی اجازت نہ ان کے لیے وراثت نہ ہبہ۔ پھر بھی اگر فکر کریں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کریں۔ آخر اس میں حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی کونسی عزت افزائی کی جا رہی ہے اور ان کے لیے ایسے بائیکاٹ اور دائمی ناراضگی ثابت کر کے ان کے مقام و مرتبہ میں کونسی عزت افزائی کی جا رہی ہے اور ان کی کونسی عظمت و رفعت اور برتری و فضیلت ثابت کی جا رہی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس مذہب کی ایجاد و اختراع کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے مقتدایانِ اسلام کی عظمتوں کو گھٹایا جائے اور خصوصاً اہل بیت کو نشانہ بنایا جائے اور قربانِ بارگاہِ نبوی کو موردِ طعن و تشنیع قرار دیا جائے۔

جواب السابع: ساتویں جواب میں بھی علامہ موصوف فدک پر دلائل پیش کرنے کی بجائے مجلس پڑھتے ہی نظر آئے اور قیاسِ شعری سے کام لیتے ہوئے کہا کہ بخاری و مسلم کی روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو ناراض کیا اور یہ بھی انہیں سے ثابت ہے کہ جو اُن کو ناراض کرے، اُس نے اللہ تعالیٰ کے رسول کو ناراض کیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول کو ناراض کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا اور جو اللہ اور رسول کو ایذا دیتا ہے، وہ دُنیا و آخرت میں ملعون ہے

لہٰذا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سُسر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے نانا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھاوج حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے خاوند یارِ غار اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام، حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں امت کے نائب امام ملعون ٹھہرے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ جن کی وفات کے بعد اور اپنے دورِ خلافت میں بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ افضلیت و خیریت کی گواہی دیتے رہے اور اُن کی وفات کو اُمت کے لیے بلکہ خود اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے رہے اور ان جیسے نیک اعمال کے لیے اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرتے رہے وغیر ذالک جو کہ مفصل طور پر بیان ہو چکے، بلکہ قرآن مجید سے اور خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بیسیوں آیات اور بے شمار احادیث میں ان کے فضائل بیان کیے جا چکے ہیں، ان پر ایک نظر ڈال لیں اور پھر اس اختراعی اور وہمی مقدمات پر مشتمل قیاسِ شعری کی حقیقت معلوم کریں۔

اوّل، پہلی خرابی اس قیاس میں یہ ہے کہ ناراض ہونے اور ناراض کرنے میں جو واضح اور نمایاں فرق ہے، اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اگر فدک کے بارے میں حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سنی ہوئی حدیث بیان کی تو اس میں ناراض کرنے والی کونسی بات تھی؟ اگر تقسیم فدک میں عملِ رسول تبلایا، اور اسی پر کاربند رہنے کا عہد کیا تو اس میں ایذا رسانی کا کونسا پہلو تھا اور اگر بقولِ شیعہ فدک پر ہبہ کے دعویٰ کے گواہ طلب کیے اور نصابِ شہادت پورا کرنے کے لیے کہا تو اس میں ناراض کرنے یا ایذا پہنچانے والی کونسی بات ہے، یہ تو انہیں کے اباجان کی شریعت کے ابدی اُصولوں کی پیروی تھی، جو سب کے لیے یکساں تھے، لہٰذا جب ناراض کرنا ہی بے بنیاد دعویٰ ٹھہرا تو اس پر موقوف ساری شاعری لغو ہو گئی۔

دوم، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سات باغات میں سے اپنا حصہ طلب کیا تھا مگر آپ نے کہا یہ مال وقف ہے، اس میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی تو کیا یہاں بھی کہا جائے گا کہ آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ناراض کیا اور ان کو ایذا پہنچائی، حالانکہ وہ آپ کے دادے تھے اور ان کو ایذا پہنچانا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانا ہے اور

آپ کو ایذا پہنچانا اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانا ہے وغیرہ اور اگر یہاں یہ قیاس درست نہیں، کیونکہ آپ نے تو شرعی حکم بیان کیا تھا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ناراض کرنا یا ایذا دینا ہرگز ہرگز آپ کا مقصد نہیں تھا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں بھی یقیناً یہ قیاس درست نہیں ہے۔

سوم، اگر شیعہ حضرات ایسی ترتیب دے کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نشانہ بنا سکتے ہیں، تو خارجیوں کو بھی یہ موقعہ مل سکتا ہے کہ وہ ان مقدماتِ دلیل کو مرتب کر کے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو دنیوی مال کی خاطر اپنے والدِ گرامی کی شریعت کا مخالف ثابت کریں، کیونکہ اختلافی امور کو قرآن و سُنّت کی طرف لوٹانا ضروری ہے اور قرآن نے ان اموال کو فیٔ قرار دیا اور ان کے مصارف بیان کر دیئے، جس سے بصراحت ذاتی ملکیت ہونے کی نفی ہوتی ہے اور احادیث میں بھی ان اموال کو حاکمِ اسلام کے زیرِ تصرف املاک اور قومی اموال قرار دیا گیا ہے جو شیعہ و سنّی دونوں کی کتابوں میں مروی و منقول ہیں تو اس طرح حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا حدیث بیان کرنے پر ناراض ہونا گویا شریعت کو رد کرنا ہے اور قرآن کریم فرماتا ہے، فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ ز (مجھے قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک تمہیں اپنے اختلافات میں حاکم اور فیصل نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں، اس سے جو تم نے فیصلہ کیا اور مانیں، جیسے کہ حق ہے ماننے کا۔

تو کیا شیعہ حضرات ان خارجیوں کے اس قیاس اور اس کے نتیجہ کو تسلیم کر لیں گے۔ العیاذ باللہ

چہارم، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان فرمائی اور ان کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق کا اعزاز بخشا ہے، جیسے کہ بحوالہ قمی عرض کیا جا چکا ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کو الخلیفۃ الصدیق تسلیم کیا جیسے کہ ابن میثم کے حوالے سے عرض کیا جا چکا ہے اور ان کی طرف سے حق کی تصدیق اور باطل کے ابطال کا بھی اعتراف فرمایا اور امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا،

نعم صدیق نعم صدیق نعم صدیق من لم یقل له الصدّیق فلا صدقه قولا فی الدنیا ولا فی الآخرۃ۔

ہاں وہ صدیق ہیں، ہاں وہ صدیق ہیں، ہاں وہ صدیق ہیں، جو انہیں صدیق نہ کہے اللہ اس کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے، تو ایسی صورت میں آپ کو سچا نہ ماننے والا کیا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے کی جسارت نہیں کر رہا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی جھٹلانے کی اور امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی، روایت کی رُو سے وہ دُنیا و آخرت میں جھوٹا قرار دیئے جانے کا حقدار نہیں ہے، لہٰذا اس روایت کو خانہ ساز کہنا قطعاً غلط ہے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی طرف اسے جھٹلانے کی نسبت یقیناً بے بنیاد ہے اور ناکردہ گناہ کسی سے بائیکاٹ کرنے کا شریعتِ مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں نہ کوئی جواز ہے اور نہ ایسی مقدس ہستیاں ایسے کر سکتی ہیں، یہ سراسر افسانے ہیں، جیسے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے اور حضرت امام ابوجعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے ان حضرات کی برأت اور ان کے اس عمل و کردار کی درستگی اور صحت ثابت ہو چکی اور بالخصوص عمل مرتضےٰ رضی اللہ عنہ سے۔

پنجم: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انصار کو اپنا خلیفہ نصب کرنے سے باز رکھنے کے لیے جب حدیث بیان فرماویں: الائمۃ من قریش کہ خلفاء و حکام قریش سے ہی ہوں گے، تو وہ آپ کو سچا بھی مانیں اور اپنے موقف سے دستبردار بھی ہو جائیں اور اپنے شہر اور علاقہ میں بطورِ پناہ حاصل کرنے کے آنے والوں کو اپنا حاکم بنا لیں مگر قومی ملکیت سے تعلق رکھنے والے فدک کے متعلق وہی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کریں، تو اُن کی نواسی انہیں جھٹلا دے اور ان سے مکمل بائیکاٹ کر دے تو کیا علماء شیعہ سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تمہارے افسانوں کے مطابق حدیثِ رسول کی قدر انصار نے زیادہ کی نفی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر نے اور حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سسر اور یارِ غار کا احترام انصار نے زیادہ کیا یا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی صاحبزادی نے اور انصار اپنی حکومت چھوڑنا گوارا کر لیں اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا مختصر سا قطعہ زمین چھوڑنا گوارا نہ کریں جس کی آمدنی بھی خود اُن پر اور اُن کی ماؤں اور دیگر بنو ہاشم پر خرچ کرنے کی ضمانت دی جا رہی تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کی امین اور آپ کے ورع و زہد اور توکل کی مظہر اتم حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے یہ شایانِ شان تھا کہ اس فدک کی خاطر وہ حدیث شریف کو نظر انداز کریں، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بزرگی کو نظر انداز کریں اور حطامِ دنیا کی خاطر مکمل بائیکاٹ کریں بلکہ صحیح روایات وہی ہیں، جن میں حدیث سُن کر آپ نے سکوت اختیار فرمایا اور نبوی طرزِ عمل اپنانے کے صدیقی معاہدے پر رضامندی، کا اظہار فرمایا جن کی تفصیلات گزر چکی ہیں یعنی نہ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کو ناراض کیا اور نہ ایذا پہنچائی اور نہ ہی حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا اُن پر ناراض ہوئیں اور نہ مکمل یا غیر مکمل بائیکاٹ ہی پایا گیا اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان ہے جیسے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ہم نے فدک کی سخاوت کر دی اور اسے ہم نے کیا کرنا ہے، جبکہ کل تک بھی زندہ رہنے کی امید نہیں ہے۔

حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی رضامندی کے لیے شیخین کی مساعی جمیلہ

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ناراض کرنے اور انہیں ایذا پہنچانے کا قطعاً کوئی اقدام نہیں کیا، لیکن بایں ہمہ بشری تقاضوں کے تحت بعض روایات کے مطابق ان کے دلِ اقدس پر جو غبار تھا اور پریشانی پائی گئی تھی، تو اسے دُور کرنے اور آپ کو خوش و خرم اور راضی کرنے کے لیے کونسی ممکنہ صورت تھی جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اختیار نہ کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی امداد و اعانت میں مقدور بھر سعی اور کوشش سے گریز نہ کیا، جس سے ان حضرات کی عقیدت اور اخلاص نیمروز کی طرح ظاہر ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ان مقتدایانِ اُمت کے ساتھ اتفاق و اتحاد بھی ظاہر اور واضح ہوتا ہے۔

صاحبِ علل الشرائع نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی طویل روایت نقل کی ہے، جس سے ضروری حصّہ پیشِ خدمت ہے۔ فلما مرضت فاطمة مرضها الذی ماتت فیه اتیاها عائدین واستاذنا علیها فابت ان تاذن لهما فلما رأی ذالك ابوبكر اعطی الله عهداً الا یظله سقف بیت حتی یدخل علی فاطمة ویترضاها فبات لیلة فی الصقیع ما اظله شیئ ثم ان عمر اتی علیا فقال ان ابابكر شیخ رقیق القلب وقد كان مع رسول الله فی الغار فله صحبة وقد اتینا غیر هذه المرة مراراً نرید الاذن علیها وهی تابی ان تاذن لنا حتی ندخل علیها ونترضاها فان رءیت ان تستأذن لنا فافعل قال نعم فدخل علی علی فاطمة علیها السلام فقال یا ابنة رسول الله قد كان من هذین الرجلین ما قد رأیت وقد ترددا مراراً كثیرةً ورددتهما ولم تاذنی لهما وقد سألانی ان استاذن لهما علیك (الی) قال علی قد ضمنت لهما ذالك قالت ان كنت قد ضمنت لهما شیئاً فالبیت بیتك والنسآء تتبع الرجال ولا اخالف علیك بشیئ فاذن لمن احببت فخرج علی فاذن لهما (علل الشرائع مصنفہ ابن بابویہ قمی ص۷۳، ناسخ التواریخ، از کتاب دوم- ص۱۲۶تا۱۲۸)

یعنی جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں، جس بیماری میں ان کا وصال ہو گیا، تو ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی، آپ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ وہ اس وقت تک کسی مکان کی چھت کے نیچے سایہ حاصل نہیں کریں گے، جب تک وہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں راضی نہیں کر لیں گے، چنانچہ آپ نے ایک

رات حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے دروازے پر) سخت سردی میں بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ پھر حضرت عمر، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ابوبکر صدیق بہت نرم دل بزرگ ہیں، صحابیٔ رسول بھی ہیں اور یارِ غار بھی اور ہم اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اندر حاضر ہونے کی اجازت طلب کی ہے، لیکن آپ اجازت نہیں دیتیں تاکہ ہم حاضر ہو کر ان کو راضی کر سکیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں، تو ہمارے لیے اذن طلب کریں تو آپ نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے۔ چنانچہ آپ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر! ان دونوں حضرات سے جو کچھ سرزد ہوا، وہ آپ کے علم میں ہے اور وہ کئی دفعہ حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے ان کو لوٹا دیا ہے اور اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ اب انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ میں آپ سے ان کے لیے اذن طلب کروں (تا) اور میں نے اُن کے لیے اذن و اجازت کی ذمہ داری قبول کر لی ہے، تو آپ نے فرمایا اگر آپ نے اجازت کی ذمّہ داری قبول کر لی ہے تو گھر تمہارا ہے اور عورتیں مردوں کے تابع ہوا کرتی ہیں، میں آپ کی کسی طرح کی مخالفت نہیں کروں گی، جس کو اندر آنے کی اجازت دینا چاہو، اجازت دے دو؛ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر نکلے اور ان دونوں حضرات کو اندر آنے کی اجازت دے دی الخ

اس روایت میں غور و خوض کرنے سے ان دونوں حضرات کی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے محبت و عقیدت بھی واضح ہوتی ہے اور ان کے راضی کرنے کے لیے ان کی مساعیٔ جمیلہ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ان سے ہمدردی اور اخلاص اور اس طرح کی کوششوں کے باوجود اگر نواسی اپنے نانے سے راضی نہیں ہوتیں، جبکہ انہوں نے صرف حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سُنائی اور عملِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمایا اور اس عمل کی خلاف ورزی کرنے پر راہِ راست سے ہٹ جانے اور اُخروی مواخذے کا اندیشہ ظاہر کیا، تو اس سے حضرت صدیق اور

حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی ذاتوں پر کوئی حرف آنے کی بجائے خود حضرت زہراء کی شخصیت متاثر ہو جائے گی، لہٰذا اندریں صورت بھی ان کے لیے مکمل بائیکاٹ ثابت کرنا ان سے کسی عقیدت کا اظہار نہیں، بلکہ بدترین دشمنی اور عداوت کا اظہار ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے مہاجرین کس قدر مال و دولت اور سازوسامان اور گھر بار چھوڑ کر اور درویش و فقیر بن کر وطن سے سینکڑوں میل دُور جا کر ڈیرے لگائیں اور انصار ان کے لیے اپنا مال و زر اور ساری پونجی قربان کر دیں اور دُنیا کو پیارا نہ سمجھیں، لیکن سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر کو متاعِ دنیا سے اس قدر پیار ہو کہ سات باغات قبضے میں ہونے کے باوجود صرف فدک کے بیت المال کا حصہ بن جانے پر اور امت کے یتامیٰ و مساکین، مسافروں اور مہمانوں نیز جہاد کے لیے ضروری سازوسامان کی خریداری میں استعمال کیے جانے پر اس قدر ناراض ہو جائیں کہ وہ ناراضگی ایسے بزرگوں کی منت سماجت اور در پر پڑے رہنے کے باوجود دُور ہی نہ ہو سکے، تو یہ قطعاً ان کے شایانِ شان نہیں، اور ایسے قصے گھڑنے اور بیان کرنے میں ان کی کسرِ شان اور تنقیص و توہین کا مکمل سازوسامان اور اہتمام و انتظام ہے۔

حضرت سیّدہ زہراء رضی اللہ عنہا کی رضامندی

قبل ازیں متعدد حوالہ جات حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی رضامندی کے گزر چکے ہیں، ان پر پھر نگاہ ڈال لیں:

۱۔ ابن میثم نے شرح نہج البلاغہ میں ذکر کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا لك علیّ اللّٰہ ان اصنع بھا کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصنع فرضیت بذالك الخ میں آپ کو اللہ تعالیٰ ضامن دیتا ہوں کہ میں فدک میں وہی عمل کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے تو آپ اس پر راضی ہو گئیں ——— اور یہی روایت صاحب درۂ نجفیہ نے بھی ذکر کی ہے۔

۲۔ محاج السالکین میں بھی بالکل یہی تصریح موجود ہے کما نقلہ عنہ الشاہ عبد العزیز۔ تحفہ اثناء عشریہ ص۲۷۹

۳۔ شرح حدیدی میں ابوبکر احمد بن عبد العزیز جوہری کے حوالہ سے مذکور اس مضمون کی روایت بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی، تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جو کچھ تم نے رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، اسے زیادہ بہتر جانتے ہو۔ انت وما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم اور یہی روایت فتح الباری شرح بخاری میں بھی مذکور ہے اور کتب اہل السنت میں رضامندی زہراء رضی اللہ عنہا کی تصریح بھی موجود ہے اور اس فدک کو ابوبکر کی دیانت و امانت پر چھوڑنے کی تصریح موجود ہے۔

۴۔ روی البیہقی من طریق الشعبی ان ابابکر عاد فاطمۃ فقال لھا علی ھذا ابوبکر یستاذن علیك قالت اتحب ان اذن له قال نعم فاذنت له فدخل علیھا فترضاھا حتی رضیت۔ (فتح الباری شرح بخاری جلد ۶، ص۱۳۹)

یعنی بیہقی نے شعبی کے واسطے سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی عیادت اور بیمار پرسی کے لیے ان کے در پر حاضری دی تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ابوبکر دروازے پر موجود ہیں، اور اندر آنے کے لیے اجازت کے طلب گار ہیں، تو آپ نے پوچھا، کیا تمہیں یہی پسند ہے کہ میں انہیں اندر آنے کی اجازت دے دوں۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر آئے اور آپ کو راضی کرنے کے لیے جد و جہد کی۔ حتیٰ کہ آپ راضی ہو گئیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کے روایتی اور درایتی پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: وھو وان کان مرسلاً لکن اسنادہ الی الشعبی صحیح وبه یزول الاشکال فی جواز تمادی فاطمۃ علیھا السلام علیٰ ھجر ابی بکر

یہ روایت اگرچہ مُرسل ہے لیکن شعبی تک اس کا اسناد صحیح ہے اور اس روایت سے اتنی مدت تک حضرتِ زہرا رضی اللہ عنہا کے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے تعلق توڑنے اور سلام و کلام ترک کئے رکھنے پر وارد ہونے والا اشکال دور ہو جائے گا (کہ بغیر وجہ شرعی کے ترکِ تعلق اور ہجران سلام و کلام ممنوع ہے تو حضرتِ زہرا رضی اللہ عنہا نے ہجران اور قطعِ تعلق کا ارتکاب کیوں کیا) تو اگر شعبی کی یہ روایت ثابت ہے، تو اس نے اس اشکال اور سوال کو زائل کر دیا اور اس معاملہ میں موزوں و مناسب بھی یہی ہے کہ واقعہ و حقیقت اسی طرح ہو کیونکہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا علمِ دین میں کمال اور عقلمندی میں اعلیٰ مقام اور تقویٰ و ورع میں کمال ہر ایک کو معلوم ہے اور معروف و مشہور زمانہ بھی ہے (جو اس قسم کے بائیکاٹ اور ترکِ سلام و کلام کے سراسر منافی ہے)

سوال: بخاری شریف جیسی کتاب میں مذکور ہو کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے وصال تک کلام نہ کیا اور ناراض رہیں، تو اس کے مقابل بیہقی کی روایت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

جواب: بخاری کی روایت میں قطعاً یہ تصریح نہیں کی کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوں اور میں نے اس ناراضگی کی وجہ سے ان سے سلام و کلام ترک کئے رکھا ہے، بلکہ وہ راوی کا اپنا ظن و گمان ہے اور اندازہ و تخمینہ جیسے کہ علامہ عینی نے فرمایا: انما لازمت بیتہا فعبر الراوی عن ذالک بالھجران (ج ۱۵، ص۲۰) حقیقت صرف اتنی تھی کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے اپنے گھر میں بیٹھے رہنے کا التزام کر لیا تو راوی نے اس کو ہجران اور ترکِ تعلق سے تعبیر کر دیا ——— علاوہ ازیں حضرت صدیق نے حضرت اسامہ (رضی اللہ عنہما) والے لشکر کو تو شام کی طرف روانہ کر دیا اور ان کے بعد تھوڑے سے صحابہ کرام کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دور ڈیرہ ڈالے رہے اور مرتدین و مفسدین کے خلاف برسرِ پیکار رہے تو اس دوران ملاقات کیسے ثابت ہو سکتی تھی اور سلام و کلام کے ترک کرنے کا اور ایک دوسرے سے منہ موڑنے کا مشاہدہ چھ ماہ تک کیسے ہوتا رہا؟ لہذا بخاری شریف میں مذکور ہونے سے باعتبارِ سند کے تو اس کی قوت ثابت ہوتی ہے لیکن مضمون اور مفہوم کے

لحاظ سے قطعیت ثابت نہیں ہو سکتی، جبکہ تعلق و ربط کا برقرار رہنا اور باہمی رضامندی کا پایا جانا ہی ان کے شایانِ شان ہے اور قولِ باری تعالیٰ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کے عین مطابق ہے اور اس کا خلاف ان کے شان کے خلاف ہے، لہذا عقل و درایت بیہقی کی روایت کے مضمون و مفہوم کی تقویت اور اس کی ترجیح کا فائدہ دیتے ہیں اور جب ایک قول میں ازروئے سند و روایت قوت ہو اور دوسرے قول میں ازروئے درایت و قیاس تو اب فیصلہ اس قاعدہ سے کیا جائے گا کہ جب مثبت اور نافی میں تعارض ہو تو مثبت کو ترجیح ہوگی نہ کہ نافی کو جبکہ شعبی والی روایت حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی رضامندی ثابت کرتی ہے اور بخاری شریف والی روایت نفی ثابت کرتی ہے تو لامحالہ شعبی کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی، کیونکہ نفی کرنے والے کے لیے بہت زیادہ محیط اور شامل علم کی بہت ضرورت ہوتی ہے، مثلاً ترک سلام و کلام اور رضامندی کی نفی وہی کر سکتا ہے جو پوری ششماہی شب و روز حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے دروازے پر بیٹھا رہا ہو، اور چند منٹ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہ گیا ہو اور سلام و کلام اور رضامندی ثابت کرنے کے لیے انہیں چند منٹوں میں موقع پر موجود ہونا کافی ہے، لہذا جس قطعی علم کی نفی کے لیے ضرورت ہے، اس کا پایا جانا بعید اور تقریباً ناممکن ہے اور اثبات کے لیے جس علم کا پایا جانا ضروری ہے، وہ سہل اور ممکن قریب ہے، لہذا ازروئے متن اور مضمون و مفہوم شعبی اور بیہقی کی روایت ہی راجح اور وزنی ہوگی اور اسی کی تائید و تصدیق حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل اور حضرات ائمہ زین العابدین، حضرت زید، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہم کے ارشادات اور تعریف و توصیف اور ان حضرات کی زبانی حضرت ابوبکر و عمر کی برأت اور علوشان و مرتبت کے اقرار و اعتراف سے ہوتی ہے فھذا ھو الحق وماذا بعد الحق الا الضلال اور یہ معروض خدمت ہو چکا کہ ہجران اور ترکِ تعلق وغیرہ محض راوی کا گمان ہے تو اس کو ان تصریحات کے مقابل کیا وقعت دی جا سکتی ہے۔

۵۔ علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں شعبی سے مروی و منقول

اس روایت کو مکمل طور پر ذکر کیا ہے، ذرا اسے بھی ملاحظہ فرمالیں:

ا۔ روی البیہقی، عن الشعبی قال لما مرضت فاطمۃ رضی اللہ عنہا اتاھا ابوبکر رضی اللہ عنہ فاستاذن علیھا فقال علی رضی اللہ عنہ یا فاطمۃ ھذا ابوبکر یستاذن علیک فقالت أتحب ان اذن له قال نعم فاذنت له فدخل علیھا یترضاھا فقال واللہ ما ترکت الدار والمال والاھل والعشیرۃ الا ابتغاء مرضاۃ اللہ ومرضاۃ رسولہ ومرضاتکم اھل البیت ثم ترضاھا حتی رضیت (ج ۱۵ ص ۲۰)

پہلے حصے کا ترجمہ گزر چکا، آخری حصے کا ترجمہ یہ ہے کہ جب ان کو راضی کرنے کے لیے اندر داخل ہوئے تو کہا اللہ کی قسم میں نے اپنے گھر اور مال و متاع اور اہل و عشیرت کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اہل بیت کی رضامندی کے لیے ترک کر دیا تھا، پھر ان کو راضی کرنے کے لیے پوری کوشش کی، حتیٰ کہ وہ راضی ہو گئیں۔

وھذا قوی جید والظاھر ان الشعبی سمعہ من علی رضی اللہ عنہ اوممن سمعہ من علی۔ یہ روایت قوی اور عمدہ ہے اور یقینی امر ہے کہ شعبی نے اس کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے یا ان سے جنہوں نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے سنا۔

ب۔ وقد ذکر فی کتاب الخمس تالیف ابی حفص بن شاھین عن الشعبی ان ابا بکر قال لفاطمۃ یا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما خیر عیش حیاۃ اعیشھا وانت علیّ ساخطۃ فان کان عندک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک عھد فانت الصادقۃ المصدقۃ المامونۃ علی ما قلت قال فما قام ابوبکر حتی رضیت ورضی۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۱۵، ص۲۰)

ابوحفص بن شاہین کی تالیف کردہ کتاب الخمس میں شعبی سے مروی یہ قول مذکور ہے کہ

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے کہا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر! یہ کوئی اچھی اور پسندیدہ گزران والی زندگی نہیں ہے جو میں گزار رہا ہوں، جبکہ تم مجھ پر ناراض ہو تو اگر آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس معاملہ میں کوئی عہد ہے، تو آپ سچی ہیں اور تصدیق کی ہوئی اور قابل اعتماد ہو اپنے قول میں (لہٰذا میں فدک تمہارے حوالے کر دیتا ہوں) شعبی نے کہا پس ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے نہ اُٹھے، حتیٰ کہ آپ اُن سے راضی ہو گئیں اور وہ آپ سے راضی ہو گئے۔

ج۔ ابن ابی الحدید نے جوہری کے حوالے سے جو روایت ذکر کی تھی جس میں فانت وما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ موجود ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ عینی نے فرمایا: ھذا ھو المظنون بھا واللائق بامرھا وسیادتھا وعلمھا ودینھا (ج ۱۵، ص۲۰)

آپ کا معاملہ فدک کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیث سن کر ان کے سپرد کرنے کا ہی ان کے متعلق حسنِ ظن ہے اور ان کے ورع و زہد اور سیادت اور علم و دین کے لائق اور شایانِ شان بھی یہی ہے (نہ کہ ناراض ہو جانا اور ہمیشہ کے لیے مکمل بائیکاٹ کر دینا)

فائدہ: آپ نے شیعہ کی روایت میں بھی ان حضرات کا راضی کرنے کے لیے جانے کا واقعہ ملاحظہ فرمایا اور اہل السنت کی روایات میں بھی، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی سفارش بھی دونوں میں ملاحظہ فرمائی، لیکن شیعہ حضرات نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اجازت دینے کے باوجود منہ دوسری طرف پھیرتے اور کلام سے گریز کرتے دکھایا، لیکن اہل السنت کی روایات میں رضامندی کی تصریح ملاحظہ کی، اب یہ فیصلہ آپ پر ہے کہ ان میں سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے شایانِ شان روایت کونسی ہے؟ یقیناً آپ کا ضمیر اس گھرانہ کی وسعتِ ظرف، عالی حوصلگی اور متاعِ دنیا سے گریز و پرہیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی روایت کو ترجیح دے گا، جس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عذر کی قبولیت اور رضامندی کا تذکرہ ہے۔

حضرت زہراء کی حضرت علی رضی اللہ عنہما پر ناراضگی

اہل السنّت کے نزدیک حضرت زہراء رضی اللہ عنہا اپنی تمام تر رفعتِ مرتبت اور بلندئ درجت کے باوجود بالکل بشری تقاضوں سے مبرّا اور معرّیٰ نہیں تھیں، لہذا اگر واقعی آپ ناراض ہوگئی تھیں تو یہ بھی بشری تقاضے کے تحت تھا اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو ناراض کیا تھا اور نہ ایذاء پہنچائی تھی، لہذا ان پر اس وجہ سے کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا اور انہوں نے بار بار راضی کرتے کے لیے حاضر ہوکر اور سرد راتیں ان کے در پر بیٹھ کر گزار دیں اور ہر ممکن تدبیر راضی کرنے کی اختیار فرمائی، جو ان کے شانِ نیاز اور اخلاص اور محبت وعقیدت کے عین مطابق تھا اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے راضی ہوکر اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خوش کرکے اپنے شایان شانِ امر کا اظہار کیا، لہذا ہم کسی کی ذات کو موردِ الزام ٹھہرانے کا تصور تک نہیں کرسکتے اور قرآن مجید نے حضرت کلیم اور حضرت ہارون علیہما السلام کا باہمی معاملہ ذکر فرماکر ہماری رہنمائی کا حق ادا فرمایا ہے۔

لیکن اگر شیعہ حضرات کو ان مقدّمات کے ترتیب دینے اور حضرت صدّیق رضی اللہ عنہ کی ذات کو موردِ الزام ٹھہرانے کا بہت شوق ہے تو ان کی ضیافت طبع کے لیے ان کی مستند کتب سے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر ناراضگی اور ان کی طرف سے ایذا پانے اور ان کا گھر چھوڑ کر اپنے بچّوں کو ہمراہ لے کر رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لے جانے کا ثبوت فراہم کردیتے ہیں، اگر وہ اپنے بیان کردہ قیاس اور دلیل وحجّت کو یہاں جاری کردیں، تو پھر ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی انہیں معذور سمجھ سکتے ہیں، اور اگر یہاں نہ صرف وہ مقدّمات مرتبہ اور دلیل وحجّت بھول جائے، بلکہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو موردِ الزام ٹھہرانے پر آمادہ دکھائی دیں تو آخر حضرت صدّیق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں ان پر ناکردہ گناہ اس ناراضگی سے رسولِ پاک صلی اللہ

علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کیسے ثابت ہوگئی اور اُن کا العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ دُنیا وآخرت میں ملعون ہونا کیسے ثابت ہوگیا؟ کیا یہ واضح اور کھلی ناانصافی نہیں اور عدل وانصاف کا دوہرا پیمانہ نہیں، جس کی خدا تعالیٰ کے آخری اور ابدی دین قویم میں کوئی گنجائش نہ ہے، نہ ہوسکتی ہے۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرماویں: ثم قال (الامام ابوعبداللہ علیہ السّلام) انہ جاء شقی من الاشقیاء الیٰ فاطمۃ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہا اما علمت ان علیا قد خطب بنت ابی جہل فقالت حقا ما تقول فقال حقا ما اقول ثلث مرات فدخلہا من الغیرۃ مالا تملک نفسہا (الی) قال فاشتد غم فاطمۃ من ذالک وبقیت متفکرۃ حتی امست وجاء اللیل حملت الحسن علیٰ عاتقہا الایمن والحسین علیٰ عاتقہا الایسر واخذت بید ام کلثوم الیسریٰ بیدہا الیمنیٰ ثم تحولت الیٰ حجرۃ ابیہا (الیٰ) فلما رأی النبی علیہ السلام ما بفاطمۃ من الحزن والغم وذالک انہ خرج من عندہا وھی تتقلب وتتنفس الصعداء فلما رأھا النبی علیہ السلام انہا لا یہنئہا النوم ولیس لہا قرار قال لہا قومی یا بنیۃ فقامت فحمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحسن وحملت فاطمۃ الحسین واخذت بید اُمّ کلثوم فانتہی الیٰ علی علیہ السلام وھو نائم (الیٰ) فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما علمت ان فاطمۃ بضعۃ منی وانا منہا فمن اذاھا فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ ومن اذاھا بعد موتی کان کمن اذاھا فی حیواتی ومن اذاھا فی حیواتی کان کمن اذاھا بعد موتی فقال علیؑ والذی بعثک بالحق نبیّا ما کان منی مما بلغہا شیئ ولا حدثت بہا نفسی فقال النبی صلیّ اللہ علیہ وسلم صدقت وصدقت الخ

(علل الشرائع مؤلفہ ابن بابویہ قمی ص۷۳، ناسخ التواریخ جلد۲ ص۱۲۵)

پھر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک بدبخت شخص آیا اور اس نے حضرت فاطمہ بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نے ابوجہل کی بیٹی کو پیغامِ نکاح بھیجا ہے تو آپ نے تین مرتبہ اس سے دریافت کیا واقعی جو تو کہہ رہا ہے برحق ہے، تو اس نے تینوں مرتبہ کہا جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل برحق اور سچ ہے، تو آپ کے اندر اس قسم کی غیرت داخل ہوگئی کہ آپ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا غم و اندوہ سخت ہوگیا اور آپ اس خبر سے فکرمند رہیں حتیٰ کہ وقتِ شام آپہنچا اور رات چھا گئی، تو آپ نے حضرت حسن کو دائیں کندھے پر اور حضرت حسین کو بائیں کندھے پر بٹھایا اور ام کلثوم کا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا، پھر اپنے والد گرامی کے مکان کی طرف منتقل ہوگئیں (تا) جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے حزن و ملال اور غم و اندوہ کو مشاہدہ فرمایا، کیونکہ جب آپ ان کے پاس سے نکلے، تو وہ بستر پر کروٹیں لے رہی تھیں اور ٹھنڈے سانس بھر رہی تھیں، تو جب آپ نے دیکھا کہ انہیں خوشگوار نیند نہیں آرہی اور نہ ہی سکون و قرار ہے، تو آپ نے فرمایا اے میری بیٹی! اُٹھیے! چنانچہ آپ اُٹھ کھڑی ہوئیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو اٹھا لیا اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت حسین کو اُٹھا لیا اور حضرت ام کلثوم کا ہاتھ پکڑ لیا، پس انہیں ساتھ لے کر حضور نبئ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، جبکہ وہ مسجد میں سوئے ہوئے تھے تو انہیں فرمایا: اے ابوتراب! اُٹھیے۔ فکم ساکن ازعجتہ تم نے کتنے پُرسکون لوگوں کا سکون غارت کر دیا ہے (تا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علی! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے اور میں اس سے ہوں، یعنی دونوں بمنزلہ شئے واحد کے ہیں، جس نے اسے ایذاء دی، اُس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی، اُس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا دی اور جس نے اسے میری وفات کے بعد ایذا دی، تو وہ اُس شخص کی مانند ہے جس نے اسے میری زندگی میں ایذا دی اور جس نے اس کو میری زندگی میں ایذا دی تو وہ اس شخص کی

مانند ہے جس نے اس کو میری وفات کے بعد تکلیف پہنچائی، تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، ہاں کیوں نہیں! مجھے یہ حقیقت معلوم ہے تو آنحضرت کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر تجھے دوسری شادی کرنے اور حضرت زہرا بتول (رضی اللہ عنہا) کو ایذا اور تکلیف دینے کا کونسا موجب اور باعث پیش آیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے اس ذاتِ اقدس کی قسم، جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر مبعوث فرمایا، میری طرف سے قطعاً کوئی ایسی چیز وقوع پذیر نہیں ہوئی جو انہیں پہنچی ہے اور نہ ہی کبھی میرے دل میں ایسا خیال ہی پیدا ہوا، تو آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا اور فاطمہ نے بھی سچ کہا۔

اقول: اس روایت سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا غم و اندوہ اور اضطراب بے قراری اور ایذا و تکلیف محسوس کرنا واضح ہے، حتیٰ کہ آپ خود بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر سے تشریف لے گئیں اور اپنے صاحبزادوں اور صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو بھی ساتھ لے کر چلی گئیں اور آہیں بھرتی رہیں اور کروٹیں بدلتی رہیں لیکن کیا اس روایت کی رُو سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ موردِ الزام بن سکتے ہیں اور ان پر وہ قیاس و حجت اور دلیل و بُرہان منطبق کیا جا سکتا ہے جو ڈھکو صاحب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر منطبق کرنے کی مذموم سعی کی ہے؟ یقیناً نہیں، کیونکہ آپ نے ان کو ایذا پہنچانے کا نہ قصد کیا اور نہ ہی اُن کے گوشۂ خیال میں بھی یہ امر تھا، تو بالکل اسی طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قطعاً آپ کو ایذا پہنچانے کا نہ قصد و ارادہ کیا تھا اور نہ ہی ایسے اقدام کا وہ تصور بھی کر سکتے تھے۔ انہوں نے کمال نیازمندی سے اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مال کی شرعی حیثیت واضح کی تھی جو شب و روز بارگاہِ حضور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر رہنے کی بنا پر ان کے علم میں تھی اور اپنے فرائضِ منصبی اور ذمہ داری کا تذکرہ کیا جو بحیثیتِ خلیفۂ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم اُن پر عائد ہوتی تھی۔

استقامتِ صدیق رضی اللہ عنہ کا عظیم مظاہرہ

بلکہ عدل و انصاف اور دیانت و امانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس استقامت اور اخلاص و نیاز کے اپنے اندر جمع کرنے اور حدِ اعتدال میں رہنے اور افراط و تفریط سے دُور رہنے پر ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کیا جاتا اور ان کو صد مرحبا کہا جاتا کہ وہ کس مشکل میں گھِر چکے ہیں - ایک طرف شرعی حکم کی پابندی اور دوسری طرف رسولِ معظّم نبیٔ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر کا مطالبہ جن کی محبت ان کے لیے روحِ ایمان ہے اور جن کے ابّاجان کی خاطر انہوں نے جان و مال، عزّت و آبرو اور خویش و اقربا اور گھر بار سب کچھ قربان کر دیا، مگر نہ دامنِ محبت ہاتھ سے جانے دیا اور نہ ہی دامنِ شرع کو ہاتھ سے چھوٹنے دیا، ایسے مشکل مراحل میں ایسی استقامت کا مظاہرہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی کا حصّہ ہو سکتا تھا۔

علماءِ شیعہ کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو مُوردِ الزام ٹھہرانا

علماءِ شیعہ نے اس روایت کی صحت و واقعیت تسلیم کرنے کے بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے اس اقدام کی جو توجیہ و تاویل کی ہے، وہ ملاحظہ فرما دیں: سید نعمت اللہ الجزائری نے انوارِ نعمانیہ جلد اوّل ص۲۷ پر اس روایت کو مفصّل طور پر بیان کیا ہے اور توجیہات و تاویلات بھی ذکر کی ہیں:

فان قلت اذا کانت فاطمۃ صلوات اللہ علیہا مطہرۃ معصومۃ عن ادناس نساء الدنیا فکیف جاز منہا اعمال ھذہ الغیرۃ البشریۃ من غیر ان تتفحص عن تحقیق الحال قلت الجواب عن ھذا بوجوہ - یعنی اگر سائل یہ سوال کرے کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا دنیوی عورتوں کے میل کچیل اور رذیلہ اور ردّی صفات و اخلاق سے مطہرہ و معصومہ تھیں، تو پھر ان سے غیرتِ بشریہ کے اثرات اور ردِ عمل کیونکر ظاہر ہو گئے

کہ بغیر حقیقتِ حال کی تحقیق اور چھان پھٹک کیے (حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر سے بھی بلا اجازت اور بغیر اطلاع دیئے چلی گئیں اور بال بچے بھی ساتھ لے گئیں اور خلافِ واقعہ خبر و اطلاع پر اس قدر خود بھی پریشان ہوئیں اور حضور نبی کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پریشان کر دیا)، تو اس سوال و اشکال کا جواب کئی وجوہ سے ہے۔

الاول: ان ھذا وامثالہ غیر مناف للعصمۃ ولا للطہارۃ من الادناس البشریۃ (الیٰ) وقد صدرت من بنات الانبیاء ماھو اعظم واشد فان سارۃ من بنات الانبیاء علیہم السلام والزمت ابراھیم علیہ السلام ان یخرج عنہا ھاجرۃ وابنہا اسماعیل الیٰ واد غیر ذی زرع ولا ینزل معہما بل یضعہما فیہ وھو راکب ویرجع الیہما الخ

پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا یہ اقدام اور ردِ عمل اور اس کی مثل دوسرے اقدامات نہ اُن کی عصمت اور پاکدامنی کے خلاف ہیں اور نہ ہی بشری کمزوریوں سے منزّہ و مبرّا ہونے کے خلاف ہیں (تا) انبیاءِ کرام علیہم السلام کی بیٹیوں سے اس سے بھی بڑے بڑے سخت اعمال سرزد ہوتے رہے ہیں، کیونکہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا پیغمبروں کی بیٹیوں میں سے تھیں مگر دیکھا کہ انہوں نے کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ وہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور اس کے شیر خوار بچے (اور اپنے اکلوتے لختِ جگر اور نورِ نظر) کو بے آب و گیاہ وادی کی طرف لے جا کر چھوڑ آئیں اور خود بھی ان کے پاس نہ ٹھہریں، بلکہ اپنی سواری سے اُترے بغیر ہی اسی حالت میں واپس آجائیں۔

والثانی: ان المعصومین قد کانوا احیانا یتنزلون عن مراتبہم الیٰ مراتب البشر و یقع منہم الغضب والرضاء والمحاورات المتعارفۃ فی مجاری العادات لحکم و مصالح یجوز ان یکون منہا ان لا یظن بہم فوق مراتبہم کما وقع

من الغلاة واشباههم الخ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ معصومین شخصیات بھی کبھی کبھی اپنے مراتبِ عالیہ سے تنزل کرتے ہوئے عام بشری حالت اور مقام کی طرف آجاتے ہیں اور ان میں بھی عامیانہ صفات اور احوال کا ظہور ہوتا ہے کبھی رضامندی سرزد ہوتی ہے تو کبھی غضب اور ناراضگی اور عادت وعرف کے مطابق عام لوگوں میں جاری محاورات اور اسلوبِ کلام ان سے بھی سرزد ہو جاتے ہیں جس میں مختلف حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں، تو اس واقعہ میں بھی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی مصلحتوں اور حکمتوں میں سے ایک یہ حکمت ومصلحت بھی ہو کہ ان کو ان کے لائق اور شایانِ شان مراتب سے بلند وبالا نہ سمجھا جائے اور انہیں مافوق الفطرت شخصیات نہ سمجھ لیا جائے جیسے کہ غالی شیعوں اور اس قسم کے دوسرے گمراہ شیعوں کا خیال ہے۔

(انوارِ نعمانیہ مصنفہ سید نعمت اللہ الجزائری، جلد اول ص۷۷ و ۷۸)

فوائد ونتائج: (۱) آپ نے دیکھ لیا کہ جب حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے غم واندوہ اور حزن وملال کی وجہ سے اعتراض اور الزام عائد ہوتا نظر آیا تو علماء شیعہ نے سیدۃ نساء العالمین رضی اللہ عنہا کو کس طرح عام بناتِ انبیاء پر قیاس کر کے بے جا غم وغصہ اور بے سبب حزن وملال کو کس طرح روا رکھا، اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی طہارت اور عصمت بھی اُن کی نظر میں ایسے سخت اقدام کے منافی نہ رہی، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایذاء رسول اور ایذاء خداوند تعالیٰ سے منزّہ ومبرا ماننا حضرت زہرا رضی اللہ عنہ کے لیے لازم تھا اور تنہا ایک عامی راوی کے قول کی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبت اور معصوم امام کو موردِ الزام اور محلِ اتہام نہیں ٹھہرانا چاہیے تھا اور خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نہیں نکلنا چاہیئے تھا، مگر چونکہ معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق تھا، لہٰذا وہ تو موردِ الزام نہیں بنائے جا سکتے تھے تو حضرتِ زہرا بتول رضی اللہ عنہا کو حضرت سارہ رضی اللہ عنہا پر قیاس کر کے ایسے امور کے سرزد ہونے کا جواز ثابت کر دیا اور اس سارے ردِ عمل میں نہ عصمت متاثر ہوئی اور نہ طہارت پر حرف آیا، حالانکہ افضل کا مفضول پر قیاس درست نہیں ہوتا اور نہ ہی حضرت سارہ رضی اللہ عنہ کا پیغمبر کی بیٹی ہونا ثابت ہے

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے والد کا نبی ہونا ثابت نہیں اور نہ ہی حضرت خلیل اللہ علیہ السلام سے قبل کسی مبلغ کا ان کے باپ کے دور میں موجود ہونا۔ فسبحان اللہ ما اشد حب الناس لعقائدھم۔

۲۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے لیے شیرخوار بچے اور اس کی والدہ کے لیے اس قدر غیرت اور عدم برداشت اور سخت ترین رویہ بھی جائز ہو گیا اور حضرت خلیل اللہ علیہ السلام جیسے بلند مرتبت نبی کے لیے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ساتھ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی رضامندی اور تسکینِ خاطر کے لیے ایسی کڑی شرائط اور مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے ایسی بے نیازی جائز ہو گئی اور اس سے ان کی عصمت بھی متاثر نہ ہو سکی۔

۳۔ معصومین کے لیے مراتبِ عالیہ سے تنزل اور عام بشری تقاضوں کا رونما ہونا درست ہو گیا اور یہ تنزل بھی سراسر حکمت اور مصلحت بن گیا اور ان مقدس شخصیات کے حق میں غلو اور افراط سے روکنے کا ذریعہ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اگر نہیں جائز تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عمل جو حدیثِ رسول کے عین مطابق تھا اور حدیث بھی اتنی صحیح اور سچی کہ سب امہات المومنین اس کی قائل، سب اکابرِ صحابہ اور تمام اہل بیت کرام اس کے معترف اور اسی پر عمل پیرا اور مراتبِ عالیہ سے تنزل اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے لیے جائز نہیں تھا تو صرف فدک کے بارے میں اور اُن کی یہ ناراضگی اور ہجران بشری تقاضوں کے تحت سرزد ہونا محال تھا اور اُن کی عصمت اور طہارت کے سراسر منافی ومخالف تھا تو صرف اور صرف حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں اور حضرت سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام جیسی شخصیت کے لیے اکلوتے فرزند اور حرمِ محترم کے حق میں یہ اقدام قابلِ جواز تھا، مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک بطورِ وراثت نہ دینے کا کوئی جواز نہیں تھا؟ ما لکم کیف تحکمون الیس منکم رجل رشید۔

تو کیا دنیاوی مال کی خاطر اور مال بھی وہ جس کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی ذات یا اپنی لختِ جگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے بھی مخصوص نہیں کیا تھا، بلکہ بیت المال کا حصہ اور قومی ملکیت قرار دیا تھا اور آپ کے جملہ اخراجات کی بھی اس سے کفالت کا عہد کیا تھا اور نبوی طریق کار پر کاربند رہنے کا عہد کیا اور اللہ تعالیٰ کو ضامن بنایا تو اس صورت

میں بھی اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ان پر ناراض ہوں اور کبیدہ خاطر تو اس کو بھی اسی طرح کے بشری تقاضے پر محمول کرنا اور مرتبۂ عالیہ سے تنزل قرار دینا ضروری ہے جس میں جزائری صاحب کی بیان کردہ حکمت و مصلحت کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی محبت و عقیدت اور نیاز و اخلاص کے ساتھ ساتھ استقامت کا امتحان لینا اور قیامت تک آنے والے محبوں اور معتقدوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ پیش کرنا بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب سے محبوب تر شخصیت کے لیے اصولِ شرع اور راہِ استقامت سے عدول و انحراف جائز نہیں ہے

چشمِ بد بیں کہ برکندہ باد　　　عیب نماید ہنرش در نظر

حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی بات ناقابلِ اعتبار و التفات

انوارِ نعمانیہ میں ہی محدث جزائری نے ذکر کیا ہے کہ شیخ صدوق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت نقل کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو ایک لونڈی بطور ہدیہ پیش کی گئی، جس کی قیمت چار ہزار درہم تھی۔ جب وہ حبشہ سے واپس تشریف لائے اور مدینہ منورہ پہنچے، تو انہوں نے وہ لونڈی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ہبہ کر دی۔ انہوں نے اس کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا والے مکان میں ٹھہرایا۔ ایک دن آپ باہر سے گھر تشریف لائیں تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا سر اس کی گود میں دیکھ کر فرمایا، فعلتها یا ابا الحسن فقال لا واللہ یا بنت محمد ما فعلت شیئاً الخ اے ابوالحسن! تم نے اس کے ساتھ ہمبستری کی ہے؟ تو آپ نے فرمایا مجھے خدا کی قسم، میں نے قطعاً اس کے ساتھ مباشرت نہیں کی، تو بتلایئے تمہارا کیا ارادہ ہے؟ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے کہا میرا ارادہ یہ ہے کہ مجھے اپنے باپ کے گھر جانے کی اجازت دیں، تو آپ نے جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے چادر اوڑھی، برقعہ پہنا اور منزلِ نبوی کا رُخ کیا۔ فهبط جبریل علیہ السلام فقال یا محمد ان اللہ یقرئک السلام ویقول ان فاطمة تشکو علیاً فلا تقبل منها فی علی قولا فدخلت فاطمة فقال رسول اللہ جئتی تشکو علیاً فقالت ای واللہ رب الکعبة فقال لها ارجعی الیه فقولی له رغم

انفی لرضاک ثلاثا فرجعت فاطمة الی علیٍّ فقالت یا ابا الحسن رغم انفی لرضاک - (ص ۹۷، جلد ۱)

تو جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور عرض کیا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کو سلام فرماتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ فاطمہ آرہی ہے علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کی شکایت کرنے کے لئے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ان کا قول بالکل قبول نہ کرنا۔ اسی دوران آپ پہنچ گئیں، تو رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم علی مرتضیٰ کی شکایت کرنے آئی ہو؟ آپ نے عرض کیا: جی ہاں! اللہ مالکِ کعبہ کی قسم، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، واپس علی کے پاس جاؤ اور ان سے تین مرتبہ کہو میری ناک تمہاری رضا حاصل کرنے کے لئے خاک آلود ہوئی؛ چنانچہ آپ حسبِ ارشادِ نبوی واپس حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور تین مرتبہ کہا: میری ناک تمہاری رضا حاصل کرنے کے لیے خاک آلود ہے، یعنی میں گویا ناک سے لکیریں کھینچ کر معذرت اور معافی چاہتی ہوں۔

ثمرہ و نتیجہ: اس روایت کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کریں جن سے بڑھ کر خیمۂ افلاک کے نیچے اور فرشِ زمین کے اوپر کوئی صادق نہیں اور اس کو نقل کرنے والے شیخ صدوق ہوں، اتنی بڑی سچی روایت میں ایک طرف حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اپنے ظن و گمان اور تخمینہ و اندازہ پر اس قدر بڑا اعتماد دکھلایا گیا ہے کہ اس کے مقابل حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسے معصوم کی قسم اور ان کے حلفی بیان کو بھی آپ نے کوئی وقعت و اہمیت نہیں دی اور ان پر اعتبار نہیں کیا۔ دوسری طرف حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو حضرت جبرئیل، رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک غیر اہم قرار دے دیا اور ان کی بات کو ناقابلِ اعتبار و التفات ٹھہرا دیا گیا اور انہیں ناک سے زمین پر لکیریں کھینچ کر معذرت کرنے والوں کی طرح معذرت کرتے دکھایا گیا ہے۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سراسر اخلاص و نیاز سے سرزد ہونے والے جواب اور شریعتِ مطہرہ پر پابند رہتے ہوئے صرف وراثت کے طور پر فدک حوالے کرنے سے معذرت کا معاملہ ہو تو یہی سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا مافوق الفطرت بھی ہوتی

ہیں اور شریعت، طریقت اور حقیقت کی جامع بھی۔ خطا اور بھول چوک سے معصومہ و مطہرہ بھی۔ صادقہ و صدیقہ بھی اور صائب الرائے اور صحیح الفکر بھی اور مالکِ شریعت بھی۔ ان کی ناراضگی اور غضب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غیظ و غضب کا موجب بھی ہوتی ہے اور ان کی ایذاء کا باعث بھی وغیرہ وغیرہ اور اس ناراضگی کی توجیہ و تاویل بھی ناممکن ہو جاتی ہے، لہٰذا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ شیعہ کو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی عظمت و رفعت، عصمت و طہارت اور صداقت و دیانت کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ناراضگی اور ان کے ساتھ بغض و کینہ نہیں، بلکہ صرف اور صرف دینِ اسلام کا محافظ ہونے اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا موجب ہونے کی وجہ سے ہی سارا غم و غصہ اور بغض و عناد ہے، ورنہ یہ کوئی ایسا معاملہ نہ تھا، جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا تھا اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے ردِ عمل کی توجیہ و تاویل نہیں ہو سکتی تھی، بشرطیکہ دونوں کے ساتھ اخلاص بھی ہوتا اور دل بھی صاف ہوتا۔

صاحبِ ناسخ کا اضطراب اور روایت کے ردّ و قبول سے عجز

صاحبِ ناسخ نے پہلی روایت کو علل الشرائع اور فاضل مجلسی کے حوالے سے ذکر تو کر دیا لیکن اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا عالم ما کان و ما یکون تھیں، وہ ایک مجہول شخص کے کہنے پر اس قدر سخت ناراض کیونکر ہو سکتی تھیں کہ اولاد کو ہمراہ لے کر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اجازت کے بغیر ان کے گھر سے تشریف لے گئیں۔ دوسری طرف حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں جو کہ معصوم تھے، وہ ایسے امر کا ارتکاب کیونکر کر سکتے تھے، یعنی ابوجہل کی مسلمان بیٹی کے ساتھ نکاح کیسے کر سکتے تھے اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو ان کے متعلق ایسا شک و شبہ کیونکر ہو سکتا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن کہتا ہے: چوں فاضل مجلسی ایں حدیث را نگاشتہ بود، من بندہ دست باز نداشتم ذتواند بود کہ اسرارِ احادیث و مصلحتِ وقت را ماندانیم و ردّ و قبول را بفہم نارسائے خویش

دہیم (ناسخ التواریخ جلد چہارم ص ١٣٠)

چونکہ مجلسی صاحب نے اس حدیث کو لکھا تھا، تو میں نے بھی لکھنے سے ہاتھ کو نہ روکا اور ہو سکتا ہے کہ احادیثِ مبارکہ کے اسرار و رموز اور مخصوص اوقات کی مصلحتوں کو ہم نہ سمجھ سکیں اور عین ممکن کہ حقیقتِ حال سمجھے بغیر اپنے ذہنِ نارسا کے ذریعے ردّ و قبول کے درپے ہو جائیں (لہٰذا سوائے سکوت اور مہر بلب ہونے کے کوئی چارہ نہیں ہے)

بس یہی معاملہ ہمارا بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس جواب باصواب اور عین شریعت اور مجموعہ ادب و احترام پر حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی ناراضگی اور برہمی اور ہجران و قطع تعلق والی روایات قبول کرنے پر اپنا ذہن آمادہ نہیں ہوتا، لیکن ان کو مردود اور ناقابلِ قبول ٹھہرانے سے ہچکچاتے ہیں کہ ممکن ہے وقتی طور پر بشری تقاضوں اور مراتبِ عالیہ سے تنزل کی بناء پر کوئی ایسی کبیدگی پائی گئی ہو جو اس شہزادی و الاتبار کی طرف سے شانِ محبوبیؑ اور نسبتِ رسالت پر ناز و افتخار کی وجہ سے سرزد ہوئی ہو اور اس سراپا خلوص غلام بارگاہِ رسالت کے عشق کا مزید امتحان ہو اور جب امتحان ہو لیا تو معاملہ سلجھ گیا اور باہمی رضامندی ہو گئی ہو۔ الغرض حضرت علی اور حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کے درمیان ناراضگی اور شکوہ و شکایت کی روایات کو دیکھ کر اس روایت کا رد یا اس کی تاویل حضراتِ شیعہ بھی ضروری سمجھتے ہیں، وہی معاملہ ہمارا بھی ہے۔ لہٰذا ہمارے خلاف یہ پابندی کیونکر عائد کی جا سکتی ہے کہ ہم تو ان کے ردّ و قبول میں اپنا حق استعمال نہ کر سکیں، مگر شیعہ حضرات کو یہ حق حاصل ہو اور وہ اسے استعمال بھی کر سکیں۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ الحاصل ثابت ہو گیا کہ کسی بھی فریق کی مذہبی کتاب میں موجود و مرقوم ہر روایت اپنے ظاہری معنی و مفہوم پر محمول ہونی ضروری نہیں، بلکہ اپنے دیگر روایات و احادیث اور دلائل و براہین کی رُو سے ہی اس کا صحیح محمل متعین کرنا صرف ان کا حق ہے۔

مزید توضیح و تشریح: علامہ ڈھکو صاحب کے بے بنیاد قیاسِ شعری کے رد و ابطال کے لیے یہی قدر کافی و وافی ہے، لیکن اس معاملہ کی اہمیت

کے پیشِ نظر مزید توضیح و تشریح کے لیے دو حوالے مزید پیشِ خدمت ہیں تاکہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ یہ مقدس شخصیات بشری تقاضوں سے بالاتر نہیں تھیں اور کبھی مراتبِ عالیہ سے ان کو تنزل لاحق ہو جاتا تھا جس کو شیعہ تسلیم کرتے ہیں اور تسلیم کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

۳۔ جاءت فاطمة علیها السلام الی ابیها وهی باکیة فقال لها ما یبکیك یا قرة عینی لا ابکی الله لك عینا قالت یا ابی ان نسوان قریش یعیرننی ویقلن ان اباك زوجك بفقیر لا مال له فقال لها یا فاطمة ان الله عزوجل اطلع الی الارض اطلاعة فاختار منها اباك ثم اطلع فاختار منها بعلك وابن عمك ثم امرنی ان ازوجك منه افلا ترضین ان تکونی زوجة من اختاره الله وجعله لك بعلا فقالت رضیت و فوق الرضا یا رسول الله۔ (کتاب الروضہ لابن بابویہ القمی ص۱۱۹)

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اپنے والدِ گرامی کی خدمتِ اقدس میں روتی ہوئی حاضر ہوئیں، تو آپ نے ان سے کہا اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک تمہیں کونسی چیز رُلا رہی ہے؟ اللہ تعالیٰ کبھی بھی تیری آنکھ کو نہ رلائے، تو آپ نے عرض کیا اے ابا جان! قریش کی عورتیں مجھے عار دلاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تمہارے باپ نے تمہارا رشتہ ایسے فقیر اور درویش شخص سے کر دیا ہے کہ جس کے پاس کوئی مال نہیں ہے، تو آپ نے ارشاد فرمایا: اے فاطمہ! بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرف ایک مرتبہ جھانکا تو پورے روئے زمین سے تیرے باپ کو چُن لیا۔ پھر دوبارہ جھانکا تو پوری زمین سے تیرے خاوند کو چُن لیا۔ پھر مجھے حکم دیا کہ میں تیری شادی اس کے ساتھ کر دوں۔ کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تو اس شخص کی زوجہ ہو جو اللہ تعالیٰ کا منتخب کیا ہوا ہے اور اُس نے تیرے لیے اس کو خاوند بنایا ہے۔ تو آپ نے کہا میں راضی ہو گئی اور بہت زیادہ راضی ہو گئی ہوں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)

تبصرہ: صرف مال و دولت نہ ہونے کی بنا پر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زوجیت قبول کرنے پر اظہارِ افسوس کرنا اور روتے ہوئے بارگاہِ رسالتمآب میں حاضر ہو کر احتجاج کرنا کیا ان کے لیے زیبا ہے۔ انہوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کب شاہانہ انداز میں وقت گزارتے دیکھا اور کیا گھرانۂ نبوت میں انہیں ورع و زہد اور توکل و قناعت کا سبق نہیں ملا تھا کہ وہ قریشی عورتوں کے اقوال سن کر رونے لگ گئیں اور اس نکاح کے خلاف فریادی بن گئیں۔

ب۔ جب رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان بیان فرمائی، تو راضی ہو گئیں، لیکن پھر کسی مجہول شخص کی زبانی دوسری شادی کی اطلاع پاتی ہیں، تو اسی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر سے بال بچے لے کر بلا اجازت اور بغیر اطلاع دیئے تشریف لے جاتی ہیں اور اُن کا سر لونڈی کی گود میں دیکھ کر اس قدر غصہ اور ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کی قسم اور حلف پر بھی اعتماد نہیں کرتیں اور شکایت کے لیے بارگاہِ نبوی میں چلی جاتی ہیں، تو کیا آپ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی عظمتِ مرتضیٰ کو سمجھا، اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا۔ اگر حضرت زہرا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کی بے اعتباری اور بداعتمادی سے اور لوگوں کی شکایات ان کے حق میں قبول کر لینے سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شانِ اقدس میں فرق نہیں پڑتا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں کیونکر آپ کے ردِ عمل اور انقباض کو ان کے دین و ایمان کے منافی سمجھا جا سکتا ہے، جبکہ قرآن مجید، احادیثِ رسول، اقوالِ مرتضیٰ اور دیگر ائمہ کرام کے ارشادات سے ان کی فضیلت اور برتری روزِ روشن کی طرح نمایاں و آشکارا ہے۔

۴۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیاتِ طیبہ کے واقعات ملاحظہ کرنے کے بعد اب حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد قضیہ فدک میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر آپ کے غم و غصہ اور تغلیظ و تشدید کو ملاحظہ کریں:

فقالت یا ابن ابی طالب اشتملت شملة الجنین وقعدت حجرة

الظنین انقضت قادمۃ الاجدل فخانک ریش الاعزل ھٰذا ابن
ابی قحافۃ یبتزنی نحیلۃ ابی وبلغۃ ابنی لقد اجھر فی خصامی و
الفیتہ الدّ فی کلامی حتّٰی حبستنی قیلۃ نصرھا والمھاجرۃ وصلھا
وغضت الجماعۃ دونی طرفھا فلا دافع ولا مانع خرجت کاظمۃ
وعدت راغمۃ اضرعت خدک یوم اضعت حدک افترست
الذئاب افترسک الذباب ماکففت قائلا ولا اغنیت طائلا
ولاخیار لی لیتنی مت قبل ھنیئتی ودون ذلتی، عذیری اللّٰہ منک
عادیًا ومنک حامیا ویلای فی کل شارق، ویلای فی کل غارب
مات العمد ووھنت العضد، شکوای الیٰ ابی وعدوای الیٰ
ربی، اللّٰھم انت اشد قوۃ وحولا واحد بأسا وتنکیلاً۔

(احتجاج طبرسی ص۱۰۷ ، ناسخ التواریخ ج ۴، ص۸۹ و ۹۰)

تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے واپس آنے پر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا، اے ابن ابی طالب تو جنین کی طرح پردے میں لپٹ گیا ہے اور متہم لوگوں کی طرح حجرہ نشین ہو گیا ہے، کبھی تو نے شہبازوں کے شہپر توڑ ڈالے اور کبھی بے پر اور پرواز سے قاصر کے پَر و بال اکھیڑنے سے بھی قاصر ہے۔ یہ ابن ابی قحافہ مجھ سے میرے باپ کا عطیہ اور میرے بیٹوں کا لقمہ چھین رہا ہے، اُس نے میرے ساتھ علانیہ جھگڑا کیا اور میں نے اس کو اپنی گفتگو میں سخت جھگڑالو پایا، حتّٰی کہ قبیلہ کے افراد نے بھی مجھ سے اپنی امداد روکے رکھی اور مہاجرین نے میرے تعلق کو نظر انداز کیا اور حاضرین کی ساری جماعت نے میرے آگے آنکھیں بند کر لیں (اور میری موجودگی کو اہمیت نہ دی۔) پس نہ کوئی میری طرف سے دفاع کرنے والا ہے اور نہ رکاوٹ ڈالنے والا۔ میں غم و غصہ سے بھری ہوئی نکلی اور بے آبروئی اور بے عزتی کی حالت میں واپس ہوئی، تو نے اپنے رخسار کو ذلیل اور بے آبرو کر دیا ہے، جس دن سے اپنی قوت اور تیزیِ طبع کو ضائع کر دیا ہے۔ کبھی، تو تُو نے بھیڑیوں کو شکار کیا اور کبھی مکھیاں تجھے شکار کر رہی ہیں (اور

ایک نسخے کے مطابق، اب تو نے مٹی کو اپنا بچھونا بنا لیا اور خاک نشین ہو گیا ہے) نہ تو نے کسی کہنے والے اور بولنے والے کی زبان روکی اور نہ کوئی منفعت اور فائدہ پہنچایا، اور میرے اندر قوت و طاقت نہیں ہے۔ اے کاش! میں اس حقارت و ذلت سے پہلے ہی مر جاتی۔ اللہ تعالیٰ میرا عذر خواہ اور ناصر ہے، اس سے تجاوز کی حالت میں اور تجھ سے حمایت کی حالت میں ہلاکت ہے میرے لیے جہاتِ شرق میں اور ہلاکت ہے میرے لئے جہاتِ غرب میں، میرا سہارا موت کے منہ میں چلا گیا اور میرا دست و بازو کمزور ہو گیا۔ میری شکایت اپنے والدِ گرامی کی بارگاہ میں ہے اور میری فریاد اور استغاثہ میرے رب کی بارگاہ میں ہے۔ اے اللہ! تو ان کی نسبت سخت قوت و طاقت والا ہے اور شدید گرفت اور عقاب والا ہے۔

اقول، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں جو کلمہ آپ کی طرف سے نقل کیا گیا، اس کو تو وحیِ الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا گیا اور کسی توجیہ و تاویل کو روا نہ رکھا گیا، لیکن کیا ان کلمات کو بھی ظاہری معنی پر محمول کر کے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات کو موردِ طعن و تشنیع سمجھا جا سکتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمومی فضائل اور بالخصوص آپ کو ان کی زوجیت میں دینے کے بعد جو خصوصی فضیلت آپ کی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھی۔ کیا اس کو یہاں پر ملحوظ رکھا گیا ہے؟ اور حضرت حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وجود و عدم کو برابر قرار دیا گیا یا نہیں اور ان کو مکھیوں کے سامنے عاجز اور اپنے کو ذلیل و بے آبرو کرنے والا اور پردۂ رحم میں موجود بچوں اور متہم و گناہ گار لوگوں کی طرح خلوت نشین قرار دے کر کیا ان کے لافتیٰ اِلّا علی اور فاتحِ خیبر اور اسد اللہ الغالب ہونے کا انکار کیا گیا ہے یا نہیں؟ تو کیا شیعہ حضرات اس مطہرہ معصومہ صادقہ مصدقہ امینہ کے صدق و حقگوئی پر ایمان لاتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کی اس ناراضگی کو بھی اللہ و رسول کی ایذا رسانی قرار دے کر آیت کریمہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ (الآیہ) کو منطبق کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو

پھر گستاخِ صدیق اور اُن کے بُغض و عناد اور حسد و کینہ رکھنے والے سبائیوں پر ہی اسے منطبق کردو اور ان بزرگ اور ان کو اسی طرح منزّہ و مبرّا سمجھو، جیسے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کلمات سے منزّہ و مبرّا ہیں اور ایسے کلمات کہنے والے بھی اسی طرح معذور ہیں جس طرح حضرت کلیم اللہ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السّلام کے معاملہ میں معذور تھے ــ

والحمد للہ علیٰ وضوح الحق وصلی اللہ علیٰ حبیبہٖ وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین

تنبیہ: جس طرح شیعہ حضرات کے نزدیک ایسے واقعات و روایات و حکایات میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، کیونکہ وہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا سے افضل ہیں، بلکہ بقولِ شیعہ سوائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام انبیاء کرام علیہم السّلام سے بھی افضل ہیں، لہٰذا یہ توجیہ و تاویل حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کی طرف سے کی جاتی ہے اور اُن کے اقدام کو تنزل اور بشری تقاضے قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اہل السُّنّت کا مذہب بھی یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ افضل البشر بعد الانبیاء ہیں، یعنی تمام امّتوں سے افضل ہیں، لہٰذا ان پر کوئی الزام عائد کرنے کی بجائے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی طرف سے توجیہ و تاویل کرنی لازم ہے۔

نیز جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ناراضگی اور کبیدگی کا کوئی واقعہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں ہی پیش آیا تو دربارِ رسالت سے ہی حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے طہارتِ دامن کو واضح کر دیا گیا اور اگر اس قسم کا واقعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آتا تو یقیناً حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہی طرفداری فرماتے، کیونکہ جب بھی کسی صحابی کی طرف سے ان کے متعلق کوئی بات پہنچائی گئی تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہی ہوتا: ھل انتم تارکون لی صاحبی کیا تم میری خاطر میرے اس رفیق کو نشانہ بنانے سے باز نہیں رہ سکتے؟ فما اوذی بعدھا (بخاری شریف جلد اوّل ص۵۱۷) تو سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کی اس تنبیہ کے بعد کبھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایذاء اور تکلیف نہ دی گئی۔ یہی حضرت زہراء رضی اللہ عنہا جب بعض ازواجِ مطہرات کے کہنے پر سفارش کے لئے حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور عرض کیا: ان ازواجک ارسلنی الیک یسئلنک العدل فی ابنۃ ابی قحافۃ آپ کی ازواج نے مجھے آپ کی خدمت میں اس سفارش کے لئے بھیجا ہے کہ وہ آپ سے حضرت عائشہ سے محبت کے زائد ہونے کے بارے میں عدل و مساوات کا مطالبہ کرتی ہیں ــ تو آپ نے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو فرمایا: ای بنیۃ ألست تحبین ما احب قالت بلیٰ قال فاحبی ھذہ۔ کیا تمہیں اس سے محبت نہیں، جس سے مجھے محبت ہے؟ تو عرض کیا کیوں نہیں، تو آپ نے فرمایا، تو پھر ان سے (عائشہ صدیقہ سے) محبت رکھو، یعنی ان کی رضا و پسند کے خلاف اور برعکس کچھ نہ کیا کرو (مسلم شریف ج۲ ص۲۸۵)

مقامِ غور ہے کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر ہونے کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اتنی محبت ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ان کے خلاف دیگر ازواجِ مطہرات کی طرفداری اور سفارش کو سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محبت کے خلاف قرار دیتے ہیں اور حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی محبت کو اپنی محبت عین قرار دیتے ہیں تو خود صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی محبت آپ کی محبت کا عین کیونکر نہیں ہوگی اور ان کی محبت کے خلاف اقدام خود سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت کے خلاف کا ارتکاب کیونکر نہیں ہوگا، لہٰذا یہ حقیقت دوپہر کے اجالے کی طرح روشن ہوگئی کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی طرف سے جس طرح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شانِ اقدس کے خلاف سرزد ہونے والا قول و فعل محتاجِ تاویل ہے، اسی طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خلاف سرزد ہونے والا قول و فعل واجب التاویل ہے۔ ساری خرابی کی بنیاد یہ ہے کہ شیعہ ان اکابرین اصحاب اور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی مقربین کو انتہائی پست، حقیر اور محض نوکر چاکر اور کمی سمجھ لیتے ہیں اور پھر ایسے واقعات کی آڑ لے کر ان کے ایمان و ایقان اور اخلاص و

وفا اور خدمات و قربانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبہ تک میں ان کے متعلق بیان فرمودہ بزرگیوں اور فضیلتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان پر برسنے لگ جاتے ہیں اور یہود و مجوس کو خوش کرنے اور ابلیسِ لعین کو راضی کرنے کی مقدور بھر سعی کرتے ہیں، حالانکہ ایسے مقدس لوگوں کے معاملات کو صرف اور صرف حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے واقعہ کی روشنی میں ہی دیکھنا اور سمجھنا اور اس کی توجیہ و تاویل کرنا ضروری ہے۔

رہی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی نسبی شرافت اور فضیلت کہ آپ لختِ جگر اور نورِ نظر ہیں سیدِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی تو اس میں کس کا فر کو شک ہو سکتا ہے، لیکن وہ شرف و فضل تو آپ کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر بھی حاصل ہے۔ پھر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے اقدام کو تنزل اور اپنے مقام و مرتبہ کے خلاف پر کیوں محمول کیا گیا ہے، لہٰذا روزِ روشن کی طرح عیاں کہ جزوی فضیلت کے باوجود ان کا مقام و مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں ہے اور خود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما تمام اُمت سے افضل ہیں اور وہ اُن کے اعمالناموں کے ساتھ رشک فرماتے ہیں، وغیر ذالک کما سیتی فی المجلد الاوّل

حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ

علامہ ڈھکو صاحب نے اپنے اسلاف کی اتباع میں حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ کی بحث درمیان میں لا کر حضراتِ صحابہ اور اہل بیت کرام علیہم الرضوان کے درمیان انتہائی عداوت اور دشمنی ثابت کرنے کی سعی نامشکور فرمائی ہے اور اسے فدک نہ دیئے جانے پر غم و غصہ و ناراضگی کی دلیل بنایا ہے، حالانکہ یہ استنباط بوجوہ باطل ہے :

ا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض دفعہ واقعہ ایک ہی ہوتا ہے، لیکن اس کی تعبیر اور حکایت ہر شخص اپنے نظریۂ و عندیہ کے مطابق کرتا ہے، تو اس طرح حقیقت کا چہرہ اُجلا اور صاف ستھرا ہونے کے باوجود ان تعبیرات و حکایاتِ مختلفہ کی وجہ سے دھندلا جاتا ہے اور اس واقعہ

کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا ہے۔ جنازہ میں حضرت صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما اور دیگر مہاجرین و انصار کے شامل نہ ہو سکنے کی وجہ علیٰ تقدیرِ صحتِ الروایت دراصل یہ تھی کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اپنی صفتِ حیا و شرم کے کمال اور پردہ و ستر کے اہتمام کے پیشِ نظر اپنے جنازہ کو نمایاں نہیں کرنا چاہتی تھیں اور آپ کو بیماری کے ایام میں ہر وقت یہی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ میرے جسم پر کفن ہونے کے باوجود لوگوں کو میری قامت اور سراپا دیکھنے کا موقعہ مل جائے گا اور پتہ چلتا رہے گا کہ سر کہاں ہے اور سینہ کہاں ہے اور اسے بھی وہ اپنی شانِ تستر کے خلاف سمجھتی تھیں، حتیٰ کہ اس پریشانی اور تفکر کو دور کرنے کے لیے حضرت اسماء بنت عمیس زوجۂ صدیق اکبر رضی اللہ عنہما نے (اور ناسخ التواریخ کے اندر منقول قول کے مطابق ملائکہ نے) جنازہ کی چارپائی پر کھجور کی شاخوں کو دونوں جانبوں میں کمان کی صورت بنا کر اٹکا دیا اور اوپر کپڑا ڈال کر پردہ کا معقول انتظام کر کے بطورِ نمونہ دکھلایا کہ اس طرح آپ کی نعش پر ستر اور پردہ کا اہتمام کر لیں گے تو آپ کو بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ (اشعۃ اللمعات ص ۴۶ ج ۳) مواہب مع زرقانی ج ۳ ص ۲۰۶

الغرض جنازہ کے اعلانِ عام اور اس پر بھیڑ بھاڑ سے گریز اور چند آدمیوں کے پڑھنے پر اکتفاء کی دراصل یہی وجہ تھی کہ ستر اور پردہ کا اہتمام مقصود تھا اور رات کی تاریکی میں ہی نماز جنازہ پڑھنے پر اکتفاء کی دراصل یہی وجہ تھی کہ ستر اور پردہ کا اہتمام مقصود تھا اور رات کی تاریکی میں ہی ــــــــــ دفن کرنے کا اصل مقصد یہی تھا مگر سبائی ذہنیت نے اس سیدھی سادی حقیقت کو اپنے قلبی غیظ و غضب اور بغض و عناد کی وجہ سے دوسرا رنگ دے کر اہلِ اسلام میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کے لیے بطورِ حربہ استعمال کیا۔ ناسخ التواریخ میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی تحریری وصیت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ ان میں حضراتِ شیخین اور دیگر مہاجرین و انصار کے ساتھ عداوت اور غم و غصہ کی وجہ سے ان کو جنازے میں شریک نہ کرنے کا کوئی لفظ موجود ہے یا یہ محض سبائی جماعت کی افسانہ نگاری ہے :

انت اولیٰ بی من غیری حنطنی وغسلنی وکفنی باللیل وصل علیٰ وادفنی باللیل ولا تعلم احداً۔ (ناسخ التواریخ جلد چہارم کتاب دوم، ص۱۳۶) تم دوسروں کی نسبت میرے زیادہ قریبی ہو اور حقدار، لہٰذا تم ہی رات کے وقت مجھے غسل دینا اور حنوط لگانا اور کفن دینا اور رات ہی رات مجھ پر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دینا اور کسی کو اطلاع نہ دینا۔

اور ایک روایت کے مطابق صرف سات آدمی حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ خلقت الارض بسبعة وبہم یرزقون وبہم یمطرون وبہم ینصرون (الیٰ)، قال علی وانا امامہم وہم الذین شہد واالصلوٰۃ علیٰ فاطمۃ رضی اللہ عنہا وعنہم (ناسخ التواریخ جلد ۴ ص۱۱۲) یعنی زمین صرف سات افراد کے لیے پیدا کی گئی ہے اور انہیں کی بدولت لوگ رزق دیئے جاتے ہیں اور انہیں کے طفیل بارشیں ہوتی ہیں اور انہیں کے صدقے میں لوگوں کو نصرت و امداد دی جاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں ان کا امام ہوں اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ پڑھی۔

اور ان دونوں روایتوں کو سامنے رکھو تو تمام مہاجرین و انصار بلکہ بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب اور بنو عبد مناف کو بھی اور بالخصوص حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد، حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی اولاد کو بھی آپ کے جنازہ میں شریک نہیں کیا گیا، تو آخر ان کے ذمے کونسا الزام تھا؟ انہوں نے کس طرح حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو ناراض اور غضب ناک کیا تھا؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تو صرف ایک مرتبہ کے ان کے ارشاد پر آمنّا وصدّقنا کہتے ہوئے سات باغات میں سے اپنا نصف حق چھوڑ دیا تھا اور ہر معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُن کی معاونت برقرار رہی، لہٰذا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ میں شامل نہ ہونے کی وہ وجہ قطعاً نہیں ہے، جس کو سبائی ذہنیت نے اختراع کیا، بلکہ ستر و پردہ اور حیا و شرم کے

تحت رات کو غسل و کفن اور رات کو ہی نماز جنازہ اور تدفین کا فریضہ سرانجام دیا گیا، اور عام اعلان اور تشہیر سے گریز کیا گیا۔

نیز یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ نمازِ جنازہ فرضِ عین نہیں ہے اور بعض لوگوں کے پڑھ دینے سے سب کی طرف سے وہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے اور نہ پڑھنے والے یا نہ پڑھ سکنے والے گنہ گار نہیں ہوتے، لہٰذا اگر بالفرض حضرات شیخین اور دیگر مہاجرین و انصار اور اہل بیت کرام کے اہم ترین حضرات بھی اس نمازِ جنازہ میں شامل نہیں ہو سکے، تو ان کا تارک فرض ہونا اور مجرم و گناہ گار ہونا لازم نہیں آتا۔

۳۔ علاوہ ازیں اگر وہ حضرات شمولیت کے لیے آمادہ نہ ہوتے اور جنازہ پڑھنے کو اہم نہ سمجھتے تو اس کو بے پرواہی اور بے اعتنائی کہا جا سکتا تھا، لیکن باعتراف اہل التشیع وہ جمع ہو کر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے در پر بیٹھے رہے تاکہ جنازہ کی تقریبات میں شمولیت کی سعادت حاصل کریں، لیکن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ نمازِ جنازہ کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ اب نہیں پڑھی جائے گی۔

اجتمع الناس فجلسوا وہم یضجون وینتظرون ان تخرج الجنازۃ فیصلون علیہا وخرج ابوذر فقال انصرفوا فان ابنۃ رسول اللہ قد اخر اخراجہا فی ہذہ العشیۃ فقام الناس وانصرفوا (ناسخ التواریخ جلد چہارم ص۱۳۵) لوگ جمع ہو گئے پس بیٹھ گئے، جبکہ وہ آہ و زاری کر رہے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ جنازہ کو نکالا جائے تاکہ اس پر نماز پڑھیں اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نکلے، پس انہوں نے کہا سبھی حضرات فی الحال چلے جائیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کی تجہیز و تکفین وغیرہ کو اس رات مؤخر کر دیا گیا ہے، تو لوگ اس اعلان پر اُٹھ کر چلے گئے۔

اور جب نماز جنازہ پڑھی گئی، تو کسی کو اطلاع ہی نہ دی تو اندریں صورت ان حضرات پر اعتراض و تنقید اور الزام و اتہام کی کیا گنجائش ہے، بلکہ اس کا جواب تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بلکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ذمے ہے کہ انہوں نے بالعموم صحابہ

کرام کو اور بالخصوص اپنے قریبی برادری کے اہم ترین افراد کو بھی اس سعادت سے محروم کیوں رکھا کیا حضرت زہراء اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کی نظر میں یہ سب بھی بے ادب و گستاخ تھے اور ظالم و غاصب بھی تھے۔ العیاذ باللہ!

۴۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار و تردید ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے صلوٰتِ خمسہ باجماعت ادا کرتے تھے اور یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو غسل و کفن دینے میں پوری طرح شامل تھیں، تو آخر شیعہ حضرات کو اس کی بھی کوئی توجیہ پیش کرنی چاہیئے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا نے حضرت علی کو ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہما) کی اقتداء سے کیوں نہ روکا اور وہ خود کیوں باز نہ آئے اور کیا فرضِ عین میں ان کے ساتھ شمولیت بلکہ ان کی اقتداء بھی جائز تھی اور فرض کفایہ میں ان کی شمولیت بھی جائز نہیں تھی۔ نیز حضرت اسماء رضی اللہ عنہا جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ازدواجی تعلق کو نہ توڑیں اور نہ ان سے کبیدہ خاطر اور بیزار و متنفر ہوں، بلکہ ان کی مکمل وفادار بیوی بھی ہوں اور ادھر بھی حضرت سیدہ کے الوداع کرتے کے جملہ ضروری امور میں شریک ہوں اور غسل و کفن وغیرہ اپنے ہاتھ سے سرانجام دیں کیا یہ جائز تھا؟ گویا مہاجرین و انصار اور اکابر اہل بیت سے تو مکمل بائیکاٹ کیا گیا، صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ کے تعلق کی بناء پر، مگر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا جن کا اکمل ترین تعلق تھا، وہ قابلِ برداشت ہوگئیں، آخر یہ کیا معاملہ ہے؟

۵۔ ان حقائق پر غور کر لینے کے بعد یہ تو واضح ہوگیا کہ اگر بالفرض یہ حضرات حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ میں شامل نہیں ہوسکے، تو اس میں ان کی کوتاہی و تقصیر اور بے اعتنائی قطعاً نہیں پائی گئی۔ اب معروضِ خدمت ہے کہ روایات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہ صرف نماز جنازہ میں شامل ہونا مذکور ہے، بلکہ ان کا نماز پڑھانا بھی منقول ہے، لہٰذا افسانے کی بنیاد ہی ختم ہوکر رہ گئی۔ ڈھکو صاحب

نے روضۃ الاحباب اور مدارج النبوت کا حوالہ دے کر حضرت سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نمازِ جنازہ سے روکنے کا تذکرہ کیا ہے، تو ہم اسی مدارج کی عبارت سے حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی وصیت کی حقیقت اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نماز پڑھانے کا حوالہ پیش کرتے ہیں تاکہ علامہ موصوف کی دیانت و امانت عالم آشکار ہوجائے۔

علامہ ڈھکو صاحب کی خیانت

گویند روزِ دیگر ابوبکر صدیق و عمر فاروق و صحابہ دیگر رضی اللہ عنہم با علی مرتضیٰ شکایت کردند کہ چوں مارا خبر نکردی تا شرف نماز بروے دریافتے علی عذر گفت کہ بنا بر وصیت وے کردم کہ چوں از دنیا بروم مرا بشب دفن کنی تا چشم نامحرم بر جنازۂ من نیفتد، مشہور میان مردم و مذکور در روضۃ الاحباب وغیرہ این است۔
(مدارج النبوت جلد دوم ص ۴۶۱)

کہتے ہیں کہ دوسرے دن ابوبکر صدیق و عمر فاروق اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی کہ ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی تاکہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا پر نمازِ جنازہ پڑھنے کی سعادت حاصل کرتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ان کی وصیت پر عمل کیا ہے کہ جب میں دنیا سے کوچ کروں تو مجھے رات کے وقت دفن کرنا تاکہ نامحرم کی نظر میرے جنازے پر نہ پڑے لوگوں کے درمیان مشہور یہی ہے اور روضۃ الاحباب وغیرہ میں اسی قول کو ذکر کیا گیا ہے۔

لیکن ڈھکو صاحب کے الفاظ یہ ہیں: کذا فی مدارج النبوت و جذب القلوب للشیخ الدہلوی، اس سے معلوم ہوا کہ جناب سیدۂ عالم کی وصیت یہ تھی کہ جن لوگوں نے ان کو اذیت دی ہے، وہ ان کی نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہونے پائیں (رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۶۸)

اب آپ ہی اندازہ لگائیں کہ اس سے بڑھ کر صحابہ کرام اور محسنانِ ملت کی عداوت اور دشمنی کے ساتھ ساتھ دین و دیانت اور ایمان و امانت کی دشمنی کیا ہوگی؟ اور حضرتِ زہرا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما پر بہتان اور افترا پردازی کی دلیل کیا ہوگی کہ وصیت کی عبارت روضۃ الاحباب کے حوالے سے مدارج النبوّت میں صراحت کے ساتھ مذکور ہونے کے باوجود اس کو چھوڑ کر اپنی طرف سے نئی عبارت ذکر کر دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس تحریف و تغییر کی عادت اسلاف میں تھی۔ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ بَعْضِ مَوَاضِعِهٖ۔ وہ نہ صرف باقی ہے، بلکہ مرورِ ایام کے ساتھ اس میں اضافہ اور ترقی ہوتی ہے، کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ کیا یہ ظلم کی انتہا نہیں کہ جس شیخ عبدالحق کا نام لے کر اہل سنت بلکہ تمام عالم اسلام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان حضرات کے جنازہ میں شامل نہ کیے جانے کی وجہ کیا تھی، وصیت کا لفظ تو ان سے لے لیا، مگر اس کی تشریح اپنی مرضی کے مطابق کر دی اور ان کی تصریح کے سراسر خلاف اور ساتھ ہی ان کی عبارت بھی نا تمام ذکر کی اور ان کی پوری تحقیق ظاہر ہونے دی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

در روایاتِ در خبر شدہ شدن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ و آمدن او بر جنازۂ زہرا و نماز گزاردن وے و عثمان بن عفان و عبدالرحمٰن بن عوف و زبیر بن العوام نیز آمدہ است ——— یعنی گو مشہور قول پہلا ہے اور روضۃ الاحباب میں اسی کو ذکر کیا گیا ہے، لیکن روایات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع دیے جانے اور ان کے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے جنازے میں شامل ہونے اور پڑھنے کا تذکرہ ہے اور آپ کے ساتھ حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہم کا نماز پڑھنا بھی منقول ہے، یعنی اس مضمون کی صرف ایک ایک نہیں، کئی روایات مروی و منقول ہیں، لیکن ڈھکو صاحب نے اس عبارت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

اور حضرت شیخ عبدالحق محدثِ دہلوی رحمہ اللہ نے اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں ذکر فرمایا: و بتحقیق آمدہ است در اخبار کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حاضر نشد جنازۂ فاطمہ را و نرسیدہ بداں پس میگویند کہ فاطمہ وصیت کردہ بود کہ نماز نگزارد ابوبکر بر جنازۂ وے و گفتہ اند کہ ایں سخن غلط است و افترا است و چگونہ وصیت کند وے رضی اللہ عنہا بداں باوجود آنکہ احق بامامت نمازِ جنازہ سلطان است و لہذا گزاشت امام حسین رضی اللہ عنہ مروان بن الحکم را کہ حاکمِ مدینہ بود از جانبِ معاویہ کہ نماز کند بر جنازۂ امام حسن رضی اللہ عنہ و گفت اگر حکم شریعت نمی بود، نمی گزاشتم ترا کہ نماز کردی بر وے (جلد سوم صفحہ ۴۸۰ و ۴۸۱)

اخبار و روایات میں یہ امر مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے جنازے میں حاضر نہ ہوئے اور نہ پہنچے۔ کچھ لوگوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں، لیکن دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ بات سراسر غلط ہے اور محض افترا اور بہتان ہے، آپ کس طرح اس امر کی وصیت کر سکتی تھیں، جبکہ ازروئے شریعت نمازِ جنازہ کا سب سے زیادہ حقدار حاکمِ اسلام ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے مروان بن حکم کو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت دے دی تھی جو کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینہ منورہ کا حاکم مقرر تھا اور فرمایا کہ اگر شریعتِ مطہرہ کا حکم اس طرح نہ ہوتا، تو میں ہرگز تجھے نمازِ جنازہ نہ پڑھانے دیتا۔

الغرض جو کچھ علامہ ڈھکو صاحب نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی وصیت کی تشریح میں ذکر کیا ہے، وہ ان کی اپنی اختراع ہے اور حضرت عبدالحق محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب میں اس کا نام و نشان نہیں، بلکہ انہوں نے اس کو کذب اور افترا سے تعبیر کیا ہے۔ مذہب و مسلک اور عقیدہ و نظریہ کا اختلاف اپنی جگہ مگر اس قدر دروغ گوئی اور افترا پردازی تو غیر مسلم بھی گوارا نہ کریں گے جس کو ان علماء شیعہ نے کارِ ثواب سمجھ کر اپنا رکھا ہے اور نوّے فیصد درجات کا حصول اس پر موقوف کر دیا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت زہرا فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ پڑھانا

یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ روایات میں حضرتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نمازِ جنازہ میں شامل ہونا، بلکہ خود بھی پڑھانا ثابت ہے۔

۱۔ عن جعفر بن محمد عن ابیہ قال ماتت فاطمۃ بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجاء ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما لیصلیا فقال ابوبکر لعلی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تقدم فقال ماکنت لاتقدم وانت خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتقدم ابوبکر فصلّٰی علیہا۔ کنز العمال ج ۶، ص ۳۵۴)

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے والدِ گرامی حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا وصال ہو گیا، تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما آئے تاکہ نماز پڑھیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا آگے بڑھئے اور نماز پڑھایئے، تو آپ نے کہا میرے لئے یہ زیبا نہیں کہ میں آگے بڑھوں، جبکہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور نائب ہو (اور موقعہ پر موجود ہو) چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، پس انہوں نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا پر نماز پڑھائی۔

۲۔ علامہ حلبی نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے: روی ابن سعد، ان ابابکر رضی اللہ عنہ جاء الی بیت علی لما مرضت فاطمۃ فاستاذن علیہا فقال علی کرم اللہ وجہہ ھٰذا ابوبکر علی الباب یستاذن فان شئت ان تاذنی لہ فاذنی قالت وذالک احب الیک قال نعم فاذنت لہ فدخل واعتذر الیہا فرضیت عنہ وان ابابکر رضی اللہ عنہ صلّٰی علیہا۔ ج ۳، ص ۳۹۹)

ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف آئے، جبکہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بیمار تھیں، پس اذن طلب کیا تو انہوں نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے کہا، یہ ابوبکر دروازہ پر موجود ہیں اور اذن طلب کرتے ہیں۔ اگر چاہو اور مناسب سمجھو تو اجازت دے دو، تو آپ نے دریافت کیا کہ تمہیں میرا اجازت دینا پسند ہے۔ تو انہوں نے فرمایا، ہاں مجھے تو پسند ہے۔ چنانچہ آپ نے اجازت دے دی۔ وہ اندر حاضر ہوئے اور آپ سے معذرت کی، تو آپ ان سے راضی ہو گئیں اور بے شک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی آپ پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔

۳۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے (تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۸۱) در فصل الخطاب آوردہ کہ ابوبکر صدیق و عثمان بن عفان و عبدالرحمٰن بن عوف و زبیر العوام وقتِ نمازِ عشاء حاضر شدند و رحلت حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا در میان مغرب و عشاء شب سہ شنبہ سوم ماہِ رمضان المبارک بعد از شش ماہ از واقعہ سرورِ جہاں بوقوع آمدہ بود و سنین عمرش بست و ہشت بود و ابوبکر بموجب گفتہ علی مرتضےٰ (رضی اللہ عنہ) پیش امام شد و نماز بروے گزارد و چہار تکبیر برآورد

یعنی فصل الخطاب میں نقل کیا ہے کہ ابوبکر صدیق، عثمان ذی النورین، عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہم نمازِ عشاء کے وقت حاضر ہوئے اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا وصال مغرب اور عشاء کے درمیان ہوا تھا، یعنی منگل کی رات اور ماہِ رمضان کی تین تاریخ کو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے چھ ماہ بعد جبکہ آپ کی عمر شریف اٹھائیس برس تھی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپ کی نمازہ جنازہ پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں۔

۴۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی عبارت گزر چکی، جس میں تصریح ہے کہ متعدد روایات میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے نمازِ جنازہ میں شامل ہونے کی تصریح ہے اور معتزلہ بھی اسی کے قائل اور معترف ہیں، چنانچہ قاضی عبدالجبار نے مغنی میں اسی کی تصریح کی ہے اور ابوعلی سے

بھی اسی طرح نقل کیا ہے: اَمَّا امر الصّلٰوۃ فقد روی ان ابا بکر ھو الذی صلّی علیٰ فاطمۃ علیہا السلام وکبر علیہا اربعا و ھٰذا احد ما استدل بہٖ کثیر من الفقہاء فی التکبیر علی المیّت۔
(بحوالہ شرح حدیدی جلد ۱۶، ص ۲۷۱)

رہا نماز کا معاملہ تو روایت کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر نمازِ جنازہ پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں اور جنازہ پر چار تکبیریں کہنے کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے جس سے بہت سے فقہاء نے استدلال کیا ہے۔

ادائیگی نمازِ جنازہ کے وجوہ ترجیح

۱- شیخ محقق کی زبانی معلوم ہو چکا کہ از روئے شرع شریف نمازِ جنازہ کا اصل حقدار ہی حاکمِ اسلام ہے اور اہل بیت کرام بھی اس کے قائل اور معترف تھے، اسی لیے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی بجائے مروان بن الحکم حاکمِ مدینہ نے پڑھائی تھی۔

۲- حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں ادا کرتے تھے اور یہ حقیقت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے بھی مخفی نہیں تھی، تو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پانچوں وقت ان کی اقتداء کرتے ہوں، تو ان کو اپنے امام کو نمازِ جنازہ ادا کرنے سے روکنے کی وصیت کرنا کسی بھی عقلمند کی عقل کس طرح گوارا کر سکتی ہے۔ نیز حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے سپرد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا غسل اور کفن وغیرہ تھا تو بیوی سے اس قدر قریبی ربط و تعلق اور خاوند سے اس قدر عداوت اور دشمنی کا کوئی معقول انسان تصور کر سکتا ہے، جبکہ وہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی بیوہ تھیں اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا نکاح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔ اگر انہیں اہل بیت کرام عزیز تھے اور خاوند کے اقدامات سے بیزار تھیں، تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں کیوں رہتی تھیں اور اگر انہیں اہل بیت کرام سے عداوت ہوتی، تو ایسی عورت کو اپنی

زوجیت میں کیسے رکھتے، لہٰذا جنازے میں شمولیت سے باز رکھنے کی وصیت کا کوئی امکان ہی نہیں اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے بوجہ اسماء نمازِ جنازہ کا اخفا ممکن ہی نہ تھا۔

۳- حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے تقیہ کا علم تھا یا نہیں؟ دوسری شق کا بطلان واضح ہے اور پہلی صورت میں ان کو ایسی وصیت کر کے ان کے تقیہ کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑنے والی بات تھی اور قبل ازیں بیعت کے معاملہ بقولِ شیعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے بہی خواہوں کا جبر و تشدد بھی دیکھ چکی تھیں، تو خود جہان سے رخصت ہوتے ہوتے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے دوبارہ پریشانی اور مخاصمت کا سامان کر جانے کا آپ کس طرح سوچ سکتی تھیں۔

۴- بیمار پرسی اور عیادت کے لیے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کی اجازت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ لے دیں اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اُن کی مرضی معلوم کر کے اجازت دے دیں اور نمازِ جنازہ جیسے اہم معاملہ میں جو حق ہی در اصل حاکمِ اسلام کا ہو، اس میں رکاوٹ ڈالیں اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر اپنی مرضی مسلّط فرمائیں، کیا اس کی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا جیسی معدنِ تقویٰ و ورع سے توقع ہو سکتی تھی؟ جبکہ یہ بھی ثابت ہو چکا کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باہم ایک دوسرے سے راضی ہو چکے تھے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں راضی نہیں کر لیا تھا اُن کے گھر اور در سے نہیں اُٹھے تھے۔

لہٰذا جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی طرف سے ان حضرات کو نمازِ جنازہ سے دُور رکھنے کی وصیت باطل ہو گئی اور اصل حق بھی نمازِ جنازہ پڑھانے کا حاکمِ اسلام کے لیے ثابت ہو تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بغیر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ پڑھایا جانا بعید ہے، بلکہ مشکل ہے، بلکہ ناممکن ہے اور چونکہ تستر اور پردہ داری کے اہتمام و التزام کی وجہ سے عام لوگ شامل نہیں تھے، صرف خواص تھے، لہٰذا اگر عام لوگوں کو پتہ نہ چل سکا ہو تو یہ امر بعید نہیں اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے شامل نہ ہونے کی شہرت کا سبب بھی۔ یہیں سے واضح ہو جاتا ہے، جبکہ بحقیقت محتاج

بیان نہیں کہ ہر مشہور بین الناس قول ضروری نہیں کہ واقعہ کے مطابق بھی ہو، جبکہ یہود و مجوس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ایسے مواقع کو غلط رنگ دے کر اہل اسلام میں افتراق و انتشار پیدا کرنے اور ان کی نظریاتی وحدت اور جمعیت ملت کو پراگندہ کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی۔

سوال: مسلم شریف ج ۲ ص۹۱ میں بصراحت موجود ہے:

فلمّا توفیت دفنها زوجها علی بن ابی طالب لیلاً ولم یوذن بها ابابکر وصلّی علیها علیؓ۔ جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے وفات پائی، تو انہیں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے رات کے وقت دفن کر دیا اور ان کے متعلق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہیں دی تھی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان پر نماز پڑھی۔ لہٰذا مسلم شریف کے مقابلہ میں کنز العمال وغیرہ کی روایت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

جواب: مسلم شریف کی روایت کو از روئے سند قوی تسلیم کر بھی لیں تو بھی اس کے مضمون اور متن کو دوسری روایات پر ترجیح اس معنی و مفہوم کے لحاظ سے نہیں ہو سکتی جو شیعہ حضرات کشید کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اس میں صرف اتنا قدر بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اطلاع نہیں دی تھی، تو اس سے کیسے لازم آیا کہ ان کو اطلاع ہی نہیں ہوئی تھی۔ فرد واحد سے ایک فعل کی نفی کر دینے سے مطلقاً اس فعل کی نفی کیسے ثابت ہو گئی، جبکہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہی حضرت زہرا فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تجہیز و تکفین کرنے والی تھیں، تو لازمی طور پر انہوں نے اطلاع دی ہو گی۔

نیز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اگر ان کے خاوند تھے، تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ان کے نانے تھے، تو خاوند پر کیا لازم تھا کہ نانے صدیق اور دادے حضرت عباسؓ کو اطلاع دیں، ان کا اپنے ذرائع سے معلوم کرنا ہی ان کے شایانِ شان تھا۔ علاوہ ازیں اس روایت میں دفن اور نماز دونوں میں صرف حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے تو اسلامی فرقوں میں سے یہ کس کا مذہب ہے کہ سوائے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے کوئی

فرد بھی نہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے جنازہ میں شریک تھا اور نہ دفن میں۔ اگر اس روایت سے حضرات شیعہ کے مسلمہ سات افراد کی نمازِ جنازہ اور تدفین زہرا میں شمولیت کی نفی نہیں ہوتی، تو ہمارے مذہب و مسلک کے مطابق ان حضرات کی شمولیت کی نفی کیونکر ہو سکتی ہے، کیا حسنین اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم بھی شامل نہیں تھے، لہٰذا اس روایت سے ان حضرات کے نہ علم و اطلاع کی نفی ہو سکتی ہے اور نہ نمازِ جنازہ اور تدفین میں شامل ہونے کی، جبکہ ہماری ذکر کردہ روایات و حوالہ جات سے ان کی شمولیت کا اثبات ہے، اور درایتی و عقلی وجوہ بھی اسی شمولیت کے مؤید ہیں، لہٰذا وہی راجح و مختار اور اقرب الی الصواب ہے۔ رہ گیا اس روایت کے مطابق حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا بوقتِ شب دفن کیا جانا تو اس میں بحث ہی نہیں اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی تدفین کرنا اور ان پر نماز پڑھنا، تو اس کا کس کافر کو انکار ہے، لیکن اس کا مطلب ہو نماز پڑھانا، تو جب دوسرے کسی دوسرے آدمی کا ذکر ہی نہیں تو امامت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کیسے ثابت ہو گئی تاکہ ہماری پیش کردہ روایات کے معارض ہو، بلکہ حقیقتِ حال یہی ہو گی کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے پڑھی، جس طرح دوسرے چند خواص نے پڑھی، لیکن پڑھائی کس نے، تو اس کی وضاحت حضرت امام جعفر صادق اور امام محمد باقر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت نے کر دی۔ ہم پر تو الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اہل بیت کی روایات کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن صورتِ حال برعکس نکلی۔ ہم ان دونوں اماموں کی روایت کو مان رہے ہیں، جبکہ شیعہ ابن شہاب زہری کی روایت پر اپنے کشید کردہ مفہوم کے مطابق ایمان لائے اور اہل بیت کرام کی روایت کو نظر انداز کر دیا۔

علامہ زرقانی نے شرح مواہب میں ذکر کیا: روی ابن سعد عن عمرة قالت صلی العباس علی فاطمة ونزل هو وابنه الفضل وعلی رضی الله عنهم فی حفرتها۔ یعنی ابن سعد نے عمرہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پر نمازِ

جنازہ پڑھی اور وہ خود اور اُن کے صاحبزادے حضرت فضل اور حضرت علی رضی اللہ عنہما آپ کی قبر شریف میں اترے، لیکن بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اور واقدی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہا: اِنَّ علیاً صلیٰ علیہا۔ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ پر نماز پڑھی۔ تو علامہ زرقانی نے اس تخالف کو دُور کرتے ہوئے فرمایا: ولا خلف فکل صلیٰ علیہا والامام العباسؓ لانہٗ عمہٗ فقدمہ کہ ان دونوں روایات میں باہم کوئی تخالف و تناقض نہیں کیونکہ ہر ایک نے ان پر نماز پڑھی اور امام حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے، کیونکہ وہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے چچے تھے، لہٰذا انہیں آگے کھڑا کیا اور امام بنایا۔

اس بحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ صَلّیٰ عَلَیْھَا عَلِیٌّ سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بنے ہوں، کیونکہ اس میں امامت کا بیان مطلوب ہوتا تو صلیٰ بالناس علیہا وغیرہ کہا جاتا، جب امام بننے کی تصریح نہیں ہے، تو بخاری و مسلم کی یہ روایت جس طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی امامت کی نفی نہیں کرسکتی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت کی نفی بھی نہیں کرسکتی، کیونکہ روایت میں صلیٰ العباس بالناس علیٰ فاطمۃ کے الفاظ تو نہیں ہیں تاکہ روایت اس معنی پر صریح الدلالت ہو، بلکہ محض حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے چچا ہوتے اور عمر رسیدہ بزرگ ہونے کو اس ظنّ غالب کا قرینہ بنایا گیا اور حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کا عمر رسیدہ ہونا اور خلیفۂ وقت ہونا اس امر کا اقویٰ قرینہ ہے کہ امام انہیں بنایا گیا، کیونکہ شریعتِ مطہرہ میں اصل حقدارِ امامت کے وہی تھے، لہٰذا جب ان کی نمازِ جنازہ میں شمولیت ثابت ہوگئی اور روایت سے بھی اور درایت سے بھی، اُن کی امامت بھی ثابت ہوگئی۔

سوال: علامہ زرقانی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں شامل ہونے والی روایات پر جرح کردی ہے اور انہیں ضعیف قرار دیا ہے:- و

للواقدی عن الشعبی صلیٰ ابوبکر علیٰ فاطمۃ وھذا فیہ ضعف وانقطاع وروی عن بعض المتروکین عن مالک عن جعفر بن محمّد نحوہ ووھاہ الدار قطنی وابن عدی۔

یعنی واقدی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر نماز پڑھی اور اس میں ضعف اور انقطاع ہے اور بعض متروک راویوں نے امام مالک رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کیا ہے اور اس کو دارقطنی اور ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے، تو ایسی ضعیف روایات کا سہارا لے کر حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دفاع کیسے کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ان حضرات کے تبصروں کا تعلق محض سند سے ہے اور سند کا ضعف علی الاطلاق متن اور مضمونِ حدیث کے ضعف کو مستلزم نہیں ہوتا جیسے کہ کتبِ اُصول میں صراحت کی گئی ہے اور امام نووی نے مسلم شریف کی عبارت عرف التمییز بین صحیح الروایات وسقیمھا وثقات الناقلین ومن المتھمین کے تحت فرمایا: لیس ھو من باب التکرار للتاکید بل لہٗ معنی غیر ذالک فقد تصح الروایات لمتن ویکون الناقلون لبعض اسانیدہ متھمین الخ جلد اوّل، ص۲۔ یعنی قول مسلم صحیح الروایات پر ثقات الناقلین کا عطفِ تکرار اور تاکید کے قبیل سے نہیں ہے، بلکہ معطوف کا معنی معطوف علیہ سے مختلف ہے، کیونکہ کبھی روایات متن کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں اور ان کے نقل کرنے والے بعض سندوں کے لحاظ سے متہم ہوتے ہیں اور ترمذی شریف میں بہت سی ایسی روایات ہیں جن پر باعتبارِ سند ضعف کا حکم لگایا گیا، لیکن مضمون اور متن کی صحت کو اس کے تمام اہلِ علم صحابہ و تابعین کے معمول بہ ہونے سے واضح کردیا گیا ہے۔

نیز شیعہ حضرات کے ہاں ابلیس جیسے لعین اور کذّاب سے روایات منقول ہیں، جن پر ان کے ایمان کا دارومدار ہے، جیسے کہ شیعہ کے ادب اہل بیت کا نمونہ دکھلاتے ہوئے علل الشرائع کے حوالے سے ذکر کروں گا، لہٰذا یہ امر مسلّم بین الفریقین ہو گیا کہ ضعف علی الاطلاق ضعف متن کو مستلزم نہیں ہوتا اور یہ بھی مسلّم امر ہے کہ جب ضعیف روایت مختلف طرق سے مروی و منقول ہو تو وہ درجۂ حسن تک پہنچ جاتی ہے اور اس روایت کے طرق اور اسانید کا تعدّد علامہ زرقانی کی عبارت سے بھی ظاہر ہے اور شیخ محقق عبدالحق محدّث دہلوی علیہ الرحمہ کے قول سے بھی ثابت ہو چکا کہ کئی روایات سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کے جنازہ میں شمولیت ثابت ہے اور بخاری و مسلم کی روایات سے ان روایات کی نفی بھی نہیں ہو سکتی، جیسے کہ عرض کر چکا ہوں، لہٰذا ان روایات کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی طرح اس امر کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے جنازہ میں شامل نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی طرف سے کوئی ایسی وصیت ہی ثابت ہے تو محض ظنّ و گمان اور تخمینوں سے کام لیتے ہوئے اتنی عظیم شخصیات کو موردِ الزام ٹھہرانا کسی طرح بھی روا نہیں ہو سکتا، جیسے کہ بارہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کر چکا ہوں کہ یہ امر عدل و انصاف کے خلاف ہے کہ ثقہ شخص پر ظن و گمان کے تحت کوئی حکم لگا دیا جائے۔ نیز یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ شیعہ مدّعی ہیں اور قطعی دلیل پیش کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ ہمارے لئے تو ابداءِ احتمال اور جانبِ مخالف کا امکان بیان کر دینا ہی کافی ہے مگر ہم نے بحمدہٖ تعالیٰ جانبِ مخالف یعنی صلوٰۃ صدیق کا رجحان اور اس مضمون کی روایات کا لائقِ اعتبار اور قابلِ استدلال ہونا بھی واضح کر دیا ہے۔

رسالہ مذہب شیعہ — حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی قدس سرہ

ابن شہاب زہری کی روایات کی حیثیت

اہل السنّت پر اعتراض کرنے سے پہلے اہل السنّت کے مذہب کے متعلق واقفیت ضروری ہے۔ ذاکرینِ اہلِ تشیع جب اپنے مذہب کے اصولوں سے ناواقف ہیں تو اہل السنّت والجماعت کے اصول سے کیونکر واقف ہو سکتے ہیں۔ میاں! اہل السنّت والجماعت کے مذہب کا اصل الاصول یہ ہے کہ حدیث کی صحت یا ضعف اس کے راوی کی صحت یا ضعف پر موقوف ہے۔ اگر حدیث کا راوی صحیح العقیدہ، سچّا، صحیح حافظہ والا ہے، تو اس کی روایت کو صحیح مانا جائے گا، ورنہ وہ روایت ضعیف (یا موضوع) کہلائے گی۔

اب فدک والی روایت دیکھئے، اس کی سند میں ایک راوی محمد بن مسلم ہے جس کو ابن شہاب زہری بھی کہتے ہیں۔ صرف یہی راوی یہ روایت کرتا ہے (جس میں یہ ختم ہونے والی ناراضگی اور ہجران و قطع تعلقی وغیرہ کا ذکر ہے) اس کے ساتھ دوسرا کوئی شاہد نہیں اور یہی محمد بن مسلم ابن شہاب زہری اہل تشیع کی اصول کافی میں بیسیوں جگہ پر روایت کرتا نظر آتا ہے اور اہل تشیع کی فروع کافی نے تو اس کی روایات کے بل بوتے پر کتاب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تو بھائیو! اہلِ تشیع کے اس قدر مشہور و معروف کثیر الروایت آدمی کی روایت سے اہل السنّت پر الزام قائم کرنا اور ائمہ صادقین کو جھٹلانا عجیب نظر و فکر ہے۔ اگر اہل تشیع کے راویوں کی روایات اہل السنّت کے لیے قابل ہوتیں، تو پھر بخاری ہو یا کلینی اس میں کیا فرق تھا۔

آپ کی مزید تسلّی کے لیے اسی محمد بن مسلم بن شہاب صاحب کو کتاب منتہی المقال

یا رجال بوعلی میں شیعوں کی صف میں بے نقاب بیٹھا ہوا دکھاتے ہیں۔ دیکھو کتاب رجال بوعلی، جہاں صاف لکھا ہے کہ محمد بن مسلم بن شہاب زہری شیعہ ہے تو فدک کا جھگڑا اب تو ختم کرو۔ ہم تو ابن شہاب زہری کو اچھا سمجھتے رہتے۔ اگر گھر کے بھیدی یہ بھید نہ کھولتے۔ اس کے باوجود بھی اس کی روایت پر غور کرتے۔ اگر کوئی ایک آدھ دوسرا راوی بھی اس کے ساتھ مل کر ایسی شہادت دیتا۔

کیا اہل السنت غریب اس قدر مظلوم ہیں کہ ان کے مذہب کے خلاف اگر کوئی شیعہ اور وہ بھی اکیلا روایت کر دے، تو اس کو اہل السنت کے خلاف بطور الزام پیش کیا جاتا ہے اور اہل تشیع اس قدر با اختیار ہیں کہ ان کی اپنی کتابوں میں ائمۂ معصومین کی سند سے کوئی حدیث بیان کی جائے، تو اُن کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوتا کہ اکیلے امام یہ روایت کرتے ہیں، ان کے ساتھ دوسرا کوئی شاہد نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اخبار آحاد سے ہے اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ دیکھو تلخیص الشافی ص۴۲۸ مطبوعہ نجف اشرف، جس کی عبارت گزر چکی ہے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں، تو چرچا نہیں ہوتا

اب رہا یہ سوال کہ اہل السنت کی کتاب میں شیعہ صاحب کی روایت کو کیسے لکھ دیا گیا، تو اس کے جواب میں ہمارا صرف یہ کہہ دینا کافی ہو سکتا ہے کہ ہمیں پتہ نہیں چلنے دیا۔ میاں! جب پہلے زمانہ میں چھاپے خانے نہ تھے، نہ کاپی رائٹ محفوظ کی جاتی تھی، قلمی کتابیں تھیں، ہر شخص نقل کر سکتا تھا۔ علی الخصوص وہ لوگ جن کا دین و مذہب ہی تقیہ و کتمان ہو، نہایت آسانی کے ساتھ تشریف لا سکتے تھے اور علمائے اسلام کے نہایت محب بن کر ان کی کتابوں میں حسب ضرورت کارستانیاں کر سکتے تھے (یا راوی حدیث بن کر ایسی روایات کو تقیہ کی آڑ میں اہل السنت میں شائع کر دیتے تھے اہل السنت ظاہر کو دیکھ کر سُنّی سمجھتے اور ظاہری تقویٰ اور زہد و ورع کے تحت حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے روایت کو درست مان لیتے)

اس پر بھی ثبوت کی ضرورت ہو تو قاضی نور اللہ شوستری کی مشہور ترین کتاب

مجالس المومنین کا ص۲ مطالعہ فرمالیں کہ ہم لوگ شروع میں سنّی اور حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی بن کر اہل السنت کے استاذ اور ان کے شاگرد بنے رہے، ان سے روایات لیتے تھے اور انہیں احادیث سناتے تھے اور تقیہ کی آڑ میں اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ یہ کتاب ایران کی چھپی ہے اور فارسی زبان میں ہے ہر شخص مطالعہ کر سکتا ہے تو یہ کیا مشکل تھا کہ اسی آڑ میں کسی غریب سنّی کی کتاب میں یہ کارفرمائی بھی کر لی ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالے سے یہ کہنا کہ انہوں نے بخاری شریف کی تمام روایات کو برحق تسلیم کیا اور یہ صحیح سمجھا ہے، سراسر غلط اور صریحًا جھوٹ ہے۔ حضرت شاہ صاحب فقط مرفوع حدیث کے متعلق صحت کا دعویٰ کرتے ہیں اور باغِ فدک کو تقسیم نہ کرنے کی روایت کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے۔ مرفوع حدیث صرف وہی ہوتی ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہو یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہو یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ اقدس میں کوئی عمل ملاحظہ فرمانے کے بعد اس کو جائز اور برقرار رکھا ہو دیکھئے فنِ حدیث شریف کے متعلق علماء حدیث کی تصریحات، جبکہ فدک کی روایات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے واقعات پر مشتمل ہیں۔

اگر ہم اہل تشیع کے اس راوی کو سچا مان لیں اور غیر مذہب ہونے کے باوجود اس کی روایت کو اپنی کتاب میں لکھ بھی لیں اور یہ بھی تسلیم کر لیں کہ خود ہم نے اس کی روایت کو اپنی کتاب میں لکھا ہے تو پھر بھی ہمارے اصول کے مطابق بلکہ اہلِ تشیع کے اصول کے مطابق بھی یہ روایت قابل حجت نہیں، کیونکہ اس کا صرف ایک راوی ہے اور یہ اخبار آحاد سے ہے اور اخبار احاد (عقائد و نظریات میں) حجت نہیں ہوتیں۔ اہل السنت کے اصول کو نظر انداز کر کے خود اہلِ تشیع کے امام الطائفہ ابو جعفر طوسی کی کتاب تلخیص الشافی ص۴۲۸ کا مطالعہ کر لیں جہاں صاف لکھا ہے کہ اخبار آحاد ناقابلِ حجت ہوتی ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا اور غریب اہل السنت و الجماعت ائمہ کرام کی روایات کو تو سر آنکھوں پر تسلیم کرتے ہیں اور اگر

کسی غیر مذہب کے راوی کی منفرد روایت بھی اسی طرح تسلیم کریں کہ جس کے تسلیم کرنے سے تمام ائمہ طاہرین کی تکذیب لازم آتی ہو اور شانِ رسالت کے متعلق بھی بُرا عقیدہ لازم آتا ہو تو بھائی ہمیں اس کجروی سے معاف رکھیں۔ ہم سے یہ توقع رکھ کر ہم پر الزام قائم نہ کریں ہمارا اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ ہم تو اس قصے کو الف لیلیٰ سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

فدک کے متعلق مزید تحقیق دیکھنا چاہیں، تو کتاب "آیات بینات" مؤلفہ جناب سید محمد مہدی علی خان صاحب تحصیلدار مرزا پور جلد دوم مطالعہ فرمائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تحصیلدار صاحب موصوف کے دلائل اور انداز بہت محققانہ اور فاضلانہ ہے۔ جن دلائل اور جس بحث کو صاحبِ موصوف نے قلمبند فرمایا ہے، یہ انہیں کا حصّہ ہے۔ تحصیلدار صاحب کی وسعتِ نظر اور ان کی مبصرانہ بحث قابلِ تحسین ہے۔

تو میں گزارش کر رہا تھا کہ ائمہ معصومین کی تصریحات کے بالمقابل اس قسم کی روایات گھڑنا اور ان کے صریح ارشادات کے معانی و مطالب میں غلط تصرفات اور نامعقول تبدیلیاں کرنا اور بعید از قیاس مفہومات بیان کر کے اللہ تعالیٰ کے مقدس گروہ کی شان میں سب و شتم کے لیے منہ کھولنا حد درجہ جسارت اور گستاخی ہے، بلکہ حد درجہ بے ایمانی ہے اہل السنّت کے مذہب کے خلاف اعتراض کرنے اور ان پر کوئی الزام بھی لگانے سے پہلے یہ ضرور مدنظر رکھا جائے کہ ان کے مذہبی اصول کیا ہیں۔ اہل السنّت کے سامنے کوئی بھی روایت پیش کی جائے، تو سب سے پہلے ان کی نگاہیں سند کو تلاش کرتی ہیں۔ سند کے تمام اشخاص ان کی کتب اسماء رجال کی تصریح کے مطابق اگر اہل السنّت، سچے، اور راست باز، صحیح حافظہ والے ثابت ہو جائیں، تو پھر بے دھڑک ان پر ایسی روایات کو بطورِ الزام پیش کیا جا سکتا ہے اور اگر سند میں ایک راوی بھی بدمذہب جھوٹا سیئ الحفظ دھوکہ دینے والا ثابت ہو جائے، تو اس روایت کو الزام دینے والے کے گلے میں لٹکا دیتے ہیں، کیونکہ ان کا مذہب اس قسم کی روایات پر مبنی نہیں ہے۔ فرض بھی کر لیں کہ اس قسم کی روایات اہل السنّت کی کتابوں میں کسی تقیہ باز کی کرم فرمائی سے درج ہوں، مگر ان کی نگاہِ امتیاز سے ہر وقت بچنا چاہیئے: اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله

یعنی مومن کی فراست سے بچو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے، بلکہ اہل السنّت کے ہاں روایت کی جانچ اور پڑتال کے لیے علاوہ علم الاسناد کے قرآن مجید اور حدیث متواتر بھی معیار اور کسوٹی ہیں کہ جو قرآن کریم کے احادیثِ متواترہ کے برخلاف ہوگی، اس کو ناقابلِ قبول و تسلیم اور ناقابلِ عمل قرار دیتے ہیں، خواہ ایسی روایت کی سند کے متعلق کسی قسم کا تبصرہ نہ بھی کیا گیا ہو، غرضیکہ صداقت اور سچائی اور راست بازی کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور اسی کو ہر روایت اور درایت کا مبنیٰ اور موقوف علیہ قرار دیتے ہیں اور اسی پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے

کاش اہلِ تشیع بھی کم از کم ایسے لوگوں کی روایت پر عمل نہ کرتے، جن کو ائمہ صادقین نے ان کی اپنی کتابوں میں کذّاب (بڑا جھوٹا) اور وضاع (روایات گھڑنے کا بہت عادی) اور لعنتی وغیرہ کے القاب کے ساتھ سرفراز فرمایا ہے، تو مجھے یقین ہے کہ شیعہ و سنی نزاع دیکھنے میں نہ آتا۔ مثلاً اہلِ تشیع کے مخصوص روایات کے راویوں کا حال رجال الکشی وغیرہ میں دیکھئے اور میری اس گزارش کی تصدیق کیجئے اور جن راویوں کے متعلق ائمہ معصومین نے مذکورہ بالا کلمات نہیں فرمائے، تو ان کی روایات کلیۃً نہیں، تو بالاکثریت اہل السنّت کی روایات سے ملتی جلتی ہیں، جن کو بغرضِ خیر خواہی اہلِ تشیع کی خدمت میں (فضائلِ صحابہ اور خلافت وغیرہ کے معاملات میں) پیش کیا گیا ہے اور باقی علماء حضرات بھی پیش کرتے رہتے ہیں

رسالہ تنزیہہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

زہری کو شیعہ ثابت کر کے روایاتِ بخاری سے گلو خلاصی ممکن نہیں ہے۔ اس کے متعلق ہم چند گزارشات پیش کرتے ہیں:

اوّل: تمام علماء اہل السنّت کا اس پر اجماع ہے کہ جو کچھ بخاری و مسلم میں درج ہے، وہ سب صحیح ہے۔

دوم: زہری کے تسنن اور اس کی جلالتِ قدر پر تمام علماء رجال اہل السنّت کا اتفاق ہے۔

سوم: اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے جیسے کہ بعض علماء شیعہ نے لکھا ہے (

زہری نے آخری عمر میں شیعہ مذہب قبول کرلیا تھا تو پیر صاحب اس پر روشنی ڈال سکیں گے کہ اس کی یہ روایاتِ شیعہ ہونے کے بعد کی ہیں نہ پہلے کی۔

چہارم: اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ وہ ابتداء سے شیعہ تھا، تو پیر صاحب کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں جو تشیع پایا جاتا تھا، وہ مع الرفض تھا۔ یعنی وہ تبرائی شیعہ تھا یا محض محبتِ اہل بیت اور ان کی افضلیت کا قائل جو قبول روایت کے منافی نہیں ہے۔

پنجم: ذہبی کے بیان کے مطابق زہری دو ہزار دو سو حدیث کا راوی ہے، پھر ان سب سے ہاتھ دھونے پڑیں گے جو اہل السنّت کے لیے مہنگا سودا ہے۔ کیا پیر صاحب اور ان کے چیلے چانٹے اس خسارے کا سودا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں ہے کہ چودہ سو سال کے علماء اہل السنّت پر یہ عقدہ وا نہ ہوا اور غلط روایات سے اپنی کتب کی تطہیر کی۔ اگر انکشافِ حقیقت ہوا، تو چودھویں صدی میں حضرت پیر سیالوی یا مولوی احمد شاہ چوکیروی پر گویا پہلے سب علماء اہل السنّت مُورکھ، جاہل اور غیر محقق تھے۔ اگر محقق پیدا ہوئے تو یہی بزرگوار یا للعجب ولضیعۃ الادب۔

معاملہ ابن شہاب زہری کا

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے ابن شہاب زہری کی اس قسم کی روایات پر جہاں حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ناراضگی، ان سے کلام وخطاب کے ترک اور نمازِ جنازہ کی اطلاع نہ دینے کو بڑے اہتمام سے بیان کیا گیا ہے۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا تھا کہ جب علماء شیعہ نے اپنی کتبِ رجال میں زہری کو شیعہ تسلیم کیا ہے اور ان کی صحیح ترین کتابِ حدیث کافی کلینی میں اس سے مروی روایات بکثرت منقول ہیں اور حسبِ تصریح قاضی نور اللہ

شوستری شیعہ محدثین اور علماء کی عادت بھی یہی رہی ہے کہ وہ سُنّی بن کر احادیث کو روایت کرتے تھے، کبھی اہل سنّت سے روایات حاصل کرتے اور کبھی ان کو بیان کرتے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ نہ کچھ اضافہ بھی کر دیتے تھے اور تغییر و تبدیل کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور انہوں نے اپنے مذہب و مسلک کی ترویج و اشاعت کے لیے گہری خفیہ سازش اور چال سے کام لیا، جس کو انہوں نے تقیہ کا نام دے رکھا تھا اور عظیم ثواب کا کام قرار دے رکھا تھا۔

خود قاضی نور اللہ شوستری کا حال یہی تھا کہ اپنے آپ کو سُنّی ظاہر کرکے پورے ہندوستان کا اکبر بادشاہ اور جہانگیر کے دور میں قاضی القضاۃ اور چیف جسٹس بنا رہا اور شیعہ مذہب و مسلک کے پرچار اور اس کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل رہا، اور اسی دوران اس نے کتاب مجالس المومنین کو مرتب کیا، جس کا بعض ذرائع سے انکشاف ہو جانے پر اس کا خبثِ باطن ظاہر ہو گیا اور اس کو کیفر دار تک پہنچا دیا گیا۔ لیکن بعض لوگ ہمیشہ تقیہ کے پردے میں رہے اور اپنے مافی الضمیر کی کسی کو خبر نہ ہونے دی اور بعض نے موت کے قریب انکشاف کیا کہ مجھے شیعہ مذہب برحق معلوم ہوتا ہے۔ میری تجہیز و تکفین اس کے مطابق ہو، تاکہ عوام کو اپنے مذہب سے متزلزل کریں اور ان کو یہ تاثر دیں کہ زندگی بھر سُنّی رہنے والا محدث اور مفسر جب اس مرحلہ پر یہ مذہب قبول کر رہا ہے، تو پھر یہی سچا ہوگا۔ وغیر ذالک من الحیل ووجوہ الخداع والمکر۔

تو جب علماء شیعہ کی عادتِ معروفہ بھی معلوم ہو گئی اور خود شیعی علماء اس کو ہم مذہب اور ہم مسلک بھی تسلیم کریں اور صرف یہی شخص ہو جو فدک کے عنوان کی اکثر روایات میں حضرت زہرا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے غضب اور ناراضگی کو ان کے ہجران اور ترک کلام کو بڑے اہتمام سے بیان کرے اور تا دم مرگ اس کو طوالت دیتا دکھائی دے جو ان ہستیوں کے شان کے سراسر خلاف ہو، جن کو اللہ تعالیٰ نے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی شان سے نوازا ہے کہ وہ آپس میں رحیم و کریم ہیں اور فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے طلب گار ہیں اور دنیا کے

مال و محبت سے ان کے دل منزّہ و مُبرّا ہیں: اُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ وغیر ذالك من الآیات تو ایسے شخص کے بارے میں گھر کے بھیدی کی شہادت تسلیم کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے؟ اور تقیہ کے ایجاد کرتے کے بنیادی تقاضے سبائی جماعت کے سامنے یہی تھے کہ مسلمان اور سنّی بن کر اسلام کے خلاف سازش کرو اور اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دو اور اسلام کو یہودیت و مجوسیت کے سانچے میں اس طرح ڈھال دو کہ نام تو اسلام کا رہے اور حقیقت یہودیت و مجوسیت والی ہو۔ لہٰذا ایسے شخص کے متعلق یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ عین ممکن ہے کہ یہ شخص بھی اسی خاندان کا فرد ہو جو اسلام اور محسنانِ اسلام کے خلاف تقیہ کے دبیز پردوں میں چھپ کر اس مشن کی تکمیل میں مصروف ہو۔

اور اہل السنّت کے علماء اعلام اور محدّثین کرام ہزار احتیاط کریں، پھر بھی کسی کے دل کی کیفیت اور حالت کا صحیح اور حتمی و قطعی علم تو اللہ علیم بذات الصدور کو ہی ہو سکتا ہے ان علماء کو غلطی لگ جانا اور واقع و نفس الامر کے خلاف کا ظن اور گمان غالب ان میں پایا جانا بعید نہیں ہے، جبکہ خطاء و نسیان سے انسان بالعموم منزّہ و مبرّا بھی نہیں ہیں، لہٰذا ان حضرات کی مقدور بھر سعی اور جدوجہد کے باوجود بعض راویوں اور ناقلین حدیث کے متعلق ان کو مغالطہ لگ جانا عین ممکن ہے، جبکہ وہ تقیہ باز یہودی اور مجوسی بھی بڑے عیار اور ہوشیار قسم کے ہوں، تو ان کی پوری طرح پرکھ اور تمییز ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور ہو جائے گی، لہٰذا ایسے مقامات میں خود شیعہ حضرات کا انکشافِ حقیقت نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے زہری کے متعلق اپنے تاثرات کی بنیاد رکھی ہے۔

سوالات ڈھکو صاحب کے اور جوابات ہمارے

یہ گزارش سماعت فرمانے کے بعد اب علامہ ڈھکو صاحب کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمائیں اور دادِ عدل و انصاف دیں۔

سوال اوّل: اس پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ جو کچھ بخاری و مسلم میں ہے وہ سب صحیح ہے، لہٰذا زہری والی روایات بھی صحیح ہیں۔

جواب: یہ سراسر غلط دعویٰ ہے حقیقتِ حال صرف یہ ہے کہ علماء اہل السنّت کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد تمام کتبِ مدوّنہ سے جو کسی بھی بلند سے بلند مرتبت انسان نے تالیف کی ہیں، ان سے یہ دونوں زیادہ صحیح ہیں، جیسے کہ علامہ نووی نے شرح مسلم میں فرمایا: اتفق العلماء علیٰ ان اصح الکتب بعد القرآن العزیز الصحیحان البخاری ومسلم تلقتهما الامة بالقبول الخ صـ۱۳

نیز اس صحت کا حکم بھی حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع اور متصل و مسند احادیث کے متعلق ہے جیسے کہ شاہ ولی اللہ محدّثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

فاراد البخاری ان یجمع الفنون الاربعة (السنة والتفسیر والسیرة والزهد) فی کتاب ویجرده لما حکم له العلماء بالصحة قبل البخاری وفی زمانه ویجرده للحدیث المرفوع المسند وما فیه من الآثار وغیرهما انما جاء به تبعا لا بالاصالة ولهذا اسمی کتابه بالجامع الصحیح المسند۔

(رسالہ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری صـ۱۳)

خلاصہ مفہوم یہ کہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فن سنّت، فن تفسیر، فن سیرت اور فن زہد و رقاق کو ایک کتاب میں جمع کرنے کا ارادہ کیا اور امام بخاری علیہ الرحمہ سے پہلے کے محدّثین یا معاصرین نے جن احادیث کے صحیح ہونے کا فیصلہ دیا تھا، صرف ان کو جمع کریں اور اپنی کتاب کو مرفوع و مسند احادیث کے لئے مختص کریں اور اس میں جن آثار وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے، تو وہ بالتبع لائے گئے نہ کہ مقصودِ اصلی کے طور پر اور اسی لیے بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب کو "الجامع الصحیح المسند" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ گویا صرف حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح سے نہیں، بلکہ امام بخاریؒ کے تجویز فرمودہ نام سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ صرف احادیث مرفوعہ مسندہ و متصلہ کی صحت کا التزام

کیے ہوئے تھے اور انہوں نے ان کے انتخاب میں اپنی امکانی کوشش صرف کر کے صحاح کا انتخاب کیا ہے۔

لیکن جیسے عرض کیا جا چکا ہے کہ نفس الامر اور واقع کا حتمی علم یا کسی کے باطن کا قطعی علم حاصل کرنا محدث کی رسائی اور پہنچ سے ماوراء ہے، اسی لیے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: دریں کتب ستہ اقسامِ حدیث از صحاح وحسان وضعاف ہمہ موجود است وتسمیۂ آں بصحاح بطریقِ تغلیب است۔ (مقدمہ اشعۃ اللمعات ص۹)

یعنی صحاح ستہ میں احادیث کے تمام اقسام صحیح، حسن اور ضعیف موجود ہیں اور ان کو صحاح کہنا اکثر و اغلب احادیث کے صحیح ہونے کی وجہ سے ہے —— لہٰذا علامہ موصوف کا یہ دعویٰ سراسر غلط ہے۔ علاوہ ازیں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے یہ فرق بھی واضح کر دیا تھا کہ بخاری، مسلم میں مذکور احادیث مرفوعہ کا حکم علیحدہ ہے اور بعد کے واقعات کی روایت وحکایت کا معاملہ علیحدہ ہے اور یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی ناراضگی اور بائیکاٹ وغیرہ کی روایات ارشاداتِ نبویہ نہیں ہیں، بلکہ بعد کے واقعات سے متعلق ہیں، بلکہ حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی بھی ثابت نہیں، صرف راویوں کا ظن و گمان ہے۔

نیز یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ اخبار آحاد صحیح ہونے کے باوجود مفید علم ویقین اور مثبت عقائدِ قطعیہ نہیں ہو سکتیں، بلکہ بعض اکابر علماء شیعہ کے نزدیک موجب عمل بھی نہیں۔ کما فی تلخیص الشافی تو اندریں صورت صحیح ہونے کے باوجود بھی زہری والی روایات اخبار آحاد ہیں اور قطعی اور حتمی نظریہ قائم کرنے کا موجب نہیں بن سکتیں جبکہ خود زہری صاحب ہی قابلِ وثوق و اعتماد نہ رہے، تو پھر قطعی نظریہ کا اثبات ان سے کیونکر ممکن ہوگا اور جو کچھ بھی ہو کوئی راوی اس مرتبہ اور مقام کا مالک نہیں جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا ہے، لہٰذا اس کی ایسی روایت جو ان کی عظمتِ شان میں تنقیص کی موجب ہو، اس میں راوی کو جھوٹا یا غلط فہمی کا شکار تسلیم کر لینا سہل ہے، مگر جن کی عظمتیں اور رفعتیں آیاتِ کلام مجید اور احادیثِ متواترہ

سے ثابت ہوں، ان کو موردِ الزام ٹھہرانا اور ہدفِ طعن و تشنیع قرار دینا مشکل ہے جیسے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک صحت کا معیار قرآن مجید بھی ہے، اور خود شیعی علماء نے اہل بیت کرام سے کتبِ صحاح میں نقل کیا ہے کہ روایت کی صحت کا معیار کتاب اللہ اور سنتِ مطہرہ کی موافقت ہے اور حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے نہج البلاغہ میں منقول ہے: لیس من العدل القضاء علی الثقۃ بالظن (نہج مع ابن میثم جلد خامس ص۳۵۴) کہ یہ عدل نہیں ہے کہ ثقہ اور قابلِ اعتماد شخص پر ظن و گمان کے تحت فیصلہ دے دیا جائے، لہٰذا ایسی آحاد اخبار سے عقائد اور نظریات کا اثبات اور بخاری علیہ الرحمہ کی غیر مرفوعہ اور غیر متصل روایات کے سہارے اور ایسے راوی کی روایت کے ذریعے جس کو شیعہ نے اپنا آدمی تسلیم کیا ہو، ایسی مقدس اور بلند مرتبت الزامات و اتہامات عائد کرنا قطعاً روا نہیں ہو سکتا۔

سوال دوم: علامہ ڈھکو صاحب نے فرمایا: زہری کے تسنن اور جلالتِ قدر پر اہل السنت کے علماء رجال کا اتفاق ہے۔

جواب: حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے جب یہ تصریح فرما دی تھی کہ ہم تو اب بھی زہری کو اسی طرح سنی سمجھتے۔ اگر گھر کے بھیدی اس کے متعلق یہ انکشاف نہ کرتے کہ وہ شیعہ تھے، لہٰذا اس تصریح کے ہوتے ہوئے علماء اہل سنت اور اصحاب رجال کا حوالہ دینا صرف غیر ضروری ہی نہیں، بلکہ بے محل اور بے جواز بھی ہے، کیونکہ آپ نے شیعی مسلمات کو ملحوظ رکھ کر یہ جواب دیا تھا۔

سوال سوم: ڈھکو صاحب فرماتے ہیں یہ تسلیم کر بھی لیں کہ زہری آخری عمر میں شیعہ ہو گیا تھا جیسے کہ بعض علماء شیعہ نے تصریح کی ہے، مگر یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ اس کی یہ روایات شیعہ ہونے کے بعد کی ہیں، ہو سکتا ہے پہلے کی ہوں؟

جواب: لیکن علامہ موصوف نے یہاں ڈنڈی ماری ہے اور دھوکہ دہی سے کام لیا ہے، کیونکہ جب زہری کا شیعہ ہونا ثابت ہو گیا اور ایسی روایات بھی تسلیم ہو گئیں جو عظمتِ صحابہ کرام اور ان کے اہل بیت عظام کے ساتھ اخلاص اور نیاز مندی کے

خلاف تھیں، تو لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ موصوف پہلے سے ہی اسی مذہب و مسلک پر کاربند تھے اور خاص مقصد کے تحت اپنے عقائد کو چھپاتے ہوتے ہیں۔ جب مقصد پورا ہو گیا، تو پھر رازِ دروں کو آشکار کر دیا اور تقیہ کے مقاصد پورے ہو گئے، تو اصلی عقیدہ کا اظہار کر دیا، جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ شیعی علماء و محدثین کرام کا طریق کار ہی یہی رہا ہے اور انہوں نے انہی مقاصدِ فاسدہ اور مطالبِ ردیہ کی تکمیل کے لیے ہی تقیہ کو ایجاد کیا تھا، لہٰذا اس اظہار اور اعلان سے پہلے کی روایات ہوں یا اس کے بعد کی ہوں، جو بھی مذہبِ تشیع کی مؤید ہوں گی، وہ سبھی مخدوش اور ناقابلِ اعتبار ہوں گی، کیونکہ پہلے دور کی نیک نیتی اور صدق و سچائی کی ضمانت کیا ہو گی، بلکہ جب زہری صاحب کی سابقہ روایات ہی مذہبِ تشیع اور رفض کا دارو مدار ہیں تو پھر ان کو درست تسلیم کرنے یا شیعہ مذہب کو درست تسلیم کرنے میں کیا فرق ہو گا؟

سوال چہارم: اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ابتداء سے ہی شیعہ تھا تو اس کی روایات کے ناقابلِ قبول ہونے کے لیے اس کا تبرائی اور رافضی ہونا ثابت کرنا پڑے گا، کیونکہ محض محبِ اہل بیت ہونے کی وجہ سے شیعہ کہلانا قبولِ روایت کے منافی نہیں ہے؟

جواب: علامہ موصوف نے یہاں بھی کمال سادگی یا انتہائی ہوشیاری اور عیاری کا مظاہرہ کیا ہے کہ تشیع دو قسم پر ہے اور زہری کون سے قسم میں داخل تھا جو شخص ہر مقام پر مقدس ہستیوں کے درمیان بغض و عناد اور نفرت و کدورت اور ہجران و بائیکاٹ ثابت کرنے کے درپے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سسر اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بہنوئی کے لیے حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر کی طرف سے نمازِ جنازہ کی اطلاع اور جنازہ پڑھنے کی اجازت دینے کے روادار بھی نہ رہنے دے اور اہلِ تشیع اور رافضیوں کو ان پر سب و شتم اور طعن و تشنیع کا اہم موقع مہیا کرے، اس کے رافضی ہونے میں

کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے؟ جبکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ روافض و خوارج و دیگر فرق مبتدعہ کی نقل کردہ روایات جو ان کے مذہب اور عقیدۂ بدعت کی موجب اور مثبت ہوں یا اس کی تائید اور تقویت کا باعث ہوں، وہ بالکل قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح بخاری کے مقدمہ میں ص۳۸۲ پر اس کی تصریح فرمائی ہے اور اس ضمن میں جو قول اور مذہب زیادہ موزوں اور مناسب قرار دیا ہے، وہ یہ ہے: والثالث التفصیل بین ان یکون داعیة لبدعته اوغیر داعیة فیقبل غیر الداعیة ویرد حدیث الداعیة و هٰذا المذهب هو الاعدل وصارت الیه طوائف من الائمة (الی) ان اشتملت روایة غیر الداعیة علی ما یشید بدعته ویزینه ویحسنه ظاهرا فلا یقبل وان لم یشتمل فتقبل الخ۔ یعنی تیسرا قول یہ ہے کہ ردّ و قبول میں تفصیل ہے درمیان اس کے اس مبتدع راوی کی روایت اس کی بدعت کے لئے سبب داعی ہے یا نہیں؟ دوسری صورت میں مقبول ہے اور پہلی صورت میں مردود اور ناقابلِ قبول ہے اور یہی مذہب اعتدال اور میانہ روی کے زیادہ قریب ہے اور اسی کی طرف ائمہ کرام کی جماعتوں نے رجوع کیا ہے اور اس پر مزید تفصیل یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر ایسے بدعتی راوی کی روایت اس کے عقیدہ کی باعث و موجب نہ بھی ہو، لیکن اس کی تائید و تقویت اور اس کی تزئین و آرائش کی موجب ہو تو پھر بھی مقبول نہیں اور اگر ایسے معانی اور مفاہیم پر مشتمل نہیں تو پھر مقبول ہے۔

اس پس منظر میں زہری کی انفرادی روایات کے مردود اور ناقابلِ قبول ہونے میں توقف کس طرح کیا جا سکتا ہے، جبکہ اہلِ تشیع اس کو شیعہ تسلیم کر چکے اور اس کی روایات تبرائی شیعوں کے نظریہ و عقیدہ کی بنیاد اور سببِ موجب ہیں۔ نیز سیوطی، حافظ علی بن عراق اور علامہ علی بن سلطان قاری رحمہم اللہ تعالیٰ نے کسی بھی روایت کے موضوع ہونے کے لیے یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ راوی رافضی ہو اور اس میں اہل بیت کے فضائل بیان

کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو یا اس میں اہل بیت کرام کے مفروض اور مزعوم مخالفین کی مذمت کی گئی ہو، اور اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو۔ (مرقاۃ ص۳۸۷ ج ۱۱)

الغرض علمائے شیعہ کے اس اعتراف و تسلیم کے بعد ایسے شخص کی روایات کو اہل السنت کے خلاف پیش کرنا سراسر زیادتی اور دھاندلی ہے۔

سوال پنجم: زہری دو ہزار روایات سے زیادہ کا راوی ہے، اس کو شیعہ ماننے پر ان سب روایات سے ہاتھ دھونے پڑیں گے الخ

جواب: ڈھکو صاحب بے چارے خواہ مخواہ اعداد و شمار کے چکر میں پڑ گئے اور خسارہ اور نفع دکھانے لگ گئے اور علامہ ذہبی کے قول پر غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس مصنوعی مجتہد العصر کو کون سمجھائے کہ کسی شخص کے ہزاروں روایات کے راوی ہونے کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ان روایات میں منفرد ہے اور دوسرے راویوں نے ان روایات کو ذکر ہی نہیں کیا۔ اگر بالفرض علامہ ڈھکو صاحب کو چند سورتیں یاد ہوں اور وہ انہیں پڑھتے ہوں تو اس کا کیا یہ مطلب ہوگا کہ صرف انہیں ہی یاد ہیں، دوسروں کو یاد نہیں؟ دیکھئے مسلم اور بخاری کی روایات ہزاروں کی تعداد میں ہیں، مگر بعض روایات میں اتفاق و اشتراک بھی ہے اور دوسرے محدثین نے بھی وہ روایات نقل کی ہیں۔

اسی طرح زہری سے منقول روایات، دوسرے محدثین سے بھی منقول ہیں لہٰذا ایسے کسی خسارے کا ہمیں کوئی اندیشہ اور فکر لاحق نہیں۔ البتہ زہری کا انداز بیان اور اسلوب ایسا ہوتا ہے، جس میں شیخین رضی اللہ عنہما پر کسی نہ کسی طرح کا الزام بن جاتا ہے جبکہ وہی روایات دوسرے حضرات نقل کریں، تو اس میں ایسے الفاظ نہیں ہوتے جو اس قسم کا غلط تاثر پیدا کریں۔

طبقات ابن سعد میں میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ترکہ متعلق تیرہ روایات اور احادیث منقول و مروی ہیں، جن میں سے صرف زہری کی روایت میں یہ کلمات مرقوم ہیں:

فوجدت فاطمة عليها السلام على ابي بكر فهجرته فلم تكلمه حتى توفيت وعاشت بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم ستة اشهر۔ ص۱۳۱، ج ۲)

یعنی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سن کر آپ ان پر ناراض ہو گئیں اور ان سے تعلق ختم کر لیا اور وصال تک ان کے ساتھ کلام نہ کیا۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد چھ ماہ تک بقید حیات رہیں۔

حالانکہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو خلافت کا بار گراں سنبھالنے کے بعد جو مشکلات درپیش تھیں، جن میں فتنۂ ارتداد، مانعین زکوٰۃ کا پیدا ہو جانا اور جھوٹے نبیوں کا لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسانا وغیرہ، حتیٰ کہ آپ عرصہ تک مدینہ منورہ سے باہر ڈیرہ ڈالے رہے اور مختلف مہمات میں صحابہ کرام کو روانہ فرما کر انہیں سر کرتے رہے۔ تاوقتیکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ شام کی مہم سے فتحیاب ہو کر واپس نہ آ گئے۔ آپ مدینہ منورہ کے دفاع کی اہم ترین ذمہ داری کو بنفس نفیس ادا کرتے رہے۔ جب وہ واپس آ گئے۔ تو آپ نے ان کو استراحت حاصل کرنے کے لیے مدینہ منورہ میں چھوڑا اور خود مرتدین کے خلاف کارروائی کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے اور وہیں رہے اور جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام دوبارہ راحت حاصل کرتے اور سواریوں کو راحت پہنچانے کے بعد اس ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔ کما صرح بہ الطبری جلد نمبر ۳ ص۲۲۳ و ص۲۲۴ و ص۲۲۵) تب آپ مدینہ شہر میں تشریف لاتے تو تو ان حالات میں ہجران اور ترک کلام کو باہتمام تام بیان کرنا کسی نیک نیتی کا غماز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں ہجران اور ترک کلام وغیرہ مردوں کے درمیان ہو تو پھر بھی قابل فہم امر ہے۔ ایک ایسی مقدس پردہ دار خاتون کہ ملائکہ بھی ان سے حیا اور پردہ کریں، تو ان کے ساتھ ہجران اور مکمل بائیکاٹ کا کیا مطلب؟ ان کے ساتھ پہلے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کب آمد و رفت رکھتے تھے اور آپ کی مجلس مذاکرہ ہوا کرتی تھی کہ اب ہجران اور ترک سلام و کلام کی نوبت آ گئی اور اس کو خصوصی طور پر بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

لہٰذا زہری صاحب کی روایات کے ناقابلِ قبول ہونے سے قطعاً کوئی خسارہ نہیں، البتہ ڈھکو صاحب کو ضرور خسارہ لاحق ہوگا، مگر اس کی ذمہ داری بھی انہیں کے اکابر کے سر عائد ہوگی، جنہوں نے تقیہ کا پردہ پھاڑ دیا اور حقیقتِ حال اور رازِ دروں کو ظاہر کر دیا اور زہری کو ناقابلِ اعتبار بنا دیا اور اپنے آپ کو بھی ذلیل کیا اور من کتمہ اعزہ اللہ ومن اذاعہ اذلہ اللہ کے سراسر خلاف کیا۔

مضحکہ خیز بات : ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ سوائے پیر صاحب سیالوی اور مولوی احمد شاہ صاحب چوکیروی کے دوسرے علماء کو معلوم نہ ہو سکا کہ زہری کیا ہے؟ تو گویا وہ سبھی مورکھ، جاہل اور غیر محقق تھے وغیرہ وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے علامہ صاحب کی یہ بات واقعی مضحکہ خیز ہے۔ اگر ان اکابرین نے شیعہ حضرات کی تصریحات نہ دیکھیں اور ان کے اس اقرار و اعتراف کو ملاحظہ نہ فرمایا اور زہری کے متعلق حسنِ ظن کا اظہار کیا، تو ان سے ان کا مورکھ اور جاہل ہونا کیونکر لازم آگیا، جبکہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے بھی تصریح فرمائی ہے کہ ہم اب بھی اس کو سُنی سمجھتے اگر گھر کے بھیدیوں کا زہری کے متعلق یہ انکشاف نہ موجود ہوتا۔ آپ کے اس جواب کا محمل وہی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلے اور فتوے کا ہے، جو حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلے کے برعکس دیا گیا تھا، مگر اس لیے نہیں کہ آپ حضرت داؤد علیہ السلام کو العیاذ باللہ فتویٰ اور فیصلہ کے اہل نہیں سمجھتے تھے، بلکہ جو بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ کی تھی، حضرت سُلیمان علیہ السلام کی تحقیق و تفتیش سے وہ بنیاد بدل گئی، لہٰذا فتویٰ اور فیصلہ بھی بدل گیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک عورت کے بچے کو بھیڑیئے نے اُٹھا لیا اور دوسری عورت حالتِ زچگی میں بیہوش ہو گئی تھی، تو اس نے اس کا بچہ اٹھا لیا اور اسے بتلایا کہ تیرا بچہ بھیڑیا لے گیا ہے، مگر اُس نے اُس کی بات نہ مانی اور جھگڑا حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے گواہ موجود نہ ہونے اور بڑی کے بچے پر قابض ہونے اور اس کے حلف اُٹھانے کی وجہ سے فیصلہ بڑی کے حق میں کر دیا۔ پھر

وہ جھگڑا حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا، تو آپ نے فرمایا، ایک چھری لاؤ میں اس کو چیر دیتا ہوں تاکہ تم دونوں اس کا ایک ایک حصہ لے لو۔ چھوٹی نے تڑپ کر کہا نہیں حضور بچہ بڑی کو دے دو، میں اس دعوے سے دستبردار ہوتی ہوں۔ جب آپ نے بڑی سے دریافت کیا کہ چھوٹی تو چیرنے کی خبر سُن کر تڑپ اٹھی، مگر تو ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اگر تیرا لختِ جگر ہوتا تو تُو کیوں مضطرب نہ ہوتی؟ تو وہ لاجواب ہو گئی اور اس کو چھوٹی کا دعویٰ تسلیم کرنا پڑ گیا اور آپ نے بچہ اس سے لے کر چھوٹی کو دے دیا۔ یہاں پر حکم جُدا جدا ہیں، مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے دل میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق اس قسم کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا جس قسم کی ڈھکو صاحب نے علمائے اہل السنت کے حق میں گوہر افشانی فرمائی ہے، جبکہ آپ کا یہ جواب بھی اہلِ تشیع کے اس اعتراف و تسلیم پر مبنی ہے اور باندازِ قیاس جدلی ہے۔

نیز جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کے چار ہونے کی روایات کافی کلینی اور نہج البلاغہ اور حیات القلوب وغیرہ سے پیش کی جاتی ہیں۔ حضرت ام کلثوم بنت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقد و تزویج کی روایاتِ کافی، تہذیب وغیرہ سے پیش کی جاتی ہیں اور مذہبِ تشیع اور رفض کی بنیاد عبداللہ بن سبا کی طرف سے رکھے جانے کے حوالے دیئے جاتے ہیں تو ڈھکو صاحب اور دیگر اخلاف چلا اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں، یہ روایات غلط ہیں۔ موضوع من گھڑت ہیں اور خلافِ عقل و درایت ہیں، لہٰذا ناقابلِ اعتبار ہیں، تو کیا ڈھکو صاحب اس وقت یہی سمجھتے ہیں کہ مذہبِ شیعہ میں صرف وہ محقق پیدا ہوئے ہیں اور مولوی اسماعیل گوجروی پہلے تمام شیعہ محدثین و مفسرین اور مؤرخین وغیرہ جاہل، مُورکھ اور تحقیق و تدقیق سے بیگانہ تھے حالانکہ کافی کی تصدیق و تائید تو حضرت امام مہدی علیہ السلام نے فرمائی اور بقولِ شیعہ اس کے متعلق کہا: ھٰذا کافٍ لشیعتنا تو ڈھکو صاحب! امام آخر الزمان کے متعلق کیا فرمائیں گے؟

فروعِ کافی کے حوالے سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر مشتمل روایت

حضرت شیخ الاسلام نے ذکر فرمائی جس سے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی زبانی آپ کا حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہما سے افضل ہونا ثابت کیا گیا تو ڈھکو صاحب نے اس کے جواب میں راویوں کو مجبرہ اور سُنّی کہہ کر اس روایت کو ٹھکرا دیا، تو علامہ صاحب بتلا سکیں گے کہ کافی کے مؤلف کلینی کو اس کی تصدیق کرنے والے حضرت امام مہدی علیہ السلام کو وہ کیا سمجھتے ہیں؟ ان میں کوئی علم و حکمت اور تحقیق و تدقیق تھی یا یہ سعادت صرف ڈھکو صاحب کے حصہ میں آئی ہے، لہٰذا علامہ موصوف کی یہ بات واقعی مضحکہ خیز ہے۔

علاوہ ازیں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا بنیادی مقصد صرف یہ تھا کہ جب تم خود ایک شخص کو اپنے علماء و محدثین کے زمرہ میں شمار کرتے ہو اور تقیہ کو بھی تم نے دین و ایمان کا نوّے فیصد قرار دے رکھا ہے، بلکہ عین ایمان، تو پھر تمہارا عذر واضح ہے کہ تم نے یہیں تقیہ کی آڑ میں بے خبر رکھا، بلکہ دھوکہ دیا اور جب خود ہی اقرار کر لیا، تو اب الزام کیسا؟ اور حجت بازی اور حیلہ سازی کیسی؟ ڈھکو صاحب کو اس کا جواب دینا چاہیئے تھا، مگر وہ اس سے عاجز و قاصر ہے۔ اپنے علماء کو جھٹلاتے ہیں، تو بھی بات نہیں بنتی اور ان کو سچا مانیں تو زہری گلے پڑتا ہے اور بنا بنایا کھیل ختم ہوتا ہے۔

الحاصل زہری صاحب کو علماء اہل السنّت اپنا سمجھتے رہے اور اس کی اس طرح کی روایات کی ایسی تاویلات و توجیہات کرتے رہے کہ صحتِ روایت کی صورت میں بھی حضرات اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مراتب عالیہ اور خداداد عظمت و رفعت میں کسی طرح کا فرق نہ آنے پائے، لیکن جب شیعی علماء رجال نے زہری صاحب کے متعلق یہ انکشاف کر دیا تو ان روایات کے متعلق ایک نیا جواب بھی سامنے آ گیا۔ اب ڈھکو صاحب صرف یہ فیصلہ دیں کہ اس کے اسلاف نے جو کہا، وہ اس میں سچے ہیں یا جھوٹے ہیں؟ سچے ہونے کی صورت میں ہمارے خلاف الزام قائم کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی اور جھوٹے ہیں تو ہم دوسرے جواب ذکر کر دیں گے، لیکن علامہ موصوف کو بتلانا پڑے گا کہ انہیں ایسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پڑی تھی اور اس سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے؟

زہری کا عقیدہ از روئے روایات اہل التشیع

آیئے اب زہری کے متعلق اکابرین شیعہ کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

۱- عدہ الشیخ فی رجالہ من اصحاب الصادق علیہ السلام۔
شیخ صدوق نے زہری کو اپنی کتاب رجال میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے اصحاب سے شمار کیا ہے۔ (تنقیح المقال از مامقانی)

۲- شیخ عبداللہ مامقانی نے بعض متاخرین کے حوالے سے نقل کیا ہے:
بل لا وجہ لما صدر من بعض المتاخرین من نفی البعد عن کونہ شیعیا وانہ اظہر المخالفۃ للتقیۃ۔ یعنی جن بعض متاخرین نے کہا ہے کہ زہری شیعہ ہوا اور اس نے مخالفت کا اظہار تقیہ کی وجہ سے کیا ہو۔
تو اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، لیکن مامقانی کے نزدیک نہ سہی، جنہوں نے اس کے تشیع کو مستبعد نہیں سمجھا۔ ان متاخرین کے نزدیک کوئی وجہ وجیہ تھی، تبھی انہوں نے یہ قول کیا کہ اس کا تشیع قیاس و درایت کی رُو سے بعید نہیں۔ بہر کیف بعض متاخرین کے قول سے اس کا تشیع ظاہر ہو گیا۔

۳- مولوی وحید شیعی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے کہا: روی الجلیل الثقۃ علی بن محمد بن علی الخزاز فی کتابہ الکفایۃ فی النصوص من الزہری روایۃ تدل علی کونہ من الشیعۃ۔
یعنی جلیل و ثقہ عالم علی بن محمد بن علی خزاز نے اپنی کتاب کفایہ میں نصوص امامت کے ضمن میں زہری سے روایت نقل کی ہے جو اس کے شیعہ ہونے کی دلیل ہے۔

۴- ملا باقر مجلسی نے مرآۃ العقول میں زہری کے متعلق کہا: ہذا الکافر کان من اصحاب ابی الخطاب وکان یعتقد ربوبیتہ کاعتقاد ابی الخطاب فانہ اثبت ذالک لہ وادعی النبوۃ من قبلہ لنفسہ علی اہل الکوفۃ۔ یہ کافر ابو الخطاب کے مصاحبین میں سے تھا اور حضرت

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی ربوبیت کا عقیدہ رکھتا تھا، جیسے کہ ابوالخطاب کا عقیدہ تھا، کیونکہ اُس نے آپ کے حق میں ربوبیت کو ثابت کیا اور اپنے لیے ان کی طرف سے اہلِ کوفہ کی طرف نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کیا۔

علامہ مامقانی نے کہا یہاں اشکال یہ ہے کہ ہم تو اس کے ناصبی ہونے کے مدعی تھے، مگر علامہ مجلسی کے قول کے مطابق وہ غالی شیعہ ثابت ہوا۔ پھر جواب دیتے ہوئے کہا، دونوں نسبتیں درست ہوسکتی ہیں۔ بان یکون ناصبیا اولا غالیا اخیرًا۔ بایں طور کہ پہلے ناصبی (سُنّی) ہو اور آخر میں غالی شیعہ ہوگیا ہو۔

۵۔ مامقانی نے مختلف روایات اور اخبار و اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا نقطۂ نظریہ بیان کیا ہے: والذی اعتقدہ من مجموع الاخبار و کلمات اصحابنا انّ الرجل متلون المزاج غیر مستقیم الرای فلا اعتماد علی خبرہ علی کل حال (تنقیح المقال جلد ثالث جزو اوّل صفحہ ۱۸۱)

یعنی مجموعی طور پر ان روایات اور علماء شیعہ کے اقوال سے جس نظریہ و عقیدہ اور خلاصہ و نتیجہ تک میں پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ محمد بن مسلم بن شہاب زہری متلوّن مزاج تھا اور اس کے نظریہ و عقیدہ میں استقامت اور ثابت قدمی نہیں تھی، لہٰذا کسی حال میں بھی اس کی روایات قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

اقول: جب بعض اکابرین علماء شیعہ زہری کے تشیع کے قائل ہیں اور بعض اس کے غالی شیعہ ہونے کے معترف ہیں اور بعض اس کے تلوّنِ مزاج اور عدمِ استقامت اور رائے کی ناپختگی کے قائل ہیں، یعنی بعض اخبار و روایات اہلِ تشیع کے موافق نقل کرتا ہے، تو بعض اہل السنّت کے موافق تو از روئے دیانت اس کی روایت سے ان صحابہ کرام علیہم الرضوان پر اعتراض و انکار اور تنقید و تنقیص کا علماء شیعہ کو کیا حق پہنچتا ہے، جن کی دیانت و امانت اور اخلاص و للّٰہیّت اور عظمت و رفعتِ شان قرآن مجید کے نصوصِ قطعیہ اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ صحیحہ متواترہ اور ائمہ کرام کے صحیح اور قطعی الثبوت ارشادات سے ثابت ہو۔

جیسے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ یہ بہت بڑی جفا کاری اور سنگدلی ہے کہ محض ظنّ و گمان اور تخمین و قیاس کی بنا پر کسی ثقہ اور معتبر و معتمد علیہ شخصیت کو موردِ الزام ٹھہرالیا جائے۔ ملاحظہ ہو نہج البلاغہ مع ابن میثم جلد ۵، صفحہ ۳۵۴ کما سبق بیانہ مرارًا۔

رسالہ مذہبِ شیعہ: حضرت شیخ الاسلام محمد قمر الدین قدس سرہ العزیز

نمازِ جنازہ کی چار تکبیرات کا ثبوت

عقائد کے متعلق تو نمونہ کے طور پر بعض روایات پیش کی گئیں، اب اعمال کے متعلق بھی ایک روایت مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے، جو نمازِ جنازہ میں تکبیروں کے بارے میں فروعِ کافی جلد ۱ صفحہ ۹۵ پر درج یوں ہے:

عن محمد بن مہاجر عن ام سلمۃ قالت سمعت ابا عبداللّٰہ علیہ السلام یقول کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا صلّٰی علی میت کبر و تشہد ثم کبر ثم صلّٰی علی الانبیاء ثم کبر ودعا ثم کبر الرابعۃ ودعا للمیت ثم کبر وانصرف فلمّا نہاہ اللّٰہ عزّوجل عن الصّلٰوۃ علی المنافقین کبر وتشہد ثم کبر و صلّی علی النّبیین صلی اللّٰہ علیہم ثم کبر فدعا للمومنین ثم کبر الرابعۃ وانصرف ولم یدع للمیّت۔

یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے بھانجے حضرت محمد بن مہاجر اپنی والدہ سے روایت فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں جب میت پر نمازِ جنازہ پڑھتے تھے، تو تکبیر کہتے، پھر تشہد یعنی شہادتین پڑھتے پھر دوسری تکبیر کے بعد انبیاء کرام علیہم السلام پر درود بھیجتے، تیسری تکبیر کہتے اور مومنین کے لئے دُعا مانگتے۔ پھر چوتھی تکبیر کے بعد میّت کے لیے دُعا مانگتے تھے، پھر پانچویں تکبیر

کے بعد سلام پھیرتے تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرما دیا، تو اس کے بعد ہمیشہ جنازہ میں چار تکبیریں کہتے تھے۔ اس ترتیب کے ساتھ کہ پہلی تکبیر کے بعد شہادتین۔ دوسری تکبیر کے بعد درود شریف — تیسری تکبیر کے بعد مومنین (احیاء و اموات) کے لیے دُعا فرماتے تھے، پھر چوتھی تکبیر کہہ کر سلام پھیرتے تھے۔"

اب منافقین پر پانچ تکبیریں اور مومنین پر چار تکبیریں پڑھا جانا ائمہ معصومین کی روایت سے کس طرح واضح ہے اور امام عالی مقام کی روایت سے روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح ہو گیا کہ جب منافقین پر نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا گیا، تو اس کے بعد ہمیشہ چار تکبیریں ہی پڑھی جاتی تھیں۔ منافقوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے اس آیتِ کریمہ کے ذریعے منع فرمایا گیا، تو اس کے بعد ہمیشہ چار تکبیریں ہی پڑھی جاتی تھیں۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی، وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ۔ کہ اے اللہ کے پیارے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کسی منافق پر نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ ہی اس کی قبر پہ قیام فرمائیں۔

اب اہلِ تشیع نے جو پانچ تکبیریں اپنے مذہب میں رائج کر رکھی ہیں، اُس کی یہی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اہلِ تشیع کے اسلاف حسبِ ارشادِ باری تعالیٰ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ بِسِيْمَاهُمْ (یعنی تم ضرور بالضرور انہیں ان کے چہروں سے پہچان لوگے) تقیہ کے پردوں میں نہ چھپ سکنے کی وجہ سے غالباً غیر حاضر رہتے ہوں گے، اسی لیے جو انہوں نے آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی، اس کو جائز ہی نہ سمجھا، تاہم ان کو ائمہ صادقین کے ارشاد پر اور نہیں تو بطورِ تقیہ ہی ایمان لانا چاہیئے تھا اور بظاہر اس پر عمل کرتے ہوئے چار تکبیریں ہی نماز جنازہ میں پڑھتے رہتے، مگر منشئ قضاء و قدر نے ان دونوں قسموں کی نمازِ جنازہ کو دونوں فریقوں کی قسمت میں الگ الگ لکھ دیا ہے، ورنہ مومنین پر چار تکبیر والی نماز جنازہ خود اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتاب کافی میں ائمہ معصومین سے مروی ہے اور اسی پر ہمیشہ کا معمول و تعامل بیان فرمایا گیا ہے جیسے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی روایت میں واضح طور پر موجود ہے جو ابھی بیان ہو چکی، اب تقدیر کو تدبیر کیسے بدل سکتی ہے؟ (مذہب شیعہ صـ۱۰۱ تا صـ۱۰۸)

رسالہ تنزیہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

نبی اکرم منافقین پر چار تکبیریں کہتے تھے

۱۔ پیر صاحب سیالوی نے اپنی کوتاہ اندیشی اور بے سوادی سے اتنا بھی نہ سوچا کہ حدیث شریف کا مطلب غلط سمجھ کر اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ ائمہ کرام کا کلام سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں، "ہماری احادیث مشکل ہیں، ان کو ملک مقرب یا نبی مرسل یا مومن ممتحن ہی برداشت کر سکتے ہیں۔" الخ

۲۔ فروعِ کافی کے جس باب میں یہ روایت تیسرے نمبر پر مذکور ہے، اس کا عنوان ہے، عِلّة تكبير الخمس على الجنازة۔ یعنی جنازہ پر پانچ تکبیریں پڑھنے کی علت اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ نمازیں پانچ ہیں، لہذا ہر نماز کے بدلے ایک تکبیر رکھ دی گئی، لہذا کل پانچ ہو گئیں اور تیسری روایت جسے پیر صاحب نے ذکر کیا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے: کہ جب تک منافقین کے لیے نماز کی ممنوعیت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، آپ ہر ایک پر پانچ تکبیریں کہتے تھے اور جب منع وارد ہوئی، تو منافقین پر چار اور مومنین پر پانچ تکبیریں کہتے تھے اور جب کسی پر چار کہتے تھے، تو وہ نفاق کے ساتھ متہم قرار دیا جاتا تھا جیسے کہ اسی باب میں تصریح موجود ہے۔

۳۔ چار تکبیرات کا اجراء عمر صاحب کے دورِ حکومت میں پایا گیا، تو اس کا جواب پیر صاحب کے ذمہ ہے کہ جب چار تکبیرات منافقین کے لیے تھیں تو عمر صاحب کو یہ پسند کیوں آئیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ پیر صاحب نے صرف اپنے خلیفہ صاحب کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے کی کوشش کی ہے، لیکن تدبیر سے تقدیر نہیں بدل سکتی۔

رسالہ تنزیہ الامامیہ (صـ۱۷۳ تا ۱۷۶)

ڈھکو صاحب کا اپنے مذہب کے دفاع سے عجزِ کامل

جواب الاوّل: علامہ صاحب نے فرمایا کہ پیر صاحب نے حدیث "کا" مطلب غلط سمجھا۔ نیز ائمہ کرام کا کلام سمجھنا۔ پیر صاحب کے مقدر میں کہاں؟ اس کو ملائکہ مقربین یا انبیاء و مرسلین اور شیعانِ ممتحنین ہی برداشت کر سکتے ہیں، لیکن موصوف کا یہ قول بوجوہ غلط اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

۱۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ائمہ کرام، ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین کی تبلیغ اور ان کے رشد و ہدایت کے لیے پیدا کیے گئے تھے، اس لیے وہی اُن کا کلام سمجھ سکتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔ جب انبیاء و مرسلین کو ہادیانِ خلائق بنا کر بھیجا جاتا ہے اور اسی قوم کی زبان میں تاکہ ان کے لیے جہالت اور لاعلمی کا عذر باقی نہ رہے، تو ائمہ کرام جو ان کے نائبین ہوتے ہیں، ان کا تقرر بھی لامحالہ اسی مقصد کے لیے ہوگا کہ قیامت کے دن یہ لوگ عذر نہ کر سکیں کہ ہمیں تو کسی نے تبلیغ و تنبیہ ہی نہیں کی تھی، اور ہدایت و رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ تو ائمہ کرام کا ایسا کلام کرنا جس کو صرف ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین ہی سمجھ سکیں اور یا خالص و مخلص اور مجرب و کندن بنے شیعہ ہی سمجھ سکیں یہ نصبِ امام کی غرض اور حکمت و مصلحت کے سراسر خلاف ہے علی الخصوص جبکہ ان کا کلام بھی ایسا ہو جس کا تعلق رموز و اسرار سے بھی نہ ہو، بلکہ نمازِ جنازہ جیسے عام معاملہ سے ہو تو پھر ایسے ائمہ کرام کی اطاعت و اتباع کے ساتھ عام لوگ مکلّف ہی کیونکر ہو سکتے ہیں؟

۲۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے: کلموا الناس علیٰ قدرِ عقولھم۔ کہ لوگوں کے ساتھ ان کے عقل و فہم کے مطابق کلام کرو تو ائمہ کرام نے اس ارشادِ نبوی کی پابندی کیوں نہ فرمائی۔

۳۔ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے اندر دو قیمتی ذرائع اور وسیلے ہدایت کے لیے چھوڑے تھے، یعنی قرآن مجید اور عترت و اہل بیت جبکہ قرآن خاموش اور غیر ناطق ذریعہ ہدایت تھا تو اہل بیت کرام اور بالخصوص ائمہ کرام تو ایسا ذریعہ ہدایت ہونے چاہئیں تھے کہ اُمتِ امیہ ان کے قول و ارشاد کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل پیرا ہوتی مگر ان کا کلام جب انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقربین ہی سمجھ سکیں، دوسرا کوئی مسلمان سمجھ ہی نہ سکے تو یہ ذریعہ ہدایت کا ہی نہ رہا اور ان سے عام اہلِ اسلام اور عامہ خلائق کا استفادہ ممکن ہی نہ رہا، تو ان کو سرچشمہ ہدایت قرار دینے اور ان سے تمسک کرنے کا حکم دینا ہی بے فائدہ ہو کر رہ گیا العیاذ باللہ!

۴۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا مقرب اور محرمِ اسرار نہ کوئی ہوا، نہ ہی کوئی ہو سکتا ہے نہ انبیاء و مرسلین میں اور نہ ملائکہ مقربین میں اور نہ ائمہ کرام میں، لیکن ان کے کلام کو اُمتِ امیہ نے سمجھا اور ان کی تعلیم و تربیت سے اور تہذیب و تزکیہ سے وہ لوگ، مہذّب دُنیا کے امام بن گئے جو کسی شمار و قطار میں نہیں تھے، تو ائمہ کا کلام اس محبوبِ معظم صلی اللہ علیہ وسلّم کے کلام سے کیونکر پیچیدہ ہو گیا اور فہم سے بالاتر، جبکہ وہ حضرات آپ کے نائب تھے اور آپ کے علوم کے امین اور آپ کی تعلیم و تربیت کے مظہر۔

۴۔ علامہ موصوف نے جو روایت نقل فرمائی، اس میں شیعہ ممتحنین کو ملائکہ اور انبیاء و مُرسلین کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں وہی صلاحیتیں موجود ہیں جو ان مقدّس نورانی حضرات میں موجود ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ، حالانکہ یہ کھلی بے ادبی اور گستاخی ہے۔ نیز جب شیعانِ ائمہ کا حال یہ ہوا، تو ائمہ کرام کا کیا مقام ہو گا تو اس کا واضح مطلب یہی نہ ہوا کہ ان کو اُلوہیت کا درجہ دیا جائے العیاذ باللہ تعالیٰ جیسے کہ غالی شیعوں کا یہی نظریہ اور عقیدہ ہے۔

۶۔ نیز اگر شیعہ ان کے ارشادات کو سمجھ سکتے تھے، تو پھر دو درجن فرقوں میں کیوں بٹ گئے اور سر گمراہی اور بے دینی ان میں کیونکر موجود ہو گئی؟ ائمہ کرام کے حق میں اُلوہیت

حلول و اتحاد، نبوّت و رسالت کا اعتقاد، حشر نشر کا انکار، شرعی تکالیف کو کالعدم قرار دے کر نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ کی چھٹی، حرام اور ناجائز امور زنا اور طوالت وغیرہ کو مباح اور حلال قرار دینا وغیرہ کیا یہ انہیں احادیث اور ائمہ کرام کے کلام کا اعجاز تو نہیں جس کو حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین قدس سرہ جیسے سُنّی نہیں سمجھ سکتے تھے تو ایسی احادیثِ مبارکہ اور ایسے ارشادات کا فائدہ کیا ہوا؟ جن سے صرف شیعہ بھی ہدایت نہ پا سکے، باقی اہلِ اسلام کا تو کیا کہنا؟ لہٰذا یہ روایت قطعًا غلط ہے اور ناقابلِ اعتبار و اعتداد اور ایسے صرف اور صرف ملحد اور زندیق لوگوں نے اختراع کیا ہے اور جب علامہ ڈھکو صاحب کے دعوٰی کی بنیاد ہی منہدم ہو گئی تو اس پر مترتب اور متفرع نتیجہ و ثمرہ بھی خود بخود باطل ہو گیا کہ ائمہ کی حدیث کا مطلب سمجھنا پیر صاحب کے مقدر میں کہاں؟

جواب الثانی، دوسرے جواب میں ڈھکو صاحب نے یہ بھی تسلیم کیا کہ نمازِ جنازہ منافقین پر پڑھنے کی ممنوعیت کا حکم جب تک نازل نہیں ہوا تھا، تو آپ ہر نمازِ جنازہ میں پانچ تکبیریں کہتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کر لیا کہ جب ممنوعیت کا حکم نازل ہو گیا تو آپ نے منافقین پر نمازِ جنازہ میں چار تکبیریں کہنی شروع کر دیں اور جس پر بھی آپ چار تکبیرات پڑھتے تھے، اس کو نفاق سے متہم سمجھا جاتا تھا۔

عندالشیعہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت حکمِ باری تعالیٰ

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین پر نمازِ جنازہ سے منع فرمایا مگر حضور نبی کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہ مانا اور اس کی منع کو لائقِ التفات اور قابلِ عمل نہ سمجھتے ہوئے نمازِ جنازہ ان پر پڑھتے رہے۔ صرف ایک تکبیر کم کر دی ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ - ان منافقین میں سے کسی پر بھی نمازِ جنازہ کبھی نہ پڑھیں اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہوں — اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ آپ ان پر

پانچویں تکبیر نہ کہیں کس لغت اور کس بولی کا ترجمہ ہے اور اس آیتِ کریمہ کے کون سے لفظ سے یہ ترجمہ اخذ کیا گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ڈھکو صاحب نے اپنے فاسد مذہب کو بچانے کی مذموم کوشش کرتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خداوند تعالیٰ اور قرآن مجید کا مخالف بنا ڈالا ہے، اس سے بھی بڑھ کر مذہبی تعصب کی کوئی مثال مل سکتی ہے۔؟

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقین پر نمازِ جنازہ نہ پڑھنا

الغرض یہ امر تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس آیتِ کریمہ کے نزول کے بعد آپ منافقین پر نمازِ جنازہ پڑھتے ہی نہیں تھے، بلکہ صرف مومنین پر پڑھتے تھے اور اس حقیقت کا اقرار و اعتراف خود شیعی اکابرین نے بھی کیا ہے۔ علامہ طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان جلد ۳ صـ۵۷ پر رقمطراز ہے، فَمَا صَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ عَلٰى مُنَافِقٍ حَتّٰى قُبِضَ یعنی اس آیتِ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد آپ نے تادمِ واپسین کسی منافق پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی اور علامہ فتح اللہ کاشانی نے تفسیر منہج الصادقین جلد ۴ صـ۲۹۸ پر کہا، وبعد ازاں آنحضرت بر ہیچ منافق نمازِ جنازہ نگذارد۔ لہٰذا واضح ہو گیا کہ یہ دعوٰی سراسر غلط ہے کہ آپ منافقین پر نمازِ جنازہ پڑھتے رہے۔ صرف ایک تکبیر کم کر دی۔ یہ شیعی علماء مفسّرین کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، اور عظمتِ نبوّت کے بھی خلاف ہے کہ آپ حکمِ خداوندی کو پس پُشت ڈالیں اور اسے نظر انداز کریں تو لامحالہ یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نمازِ جنازہ میں اگر پہلے پانچ تکبیرات تھیں، تو بعد ازاں چار رکھی گئیں اور منافقین پر سرے سے نماز پڑھنی ہی ترک کر دی گئی تھی اور جو کچھ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمایا، وہ بالکل واضح طور پر ثابت ہو گیا اور علامہ ڈھکو صاحب نے جو کچھ کہا، اس کا دروغ بے فروغ ہونا واضح ہو گیا۔ پہلے شیعہ بھی جھوٹ تو بولتے تھے، مگر موہوم خطرات کے تحت لطور تقیہ، مگر آجکل تو انہیں کوئی ایسا خطرہ بھی لاحق نہیں، لیکن جھوٹ بولنے سے باز نہیں

آتے، تو معلوم ہوا کہ کذب، افتراء اور دروغ بیانی اُن کی فطرت میں داخل ہو چکے ہیں اور پہاڑ کا اپنی جگہ سے ٹل جانا ممکن ہے، مگر فطرت کے تقاضوں کا بدلنا ناممکن ہے۔

سوال : ہو سکتا ہے کہ آیتِ کریمہ سے جس امر کی ممنوعیت ثابت ہو رہی ہو وہ چوتھی تکبیر کے بعد والی خصوصی دُعا ہو، لہٰذا اس آیتِ کریمہ میں گویا نمازِ جنازہ سے منع نہیں کیا گیا تھا اور آپ نے چوتھی تکبیر کے بعد دُعا مانگنی بھی ترک فرما دی اور پانچویں تکبیر بھی، لہٰذا منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے سے قرآن مجید کی مخالفت لازم نہ آئی اور چار تکبیریں بھی صرف منافقین کے ساتھ مخصوص ہو گئیں ۔؟

جوابِ اوّل : قرآن وحدیث کے الفاظ کو جب تک شرعی معانی پر محمول کرنا ممکن ہو اور کوئی قطعی صارف اور مانع موجود نہ ہو تو اس وقت تک انہیں دیگر معانی لغویہ وغیرہ پر محمول کرنا قطعاً درست نہیں ہوتا اور صلوٰۃ کا لفظ شرعی اطلاقات میں نماز کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لہٰذا ممنوعہ صلوٰۃ بمعنی نماز ہو گی نہ کہ بمعنی دُعا ورنہ کوئی شخص اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وغیرہ میں بھی کہہ سکتا ہے کہ یہاں بھی صرف دُعا والا معنی مراد ہے نہ کہ ارکانِ مخصوصہ پر مشتمل نماز والا معنی تو اس طرح لغوی معانی کی آڑ میں احکام شرع کو ہی باطل ٹھہرانے کی راہ کھل جائے گی ۔

جوابِ دوم : اس امر پر تمام مفسّرین کا اجماع ہے کہ یہ آیتِ کریمہ عبداللہ بن ابی منافق کی نمازِ جنازہ کے حق میں نازل ہوئی اور اس کی قبر پر کھڑے ہو کر دُعا کرنے کے حق میں نازل ہوئی، لہٰذا اس پس منظر میں بھی یہ توجیہ و تاویل قطعاً بے محل ہے بلکہ تحریفِ معنوی کے مترادف ہے۔ علامہ فتح اللہ کاشانی نے اپنی تفسیر "منہج الصادقین" میں اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: متبادر بفہم از صلوٰۃ بر میت نماز است بر طریق مذکور پس محمول برآں باشد (ج ۴، ص ۲۹۹) میت پر صلوٰۃ سے متبادر طور پر ذہن میں جو معنی آتا ہے، وہ ہے نماز معہود اور معلوم طریقہ پر ادا کرنا ۔

لہٰذا یہ آیت کریمہ اسی معروف معنی پر محمول ہو گی، لہٰذا وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ فرما کر منافقین پر نمازِ جنازہ پڑھنے سے روک دیا اور آپ کی عادتِ کریمہ یہ تھی کہ دفن میت کے

بعد قبر پر کھڑے ہو کر دُعا فرماتے تھے تو وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ فرما کر منافقین کی قبروں پر کھڑے ہو کر دُعا مانگنے سے منع فرما دیا۔ منہج الصّادقین جلد چہارم ص ۲۹۸ و مجمع البیان جلد ثالث ص ۵۷) نہاہ اللہ عن الصّلوٰۃ علی المنافقین والوقوف علیٰ قبورھم والدعاء لھم۔ الغرض جب مقصود باری تعالیٰ ہی دونوں امور سے منع فرمانا تھا، تو صلوٰۃ کو دُعا کے معنیٰ میں لینا اور پھر اس سے خاص چوتھی تکبیر کے بعد والی دُعا مراد لینا جو نہ از روئے شرعی معنی متعیّن ہے اور نہ از روئے لُغت ثابت ہے، لہٰذا یہ توجیہ لغو اور باطل ہے اور سراسر تحریف ہے اور خود علامہ ڈھکو صاحب نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں منافقین پر نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا اس کی عبارت کی رو سے بھی یہ توجیہ باطل ہو گئی، تو ڈھکو صاحب کا مؤقف کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

جوابِ سوم : اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ساتھ جہاد کرنے اور ان پر تغلیظ و تشدید فرمانے کا حکم دیا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

تو اس کے برعکس ان پر نماز جنازہ پڑھنا، اس حکم کی صریح خلاف ورزی ہے جو کسی بھی مخلص مومن سے متوقع نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ سیّدِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا عملی طور پر سرزد ہونا تسلیم کیا جائے، لہٰذا یہاں نماز جنازہ اور دعا ہر دو کی ممنوعیت ثابت ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جن منافقین کی مسجد میں حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز پڑھنا، بلکہ قدم رکھنا بھی اللہ تعالیٰ کو گوارا نہیں، بلکہ اس مسجد کو ہی نیست و نابود کر دیا گیا، تو مرنے کے بعد ان کے ساتھ اس عظیم مروت اور رواداری کا مظاہرہ کیونکر روا ہو سکتا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو کیونکر گوارا فرما سکتا ہے؟

علامہ ڈھکو صاحب کی مخالفتِ اجماع

علامہ موصوف نے یہ تاثر دیا کہ منافقین پر نماز جنازہ کی صرف چار تکبیریں ہیں

اور مومنین و مخلصین کے لیے پانچ تکبیریں اور اسی کو سنتِ نبویہ قرار دیا ہے، لیکن یہ دعوٰی بھی شیعی اجماع و اتفاق کے خلاف ہے۔ علامہ فتح اللہ کاشانی نے کہا ہے:

نمازِ بر میت پنج تکبیر است بعد از تکبیرِ اول شہادتین است و بعد از دوم صلوات بر پیغمبر و آل او و بعد از سوم دعا اہلِ ایمان و بعد از چہارم دعا برائے میت اگر مومن باشد و بر او اگر منافق باشد و بدعائے مستضعفین اگر مستضعف باشد و روایت اہل بیت و اجماعِ ایشان دال است بریں (تفسیر منہج الصادقین، جلد چہارم ص ۲۹۸)

میت پر نمازِ جنازہ کی پانچ تکبیریں ہی ہیں۔ پہلی کے بعد شہادت توحید و رسالت، دوسری کے بعد حضور نبی اکرم اور آلِ اطہار پر درود اور تیسری کے بعد اہلِ ایمان کے لیے دعا اور چوتھی کے بعد میت کے مومن ہونے کی صورت میں دعائے خیر اور منافق ہونے کی صورت میں دعائے ہلاکت اور دعائے عذاب و عقاب اور اگر مستضعف یعنی تابع ہو اور عقائد کے معاملہ میں تحقیق سے قاصر ہو، تو اس کے لیے مستضعف لوگوں والی دعا مانگی جائے گی۔ اہل بیت کی روایت اور ان کا اجماع اسی پر دلالت کرتا ہے۔

لہٰذا جو طریقہ ڈھکو صاحب نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے، وہ اہل بیت کی روایت کے بھی خلاف ہوا اور ان کے اجماع کے بھی تو اہل بیت کرام نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کیسے اتفاق کر لیا، لہٰذا صاف ظاہر کہ علامہ موصوف کا جواب غلط ہے اور محض ہیرا پھیری پر مبنی ہے۔ ایک طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا مخالف بنا ڈالا اور دوسری طرف اہل بیت کرام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

اہل بیت کرام پر بہتانِ عظیم

اہل السنت اور اہلِ تشیع کی متفق علیہ روایت کے مطابق اہل بیت کرام اور قرآن مجید کا راستہ ایک ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، لیکن شیعی علماء نے ان کی راہیں جدا جدا کر دی ہیں۔ قرآن مجید نے منافقین پر نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع کیا

بلکہ ان کی قبور پر قدم رکھنے سے بھی منع کیا، بلکہ کفّار کی مانند ان کے ساتھ جہاد کرنے اور تغلیظ و تشدید کرنے کا حکم دیا، لیکن شیعہ حضرات نے اہل بیت کرام کو منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے پر متفق اور مجتمع کر دکھلایا اور وہ تفریق اور تمییز بھی روا نہ رکھی جو ڈھکو صاحب نے فروعِ کافی کی روایت سے گلو خلاصی کے لیے ایجاد کی تھی، جو قرآن مجید کی صریح خلاف ورزی ہے اور بقولِ ڈھکو صاحب سنتِ نبویہ کی بھی خلاف ورزی ہے۔ گویا اہل بیت کرام نے نہ صرف قرآن مجید کی خلاف ورزی کی، بلکہ سنتِ نبویہ کی بھی مخالفت کی جو ان کی شان سے قطعاً بعید ہے۔

نیز اگر اہل بیت کرام منافق میت کے لیے عذاب و عقاب کی دعا کرتے تھے، تو لوگوں کو سنا کر یا دل ہی دل میں کرتے تھے۔ پہلی صورت تقیہ کے خلاف ہے اور میت کے ورثاء اس کو گوارا ہی کیسے کر سکتے تھے، تو لامحالہ خفیہ طریقہ پر وہ بددعا کرتے ہوں گے جس کے متعلق عام اہلِ اسلام کو معلوم ہی نہیں ہو سکتا ہوگا کہ دعائے خیر کی گئی ہے یا دعائے ہلاکت تو وہ یہی سمجھیں گے کہ میت مسلمان ہے اور اہل بیت کرام نے اس کے حق میں ہمدردی اور خیر خواہی کا مظاہرہ کیا ہے، تو اس طرح مخالفتِ قرآن مجید کے ساتھ عام اہلِ اسلام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا بھی لازم آ گیا۔ العیاذ باللہ!

الغرض علامہ ڈھکو صاحب کی ہر توجیہ و تاویل غلط ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ کریمہ کے نزول کے بعد منافقین پر نمازِ جنازہ پڑھی ہی نہیں، لہٰذا یہ توجیہ غلط ہو گئی کہ آپ نے نزولِ آیت کے بعد ان پر چار تکبیرات کہنی شروع فرما دی تھیں اور یہ توجیہ بھی باطل ہو گئی کہ مومنین اور منافقین کی نمازِ جنازہ میں تکبیرات کے لحاظ سے فرق ہے، کیونکہ یہ اجماعِ اہل بیت کے خلاف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ پہلے چار تکبیرات تھیں اور بعد میں پانچ کر دی گئیں، تو یہ توجیہ اس روایت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ اس میں پہلے پانچ تکبیرات کے معمول ہونے اور بعد ازاں ان کو چار سے بدلنے کی تصریح موجود ہے، لہٰذا یہ روایت علامہ ڈھکو صاحب اور دیگر علماء شیعہ کے لیے سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی مانند ہے کہ نہ نگلتے بنے اور نہ اگلتے انکار کریں تو

حضرت مہدی علیہ السلام کی تصدیق باطل ہوتی ہے اور اقرار کریں تو مذہب باطل ہوتا ہے۔

صحیح توجیہ و تاویل

الحاصل اس روایت کی اگر کوئی صحیح توجیہ ہو سکتی ہے، تو وہ صرف اور صرف یہی ہے کہ پہلے ہر میت پر نمازِ جنازہ میں پانچ تکبیریں کہی جاتی تھیں، بعد ازاں ان کو چار کر دیا گیا اور منافقین پر نمازِ جنازہ اور دُعا ختم کر دی گئی، رہا مناسبت کا معاملہ تو جب پانچ تھیں تو پانچ نمازوں والی مناسبت ملحوظ تھی اور جب چار رہ گئیں، تو دوسری مناسبات کو ملحوظ رکھ لیا جائیگا مثلاً ملائکہ مقربین کا چار ہونا اور بڑی کتبِ سماویہ کا چار ہونا وغیرہ۔ نیز علامہ صاحب نے عنوان کی جو آڑ لی ہے کہ اس میں پانچ تکبیروں کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نمازیں پانچ ہیں، لہذا ہر نماز کے مقابل ایک تکبیر رکھ دی گئی، تو منافقوں پر چار تکبیریں کہنے کی صورت میں وہ مناسبت بھی باقی نہ رہی، لہذا یہ روایت اس عنوان کے بھی خلاف ہوگئی اور اگر ان کی نمازوں کا اعتبار ہے، تو وہ بھی پانچ ہی پڑھا کرتے تھے نہ کہ چار، پھر ان پر چار تکبیریں کہنے کی وجہ کیا ہوئی؟ لہذا جو کچھ شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے فرمایا، اس کے تسلیم کیے بغیر چارۂ کار نہیں ہے اور یہ بھی تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ روایاتِ اہلِ بیت کا صحیح معنی و مفہوم سمجھنا اہلِ تشیع کے بس کی بات نہیں، بلکہ اس کو صرف اور صرف اہل بیت کرام کے یہی غلام ہی سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے چار تکبیرات کو نافذ کرنے کا مطلب

شیعی علماء کا یہ دعویٰ کہ نمازِ جنازہ کی چار تکبیرات کو حضرتِ عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے جاری فرمایا، یہ سراسر غلط ہے اور دھوکہ بازی اور فریب کاری ہے۔ علامہ ڈھکو صاحب نے اس ضمن میں تاریخ الخلفاء کا حوالہ دیا ہے، گو اس عبارت میں اجمال ہے، لیکن مطلب و مفہوم پھر بھی ظاہر ہے اَوَّلَ مَنْ جمعَ النَّاس فی صَلوٰۃ الجَنازۃ علی اربع تکبیرات (ص۹۷) یعنی آپ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے لوگوں کو نمازِ جنازہ میں چار تکبیرات پر جمع کیا اور

متفق کیا نہ کہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے چار تکبیرات کو جاری کیا: اَوَّلُ مَنْ جَمَعَ اور اَوَّلُ مَنْ سَنَّ میں فرق واضح ہے، لیکن اگر تعصب کا کالا موتیا دہ فرق محسوس نہ ہونے دے تو اس کا کیا علاج ہے۔ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے چار تکبیر پڑھنا ثابت ہے جیسے کہ بخاری شریف اور مسلم شریف میں متفق علیہ روایت ہے کہ بادشاہِ حبشہ کی وفات پر آنحضرت کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی اور اس پر چار تکبیرات کہیں خرج بهم الی المصلّی فصفّ بهم وکبر اربع تکبیرات (مشکوٰۃ باب المشی بالجنازۃ والصلوٰۃ علیها۔

اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ نمازِ جنازہ میں چار تکبیرات پڑھتے تھے اور بعض دفعہ پانچ پڑھتے تھے۔ جب وجہ دریافت کی گئی، تو فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ تکبیریں بھی کہتے تھے، لہذا جب روایات مختلف ہوگئیں اور عملِ اصحاب بھی مختلف ہوگیا، تو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو اگر تم ہی متفق نہ ہوئے تو بعد والوں میں اتفاق کس طرح ہو سکے گا، لہذا باہم مل کر بیٹھو اور صلاح و مشورہ کر کے ایک صورت اور کیفیت پر اتفاق کر لو، چنانچہ آپ کی دعوت پر سب صحابہ نے مل کر فیصلہ دیا کہ آخری فعل حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی تھا یعنی چار تکبیرات والا اس لیے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی کو نافذ فرمایا۔ شیخ عبدالحق محدثِ دہلوی رحمہ اللہ نے شرح سفر السعادۃ میں اس صورتِ حال اور واقعہ کو نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

بایدکہ اتفاق و اجماع کنید بر یک عمل تا دیگراں نیز متفق و مجتمع باشند۔ پس نظر برگماشتند اصحاب کہ دریابند کہ در آخر جنازہ کس آنحضرت تکبیر گفت چند بود، پس دریافتند آخر چہار بود پس اجماع کردند برآں (ص۲۶۳)

اور حضرت شیخ محقق نے ہی چار تکبیروں کی وجہ ترجیح بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وکسانے کہ منع میکنند از زیادہ بر چہار می گویند کہ ثابت شدہ است کہ آخر نماز جنازہ کہ گزارد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چہار تکبیر گفت از ابن عباس مرویست کہ ملائکہ چوں بر آدم

علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نماز کردند چہار تکبیر گفتند وگفتند ہذہ سنتکم یا بنی آدم (رواہ الحاکم فی المستدرک وابو نعیم فی الحلیۃ والبیہقی فی السنن، شرح سفر السعادۃ ص۲۶۳ و ص۲۶۴) خلاصہ مفہوم یہ کہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل بھی یہی تھا اور اوّل الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء پر پڑھی جانے والی نمازِ جنازہ کی صورت وکیفیت بھی یہی تھی جو ملائکہ معصومین نے پڑھی اور اس کے اولادِ آدم کے لیے سنّت ہونے کا بھی قول کیا۔

الغرض حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے چار تکبیرات نافذ نہیں کی تھیں، بلکہ جو نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا آخری عمل تھا اور جن سے آغاز نمازِ جنازہ کا ہوا تھا، گویا آپ اولادِ آدم کو سیدِ آدم وبنی آدم علیہ السلام کی سُنّت پر چلانا چاہتے تھے اور اس قدیم سنّت پر جو آدم علیہ السلام کے وصال سے شروع ہوئی تھی، مگر شیعہ حضرات کو یہ پسند نہیں، لہٰذا حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی داد وتحسین اور شکر گزاری کی بجائے ان کو الٹا موردِ الزام واتہام بنا لیا سچ ہے ؎

مہ فشاند نور سگ عوعو کند

اور فروعِ کافی کی وہ روایت جو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے نقل فرمائی وہ بھی حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل اور مذہبِ مختار کی مؤیّد ہے، کیونکہ منافقین پر نمازِ جنازہ ہی ممنوع ٹھہری، تو پھر چار تکبیریں اہلِ ایمان کی نمازِ جنازہ میں ہی پڑھی جاتی تھیں نہ کہ منافقین کی نماز میں اور پانچ تکبیریں اگر کہی جاتی تھیں، تو منافقین کی نمازِ جنازہ منسوخ ہونے سے قبل، تو اب شیعہ حضرات کا اس عمل کو دوبارہ جاری کرنا کوئی اچھا شگون نہیں ہے، مگر ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل !
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حضرت علی مُرتضیٰ اور دیگر ائمہ اہل بیت کا طرزِ عمل کیا تھا؟

یہ حقیقت تو ناقابلِ تردید انکار ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اہلِ ایمان کا بالعموم اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بالخصوص چار تکبیرات پر

اتفاق ہو گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ائمہ کرام کا طرزِ عمل اور طریقۂ کار کیا تھا۔ بقول ڈھکو صاحب کے وہ اہلِ ایمان پر پانچ تکبیریں کہتے تھے اور منافقین پر چار، جیسے کہ عملِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نقل کرنے سے واضح ہوتا ہے یا بقولِ علامہ کاشانی ہر میّت پر پانچ تکبیرات کہتے تھے، لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور نہ صرف واقع اور نفس الامر حقیقت کے خلاف ہیں، بلکہ شیعی تصریحات کے بھی خلاف ہیں۔ کتاب الروضہ کافی سے نقل کردہ روایت میں ڈھکو صاحب اور اس کے طبیبِ خاص نے جن احکام کی طویل فہرست گنوائی ہے جن کو حضرت امیر رضی اللہ عنہ غلط سمجھتے تھے، مگر لشکر کے جُدا ہو جانے اور آپ کے تنہا رہ جانے کے اندیشہ کے تحت اور تقیہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ تبدیل نہ کر سکے۔ ان اٹھائیس احکام میں سے سترھواں حکم یہ ہے کہ آپ جنازہ پر پانچ تکبیر کو جاری نہ کر سکے اور زندگی بھر اسی طرزِ عمل اور روش و رفتار کو اپنائے رہے جو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے جاری کی تھی، تو جب حکومت وسلطنت مل جانے کے باوجود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عمل یہی رہا تو دوسرے ائمہ اہل بیت جن کے ہاتھ میں حکومت وسلطنت ہی نہیں تھی اور وہ لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَار اور اَسَدُ اللّٰہِ الْغَالِبُ کی شان بھی نہیں رکھتے تھے، ان سے کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کا خلاف کرتے جبکہ نمازِ جنازہ پڑھانے والے بھی امراء اور حکّامِ وقت ہی ہوا کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ بھی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بجائے مروان نے پڑھائی تھی تو اہل بیت کرام کا فتویٰ یا عمل چار تکبیرات کے خلاف کیونکر ہو سکتا تھا، لہٰذا یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جب بھی نمازِ جنازہ پڑھائی تو چار تکبیرات والی نماز ہی پڑھائی، لہٰذا اس کیفیت پر اصحابِ رسول، اہل بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اہلِ اسلام کا اجماع واتفاق ثابت ہو گیا اور ان میں باہم عملی موافقت ومطابقت، اب ڈھکو صاحب ہی فرما دیں کہ کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ساکھ گرتی نظر آتی ہے اور اس کو کسی سہارا کی ضرورت رہ جاتی ہے، جبکہ اہل بیت کرام اور علی الخصوص ائمہ کرام سبھی عملی طور پر ان کے موافق ہیں۔ ہاں اگر ساکھ گرانے کی ناپاک سعی وکوشش کی گئی ہے تو

اہلِ تشیع کی طرف سے ان مقتدایانِ انام اور ائمہ کرام کی جن کو ما فی الضمیر کے اظہار سے بھی اور اس کے مطابق عمل سے بھی عاجز اور قاصر ثابت کیا گیا ہے اور صرف از روئے تقیہ اور مصلحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چلتے دکھایا گیا ہے۔ کچھ بھی ہو، ان کا ظاہری عمل تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موافق تھا۔ اگر سب اہلِ اسلام کے خلاف چلے اور ان سے مختلف طرزِ عمل اپنائی اور منافقین کی نماز جنازہ کی ممنوعیت سے پہلے کی صورت اپنائی تو اہلِ تشیع نے جو سراسر منشی قضا و قدر کی تحریر کا اعجاز ہے اور تقدیر کے تدبیر سے نہ بدل سکنے کی روشن دلیل۔ کما قال شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

والحمد للہ علیٰ وضوح الحق وبطلان الباطل ون هوقه۔

رسالہ مذہبِ شیعہ — حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

ائمہ اہل بیت کرام کا اپنی اولاد و امجاد کے نام خلفاء راشدین کے مقدس ناموں پر رکھنا

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ائمہ معصومین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنے فرزندوں اور دل بندوں کے نامِ مبارک ابوبکر، عمر اور عثمان رکھے اور اہلِ تشیع کی تقریباً ہر کتاب میں جہاں بھی ائمہ معصومین کی اولادِ معصومین کا بیان اور ان کے اسماء گرامی کا ذکر آتا ہے، یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ جلاء العیون مصنفہ باقر مجلسی میں بالتصریح موجود ہے اور کشف الغمہ صـ۱۳۲ و صـ۲۲۴ پر حضرت سیدنا امام عالی مقام علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے ایک صاحبزادے کا نامِ مبارک ابوبکر، دوسرے کا نامِ مبارک عمر اور تیسرے کا نامِ مبارک عثمان مرقوم ہے اور یہ بھی تصریح ہے کہ تینوں حضرات اپنے بھائی کے ساتھ میدانِ کربلا میں شہید ہوئے۔ جلاء العیون میں ہے کہ حضرت امام عالی مقام شہیدِ کربلا رضی اللہ عنہ کے ایک فرزند کا نام عمر تھا جو علی اکبر کے نام سے مشہور

تھے۔ (کشف الغمہ صـ۱۷۱) امام عالی مقام سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے ایک صاحبزادے کا نام مبارک ابوبکر، دوسرے کا نامِ مبارک عمر تھا۔ کشف الغمہ صـ۲ میں امام عالی مقام سیدنا علی بن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہما کے ایک صاحبزادے صاحب کا نامِ مبارک عمر تھا۔ کشف الغمہ پر امام عالی مقام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے کا نامِ مبارک ابوبکر اور دوسرے کا نامِ مبارک عمر تھا۔

وقت تحریر چونکہ میرے پاس جلاء العیون" موجود نہیں، ورنہ اس کے صفحات بھی درج کرتا صفحات یاد نہیں علماء حضرات کتاب دیکھ کر صفحات لگالیں۔ کتاب ناسخ التواریخ میں ہر ایک امام کے فرزندوں کے نام اور ان کے فرزندوں کے فرزندوں کے نام، حتیٰ کہ کئی پشتوں تک ابوبکر، عمر اور عثمان ہیں۔ اب جن مقدس ہستیوں نے اپنے دلبندوں کے نام ابوبکر و عمر اور عثمان رکھے تھے۔ بہر صورت وہی ہستیاں ہیں، ان کے مراتب اور فضائل سے زیادہ واقف ہو سکتی ہیں نہ کہ ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد آنے والے لوگ۔ اگر گستاخی نہ ہو تو ایسے لوگ جو قرآنِ کریم کی کسی آیت کا صحیح ترجمہ کرنا تو بجائے خود صحیح تلاوت کرنے سے بھی نابلد ہیں۔ علومِ عربیہ پر مہارت تو بڑی چیز ہے نام کے واقف بھی نہیں، تو ایسے لوگوں کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ ائمہ دین کے واضح طرزِ عمل کے خلاف، اور ان تصریحات کے مناقض اور برعکس خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ارفع و اعلیٰ شان کے متعلق کوئی نظریہ قائم کریں اور اسی من گھڑت عقیدہ کے ماتحت اللہ تعالیٰ کے مقبولانِ بارگاہ کے نام لے کر ان کے حق میں سب و شتم بکنا عبادت تصور کریں۔

اتنا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اپنی اولاد کا نام بہتر سے بہتر رکھا جاتا ہے، آئندہ اولاد کی قسمت، نام رکھنے میں تو ایک غریب سے غریب آدمی بھی اپنے بچے کا نام شاہجہان رکھنا ہی پسند کرتا ہے، مگر یہ کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے بھی اپنے فرزند دلبند کا نام ایسا رکھا ہو جس کو وہ بُرا مانتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بڑے سے بڑا محب اپنے لڑکے کا نام ابن زیاد یا ابن سعد یا شمر یا یزید نہیں رکھ سکتا تو تمام ائمہ کرام اپنے فرزندوں اور امام زادوں کے نام ایسے کیونکر رکھ سکتے تھے، جن کو وہ اچھا نہ جانتے ہوں معلوم

ہوا کہ ان کے نزدیک ابوبکر، عمر اور عثمان انتہا درجہ فضل و کمال، تقدس اور رفعتِ شان پر فائز ہستیاں تھیں، جیسے کہ پہلے اوراق میں ائمہ معصومین کی تصریحات پیش کر چکا ہوں۔ اگرچہ اہلِ عقل کے نزدیک ائمہ معصومین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اپنے فرزندوں کے نام ان مقدس ہستیوں کے نام پر رکھنا ان کے علوِ مرتبت اور رفعتِ شان کے لیے بڑی زبردست دلیل ہو سکتی ہے، مگر ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ ائمہ طاہرین کے نزدیک کسی ایسے آدمی کا نام اپنی اولاد کے لیے تجویز کرنا جس پر اللہ تعالیٰ خوش نہ ہو، یہ ہرگز جائز نہیں، مثال کے طور پر دیکھو کشف الغمہ ص۲۴۴ جہاں امام ابوالحسن موسیٰ کاظم اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہما دونوں اپنے ایک شیعہ یعقوب سراج کو حکم دے رہے ہیں کہ کل جو تونے اپنی لڑکی کا نام رکھا ہے، جلد اس کو بدل دو، کیونکہ یہ ایسے شخص کا نام ہے جس پر خدا تعالیٰ خوش نہیں ہے۔ تو جو دوسروں کی اولاد کا نام بدلنے کا حکم دے رہے ہیں، وہ اپنے فرزندوں کے نام ایسے کیونکر تجویز کر سکتے ہیں جو اللہ کے پیارے نہیں اور جن کو بہتر نہیں جانتے تھے۔

مخالفین کے اسماء سے موسوم لوگوں کے ساتھ شیعہ کا سلوک

کئی دوستوں نے ایک عجیب لطیفہ سنایا کہ شہر سرگودھا میں آنکھوں کے ایک ڈاکٹر ہیں، جن کے پاس جب بھی کوئی ایسا مریض جاتا ہے جس کا نام صدیق یا عمر یا عثمان ہو تو پہلے تو زیرِ علاج رکھنے سے ہی انکار کر دیتے ہیں اور اگر کوئی ناقابلِ رد سفارش لے جاتا ہے تو پھر اس غریب کو ہمیشہ کے لیے آنکھ کے مرض سے بے نیاز کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس قسم کے آئی سپیشلسٹ محبِ ائمہ معصومین کے زمانہ میں علاج کی خدمات پیش نہ کر سکے، ورنہ ان نورِ دیدۂ ائمہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ناگزیر تھا، جونہی وہ مقدس ہستیاں اپنا مقدس نام ابوبکر یا عمر یا عثمان بتاتے، ادھر سے دستِ محبت، شانِ محبت کا مظاہرہ کر گزرتا ہے۔

ایسے ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ بھی خارج از حکمت نہیں، کیونکہ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو آنکھ کے ساتھ نسبتِ کاملہ جو ہے۔ دیکھیے اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتاب معانی الاخبار مطبوعہ ایران ص۱۱۰ جہاں امام عالی مقام حضرت حسن رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکر میری آنکھ ہیں، عمر میری گوشِ مبارک اور عثمان میرا دل منور ہے۔ تفسیر امام حسن عسکری، مطبوعہ ایران ص۱۶۴ و ص۱۶۵ کہ جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ابوبکر بمنزلہ میری آنکھ کے ہے، تو ایسی صورت میں محبت و تولّیٰ کا سارا مظاہرہ آنکھ ہی کے متعلق پیش کرنا زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ حضرات انتہائی تعجب ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے روزمرّہ مشغلہ کے متعلق بھی تاریخ سے اس قدر بے خبر ہیں کہ ان کو ائمہ معصومین کے نام تک معلوم نہیں، ان کے واضح ترین طرزِ حیات و تصریحات اور لائحہ عمل تو درکنار محض جہالت پر مبنی ایک خود ساختہ دھرم پر کیوں اُتر آتے ہیں؟

چونکہ صاحبِ کشف الغمہ نے اہل السنّت والجماعت کے متعلق بڑے تشدد کے ساتھ اتہام باندھا تھا کہ وہ ائمہ معصومین کی روایات کو نہیں مانتے۔ اسی خوف سے میں نے اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتابیں حاصل کیں اور ان سے صرف وہی روایات جو ائمہ طاہرین معصومین سے مروی ہیں اور جن سے متعلق یقین کامل ہے کہ محبت و تولّیٰ کا دم بھرنے والے ایسی روایات کو سر آنکھوں پر رکھیں گے اور دیکھتے ہی ایمان لائیں گے۔ اہلِ عقل و انصاف کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ یہ رسالہ گویا کلمۂ باقیہ ہے۔ اللہ کریم منظور و مقبول فرمائے اور اپنے مقبولانِ بارگاہ کے طفیل اہلِ انصاف اور اربابِ دانش کو اس کے ذریعے ہدایت بخشے اور مجھ غریب کو جزائے خیر سے نوازے آمین ثم آمین!

وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ ۝

بعض ناموں کی بحث

پیر صاحب سیالوی نے لگے ہاتھوں وہ عامیانہ، فرسودہ اور سینکڑوں بار کا مردود اعتراض بھی جڑ ہی دیا کہ ائمہ معصومین نے اپنے فرزندوں کے نام ابوبکر، عمر اور عثمان رکھے (تا)، بھلا ان اللہ کے بندوں کو کون سمجھائے کہ ناموں میں کیا رکھا ہے، مطلب مسمیٰ سے ہے نہ کہ اسم سے ؎

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا !
غوّاص کو گوہر کی طلب ہے، نہ صدف کی

۱۔ یہ محض تنگ نظر مُلاؤں یا جاہل عوام کا خیال ہے کہ جس شخص سے کوئی کد و کاوش ہو، اس کے نام پر نام نہیں رکھنا چاہیے۔ ہادیانِ خلائق ان کی طرح تنگ نظر نہیں ہوتے۔

۲۔ بفرضِ تسلیم اس امر کی کیا دلیل ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اصحابِ ثلاثہ کو ہی پیشِ نظر رکھ کر اپنے صاحبزادوں کے نام تجویز فرمائے ہوں۔ آپ کے بعض مخلصین اور بعض اجداد کے نام بھی اسی طرح تھے۔

۳۔ اہل السنّت کے کئی اعاظم علماء اور اکابرین کے نام عبدالرحمٰن اور یزید ہیں جیسے محمد بن جریر بن یزید طبری، تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل السنّت کو قاتلانِ ائمہ سے محبت ہے جو جواب تمہارا، وہی جواب ہمارا۔ (ص ۱۷۶ تا ۱۷۸)

تحفۂ حسینیہ : از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

ڈھکو صاحب کی ائمہ اہل بیت کے حق میں دریدہ دہنی

جواب الاوّل: علامہ صاحب نے اللہ تعالیٰ کے غضب و عقاب کے مستحق افراد

کے ناموں سے احتراز اور اجتناب کو تنگ نظر مُلاؤں اور جاہل عوام کا خیال قرار دیا اور داناؤں اور غواصانِ بحرِ حقیقت و معانی کے اس نظریہ سے دُور ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے شیعی کتب کا حوالہ دیا اور ائمہ کرام کا فرمان نقل کیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے نزدیک وہ دانائی سے محروم تھے اور ہادیانِ خلائق اور غواصانِ بحرِ حقیقت نہیں تھے، بلکہ جاہل عوام اور تنگ نظر ملاؤں میں داخل تھے۔ نعوذ باللہ منہ۔ کیا یہی شانِ تحقیق و تدقیق ہے جس کے تحت اس استدلال کو سینکڑوں بار کا مردود اشکال قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ صاحب اب بھی اس کے تحقیقی اور واقعی جواب سے تہی دامن نظر آتے ہیں اور عاجز و بے بس۔ کیا صرف اسلاف کی تقلید میں تبرّا کر دینا ہی جواب بن جاتا ہے؟ ڈھکو صاحب تمہارا فرض تھا کہ ان روایات اور حوالہ جات کا جواب دیتے اور ائمہ کرام کے حکم اور اس کی بنیاد اور دار و مدار کو سامنے رکھ کر اس روایت کی موزوں توجیہہ و تاویل کرتے، مگر جناب نے روایت کے بارے میں اور امام ابوالحسن موسیٰ کاظم اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہما کے حکم کو سُنا ان سنا اور دیکھا ان دیکھا کر کے صرف سوقیانہ اور جاہلانہ طریق کار اپنا لیا ہے۔ اچھے نام رکھنا شرعاً لازم ہے اور بُرے ناموں سے احتراز ضروری ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں پر نام رکھنے کا یا ایسے نام رکھنے کا سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور اس کی ترغیب دی جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف عبدیت کی نسبت موجود ہو اور جس نام میں کوئی قباحت والا پہلو ہوتا، اس کو خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بدل دیتے تھے جیسے کہ کتبِ حدیث میں تصریح موجود ہے، تو ڈھکو صاحب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم اور طرزِ عمل پر بھی یہی پھبتی کسیں گے؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہی فتویٰ لگائیں گے جو انہوں نے ائمہ کرام پر لگایا ہے۔ اصل عبارت ملاحظہ کریں۔

عن یعقوب السراج قال دخلت علی ابی عبد اللہ علیہ السلام وھو واقف علی راس ابی الحسن موسٰی وھو فی المھد فجعل

یسارہ طویلا فجلست حتّٰی فرغ فقمت الیہ فقال لی ادن من مولاک فسلم علیہ فدنوت منہ فسلمت علیہ فرد علیّ السّلام بلسان فصیح ثم قال لی اذھب فغیر اسم ابنتک الّتی سمیتھا امس فانہ اسم یبغضہ اللہ وکانت ولدت لی ابنۃ سمیتھا بالحمیراء فقال ابوعبد اللہ علیہ السلام انتہ الیٰ امرہ ترشد فغیرت اسمھا (اصول کافی ج۲ ص۱۹۲ کشف الغمہ ج۲ ص۲۲۱ مطبع جدید۔ ارشاد مفید مع ترجمہ فارسی جلد ثانی ص۲۱۱ مناقب ابن شہر آشوب۔ جلد رابع ص۲۸۷)

ترجمہ: یعقوب سراج سے مروی ہے کہ میں حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، جبکہ آپ اپنے صاحبزادے حضرت ابوالحسن موسیٰ کاظم کے سر پر کھڑے تھے اور وہ پنگھوڑے میں تھے۔ آپ بڑی دیر تک ان کے ساتھ سرگوشی فرماتے رہے اور راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے، تو میں (یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک طرف بیٹھ گیا) یہاں تک کہ آپ فارغ ہوگئے تو میں اُٹھ کر آپ کے پاس گیا، تو آپ نے مجھے فرمایا کہ اپنے مولیٰ کے قریب جاؤ اور انہیں سلام پیش کرو۔ چنانچہ میں نے قریب جا کر سلام عرض کیا، تو آپ نے فصیح زبان کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر مجھے حکم فرمایا جاکر اپنی بیٹی کا وہ نام تبدیل کردے جو تو نے کل رکھا ہے، کیونکہ وہ ایسا نام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ مبغوض رکھتا اور ناپسند فرماتا ہے اور حقیقتِ حال یہ تھی کہ میری ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی، جس کا نام میں نے (امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لقب کے مطابق) حمیرا رکھ دیا تھا (جب حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ عالمِ مہد میں ہوتے ہوئے یہ حکم دے چکے) تو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان کے حکم پر ہی اکتفا کرو اور عمل کرو اور اسی کو حرفِ آخر سمجھو تو ہدایت پا جاؤ گے۔ چنانچہ میں نے اُس کا نام بدل دیا۔

تبصرہ: متعدد شیعی کتب میں مذکور و منقول اس صحیح ترین روایت سے یہ

حقیقت واضح ہوگئی کہ ناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ائمہ کرام نے بڑے ہو کر بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا اور نہ عالمِ مہد اور شیر خوارگی میں، لہٰذا اس کو جاہل عوام اور تنگ نظر ملاؤں کا خیال قرار دینا ان دونوں ائمہ کی شان میں کھلی گستاخی اور بے ادبی ہے، بلکہ سب ائمہ کرام کی شان میں گستاخی ہے، کیونکہ علامہ ڈھکو صاحب کے دعویٰ کے مطابق ان میں سے جو ایک کا نظریہ ہے، وہی سب کا نظریہ ہے تو اس مسئلہ اور نظریہ پر بارہ ائمہ کرام کا اتفاق ثابت ہوگیا اور ظاہر ہے کہ ان کا راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے جُدا اور مختلف نہیں ہو سکتا اور جو نظریہ اور عقیدہ اور روش و طرزِ عمل رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، وہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ امر ہے اور اس کی مرضی و منشا تو گویا یہ ایسا نظریہ ہے، جس پر بارہ ائمہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خود اللہ تعالیٰ باہم متفق اور رضامند ہیں، تو اس کو جاہل عوام اور تنگ نظر مُلاؤں کا نظریہ اور عقیدہ قرار دینا اور حکماء و عقلاء کو اور ہادیانِ خلائق کو اس سے کوسوں دور قرار دینا اور غوّاصانِ بحرِ معانی کی سوچ کے منافی قرار دینا ائمہ کرام، رسولِ گرامی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اور اللہ تعالیٰ کے لیے ایسی گالی ہے، جو کوئی عام کافر بھی روا نہ رکھے گا ؎

گلیم بخت کسے کہ بافند سیاہ — بآبِ کوثر و تسنیم سفید نتواں کرد

یا تو ان مذہبی کتابوں کے متعلق تسلیم کرو کہ وہ کذب و افترا اور جھوٹ کے پلندے ہیں اور اگر روایت صحیح ہے تو پھر معقول جواب دو، صرف شاعری سے تو کام نہیں چل سکتا اور نہ ہی محض تبرّا بازی سے خلاصی حاصل ہو سکتی ہے۔

تنبیہ: اس روایت کو ائمہ کرام کے دلائلِ امامت اور معجزات کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ بچپن اور عالمِ طفولیت و شیر خوارگی میں بھی اس قدر عالمِ غیب ہوتے ہیں اور شرعی احکام کے ماہر تو حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے اس معجزہ اور دلیلِ امامت کو نظر انداز کرنا قطعًا ممکن نہیں، ورنہ ان کی امامت ہی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ نیز منصبِ امامت سے قطعِ نظر اس عالم میں آپ کا یہ حکم دینا گویا تقاضائے فطرت ہے اور ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، بعد ازاں ماحول اور معاشرہ کی وجہ سے اس کے نظریات بدلتے ہیں، تو گویا تقاضائے فطرت

اسلام بھی یہی ہے اور معجزۂ امامت کا بھی یہی حکم ہے اور یہی نظریہ و عقیدہ ہے تو اب سُنیوں کے استدلال سے گھبرا کر اور خلفاء ثلاثہ کی عظمت کا سورج طلوع ہوتا دیکھ کر بصارت و بصیرت سے بیگانہ ہوتے ہوئے کہہ دینا یہ تو جاہل عوام کا خیال ہے اور تنگ نظر ملاؤں کا اور یہ تو بے بصیرت اور عقل و حکمت سے عاری لوگوں کا عقیدہ و نظریہ ہے تو یہ محض سینہ زوری ہے اور جواب سے عاجزی اور بے بسی کی منہ بولتی دلیل۔

جواب الثانی : ڈھکو صاحب فرماتے ہیں بغرضِ تسلیم اس امر کی کیا دلیل ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اصحابِ ثلاثہ کو پیش نظر رکھ کر ہی اپنے صاحبزادوں کے نام تجویز فرمائے تھے الخ تو جواباً عرض ہے :

۱۔ شیعہ حضرات بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اس سنّت پر عمل کرتے ہوئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مخلصین یا آپ کے اجداد کے ناموں کی نیت پر ہی یہ نام رکھ لیں اور اگر ان کا سبائی مزاج اور زرتشتی طبیعت اس کو گوارا نہیں کر سکتی، تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسی تاویلات اور قلبی ارادے اور نیّات اس طبعی غیظ و غضب کے سراسر منافی ہیں اور ایسے نام تجویز کرنا ایسی تاویل سے بھی شیعی شریعت میں روا نہیں ہو سکتا۔

۲۔ دیکھیے عبدالرحمٰن کے نام میں عبدیت کا اظہار بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت رحمٰن کی طرف اس میں اضافت بھی ہے اور ابن ملجم لعین کے علاوہ سینکڑوں حضرات کا یہ نام بھی تھا جو صحابۂ رسول تھے یا اکابرینِ اسلام، لیکن عبداللہ مامقانی صاحب تنقیح المقال ص ۱۴۲ ج ۲ پر لکھتے ہیں : انّ التسمیة به مکروهة۔ یہ نام رکھنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن الحجاج مخلص شیعہ تھا لیکن امام ابوالحسن فرماتے ہیں : انه لیثقل علی الفؤاد۔ یہ نام دل پر گراں گزرتا ہے اور ناقابلِ برداشت ہے، کیونکہ ابن ملجم کا نام یہی تھا جیسے کہ عبداللہ مامقانی صاحب نے وجہ ثقل میں اس توجیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

الغرض صاف ظاہر اور واضح ہو گیا کہ مخلصین و مقربین اس قسم کے ناموں والے ہوں پھر بھی نظر دشمن کی دشمنی پر رہتی ہے۔

۳۔ جب شیعہ یعقوب سراج کو نام تبدیل کرنے کا حکم دیا تھا، تو اُس نے کب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لقب سے برکت حاصل کرنے کے لیے یہ نام رکھا ہوا تھا۔ اُس نے بھی لامحالہ کسی دوسری مناسبت کو ملحوظ رکھ کر یہ نام تجویز کیا ہو گا، مگر وہ عذر قابلِ قبول نہ رہا اور عالمِ طفولیت میں بھی امام کو یہ گوارا نہ ہوا، لہٰذا آپ نے اپنی نانی صاحبہ اور امّ المومنین والا نام فوراً بدلنے کا حکم دیا۔

۴۔ علاوہ ازیں جب معروف اسماء انہی خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے تھے اور ان کی عظمتوں کے قصائد بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زبانی نہج البلاغہ، ابن میثم اور شافی و کافی وغیرہ سے ذکر ہو چکے، بالخصوص ان کا اس تمام امت سے افضل ہونا اور ان کے وصال کا اسلام کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا اور ان کا حضور سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آنکھ، کان اور دلِ مقدس کی مانند ہونا، تو انہیں ناموں کے ساتھ اولادِ گرامی کو موسوم کرنا، ان سے محبت و تعلق کی دلیل ہے اور اولاد کے لئے نیک فال اور تبرک کی جب ظاہر حال کا مقتضیٰ یہی ہے اور اس سے عدول کی کوئی وجہ موجود نہیں، تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا ضروری ٹھہرا کہ آپ نے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے اسماء مقدسہ پر ہی اپنے فرزندوں کے یہ نام رکھے تھے اور ایسے ہی دیگر ائمہ کرام نے بھی۔

جواب الثالث : ڈھکو صاحب فرماتے ہیں، اہل السنت کے کئی اعاظم اور اکابر کے نام عبدالرحمٰن اور یزید ہیں تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ اہل السنت کو قاتلانِ ائمہ سے محبت ہے الخ یہ جواب بھی بوجوہ بے موقعہ و بے محل اور لغو و باطل ہے۔

اوّل : آپ پر اپنا دامن صاف کرنا لازم ہے۔ آپ کے مذہب اور ائمہ کرام کی طرف منسوب روایت کے ساتھ استدلال کر کے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے ثابت کیا کہ ان حضرات کا مقام و مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسولِ معظّم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عظیم ہے۔ اس کا جواب تحقیقی انداز میں ملنا چاہیے تھا کہ روایت موضوع ہے یا کتاب ناقابلِ اعتبار ہے وغیرہ وغیرہ

مگر افسوس کہ ڈھکو صاحب نے قطعاً کوئی ایسا اشارہ ہی نہیں دیا، بلکہ یہ بھی نہیں ظاہر ہونے دیا کہ ایسی کوئی روایت واقعی ان کی مستند کتب میں منقول ہے یا نہیں۔

اپنی اس قدر معتبر و مستند اور صحیح ترین کتاب میں حضرت ابو الحسن کے معجزہ اور کرامت کے طور پر مذکور روایت کا تحقیقی جواب دیئے بغیر الزامی جواب دینا قطعاً روا نہیں تھا۔ الزامی اور جدلی انداز اس صورت میں درست ہوتا، جب ہماری مذہبی کتب میں بھی کوئی ایسی روایت موجود ہوتی اور جب نہیں ہے، تو پھر یہ جدل اور الزام سراسر لغو اور باطل ہو گیا۔

دوم: علامہ صاحب جواب میں اس قدر بوکھلا گئے ہیں کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اہل السنت کے اعاظم اور اکابر کے نام عبدالرحمن اور یزید ہیں اور نام گنواتے وقت محمد بن جریر بن یزید طبری کو ذکر کر دیا۔ اس مدہوش اور مخمور ڈھکو صاحب سے کوئی یہ پوچھے کہ یزید طبری اعاظم اور اکابر علماء اہل السنت سے ہے یا اس کا پوتا محمد طبری؟ آخر اتنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کیوں طاری ہو گئی کہ پوتے اور دادے میں فرق ہی نظر انداز ہو گیا۔ اسی طرح جابر بن یزید کو بھی اس ضمن میں ذکر کر دیا ہے، حالانکہ یہ شخص شیعہ کا تقیہ باز محدث ہے اور یہاں بھی وہی خبط کار فرما ہے، محدث و عالم جابر جعفی ہے نہ کہ اس کا باپ یزید۔

سوم: ان ناموں کے تجویز کرنے والے ائمہ کرام نہیں تھے اور نہ اکابرین اہل بیت وہ تو عامی قسم کے لوگ تھے، ان کے اقدام کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کرام کے تعامل سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ ان کا عمل غلط اور نامناسب بھی ہو سکتا ہے؟ تو اس کو بنیاد بنا کر حضرت امام جعفر صادق اور حضرت ابو الحسن موسیٰ کاظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حکم کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ الغرض حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کرام کے تعامل کو اس روایت کے پس منظر میں دیکھیں، تو یقیناً ایسے ناموں کا ائمہ اہل بیت کی طرف سے رکھا جانا اور وہ بھی امام زادوں کے لئے تو یہ ان ناموں کے تقدس اور ان مقدس نام والوں کی عظمت خداداد کی بہت بڑی دلیل ہے اور اس کو فرسودہ اور سینکڑوں بار کا مردود اشکال قرار دے دینا سراسر دھاندلی اور سینہ زوری ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعی علماء کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

مزعوم مخالفوں کے اسماء کے ساتھ موسوم لوگوں کے ساتھ شیعہ کا سلوک

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے اس ضمن میں سرگودھا کے ایک ڈاکٹر صاحب کا واقعہ ذکر فرمایا تھا، جس کے جواب میں علامہ موصوف نے بڑا جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس کی تردید کرنے کی ناکام کوشش فرمائی اور کہا:

تنزیہہ الامامیہ — از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

مؤلف کا لطیفہ یا کثیفہ

۱۔ ظاہر ہے کہ موصوف کا اشارہ شرافت پناہ ڈاکٹر سید حاذق شاہ کی طرف ہے اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے: سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں سے ہر مذہب اور ملت کے اور ہر نام کے لوگ شفا پاتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دیدہ سے شرم و حیاء کا آخری قطرہ بھی ڈھلک گیا ہے، جب ہی تو ان کو تہمت تراشی اور الزام سازی میں ذرا بھر جھجک محسوس نہیں ہوتی اور وہ بھی ان واجب الاکرام سادات کرام پر جن کے متعلق پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے اکرموا اولادی الصالحون للہ والطالحون لی۔

۳۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے رابطہ پیدا کیا تو انہوں نے کہا پیر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہم نام تو کیا خود اصحاب ثلاثہ بھی میرے پاس بغرض علاج آئیں تو میں صحیح علاج میں بخل نہیں کروں گا۔

(رسالہ تنزیہہ الامامیہ ص ۱۷۸ تا ص ۱۷۹)

عادتِ معروفہ کا انکار صرف تقیہ کے پردوں میں ہی ہو سکتا ہے

۱۔ علامہ صاحب نے اس کو لطیفہ یا کثیفہ سے تعبیر فرمایا اور بہتانِ عظیم قرار دیا اور ڈاکٹر نقی شاہ صاحب کے اپنے قول کا حوالہ بھی دیا، لیکن تقیہ شریفہ اگر ایسے مواقع پر کام نہ دے، تو پھر اس کے ایجاد کرنے کا مقصد ہی کیا ہو سکتا ہے اور اس کا فائدہ ہی کیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شیعی شریعت میں اپنے شیعوں سے بھی تقیہ اسی طرح لازم، جس طرح غیر شیعہ سے ضروری ہے جیسے کہ معروضِ خدمت ہو چکا کہ ائمہ کرام شیعہ کی محفلِ مخصوصہ میں اچھے بھلے نامی گرامی محدث کو رگید دیتے اور اسے یہود و مجوسی اور اربابِ تثلیث سے بھی بدتر قرار دے دیتے تھے، حالانکہ بقولِ شیعہ قلبی طور پر انہیں رئیس المحدثین اور علومِ اہل بیت کے امین سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر علامہ ڈھکو صاحب ہم سے تقیہ کر رہے ہیں اور حاذق نقی صاحب نے ان سے تقیہ کیا ہو تو اس میں اپنے مذہب اور دھرم کی رُو سے دونوں نے ثواب کمایا اور بلند درجہ پایا، مگر جن غریبوں کے تن بدن پر گزری ہے، آخر ان کی بات بھی تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے ایسے ستم رسیدہ لوگوں کا بیان بعض دوستوں کے حوالے سے نقل کیا تھا، لہٰذا اس میں آپ کی ذات کو موردِ الزام ٹھہرانے کا کیا جواز ہے؟ اور اس دریدہ دہنی کا کیا موقع و محل ہے؟

۲۔ علامہ صاحب اگر اس پر اعتبار نہیں کرتے، تو میں ان کو صدیوں پرانی کتابوں کے آئینہ میں ان کا اصلی چہرہ دکھلا دیتا ہوں اور اس امر کی وضاحت و صراحت دکھلا دیتا ہوں کہ اصحابِ ثلاثہ اور دیگر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وعلیہم وسلم کے نام سُن کر وہ کس قدر بد حواس ہو جاتے تھے اور ان کا ردِ عمل کتنا شدید ہوتا تھا۔

۱۔ ابن علقمی کا وظیفہ خوار اور بندۂ درگاہ ابن ابی الحدید معتزلی شیعی اپنی معروفِ زمانہ شرح نہج البلاغہ میں رقمطراز ہے (ص ۳۷۱ ج ۱۹)

كان صاحب ربيع يتشيع فارتفع اليه خصمان اسم احدهما على واسم الاخر معاوية فانحنى على معاوية فضربه مائة سوط من غير ان اتجهت عليه حجة ففطن من اين اتى فقال اصلحك الله سل خصمى عن كنيته فاذا هو ابو عبد الرحمن وكانت كنية معاوية بن ابى سفيان فبطحه وضربه مائة سوط فقال لصاحبه ما اخذته منى بالاسم استرجعته منك بالكنية۔

ترجمہ: ربیع وزیر شیعہ مذہب رکھتا تھا، اس کے پاس دو شخص اپنے جھگڑے میں فیصلہ کرانے کے لیے آئے، جن میں سے ایک کا نام علی اور دوسرے کا معاویہ تھا تو وزیر نے معاویہ کے خلاف شہادت اور ثبوت مہیا ہوئے بغیر ہی اس کو سو کوڑے لگا دیئے۔ جب اس کو یہ سمجھ آگئی کہ میرے ساتھ یہ ناروا اور غیر منصفانہ سلوک کیونکر ہوا ہے، یعنی معاویہ نام کی وجہ سے، تو اس نے ربیع سے کہا میرے مدمقابل اور خصم کی کنیت تو دریافت کرو اور اس کی کنیت ابو عبد الرحمن تھی جو کہ امیر معاویہ کی کنیت تھی، تو اس نے اسے بھی زمین پر لٹا کر سو کوڑے لگا دیئے، تو معاویہ نام والے شخص نے دوسرے سے کہا جو کچھ تو نے مجھ سے میرے نام کی وجہ سے حاصل کیا تھا، وہ میں نے تیری کنیت کے ذریعے واپس لے لیا ہے۔

فرمایئے ڈھکو صاحب! ناموں میں کچھ رکھا ہے یا نہیں؟ اور مخالفین کے نام سُن کر آپ کے اسلاف کے ہوش و حواس اور عدالت و انصاف اور امانت و دیانت کس طرح رخصت ہو جاتے تھے اور مدعی، مدعا علیہ دونوں کو کس طرح غیظ و غضب کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔

۲۔ قاضی نور اللہ شوستری صاحب نے مجالس المومنین میں ذکر کیا ہے:

در بعضے رسائل ملا عبید زاکانی مذکور است کہ شخصے دراز گوشے در کاشان بفروخت تمغاچی خواست کہ کاغذ تمغا نویسد پرسید کہ چہ نام داری؟ گفت ابوبکر گفت پدرت؟

گفت عمر، گفت جدّت ؟ گفت عثمان، تمغاچی متحر و فرومانده شد و گفت چہ نویسم، دلال گفت گہی میخورد بنویس خداوند خردیزہ الخ مجالس المومنین جلد اوّل ص۸۷ و ص۸۸)

یعنی ملا عبید زاکانی کے بعض رسائل میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے کاشان میں ایک دراز گوش کو فروخت کیا۔ رسید لکھنے والے نے رسید لکھنا چاہی تو اس فروخت کنندہ سے نام دریافت کیا اُس نے کہا ابوبکر، اُس نے پوچھا تیرے باپ کا نام ؟ تو اس نے کہا عمر! اُس نے پوچھا تیرے دادے کا نام ؟ تو اُس نے کہا عثمان! تو سندِ راہداری لکھنے والا حیران اور ششدر رہ گیا اور لکھنے سے عاجز اور قاصر ہو کر کہنے لگا کیا لکھوں ؟ دلال نے کہا تو بھی گھاس کھاتا ہے یوں لکھ دے خاکستری رنگ والے گدھے کا مالک۔

علامہ صاحب دیکھا آپ نے ان اسماء کی ہیبت و جلالت کہ سن کر ہی ہوش و خرد گم ہو جاتے ہیں اور عقل و فکر کام ہی نہیں کرتی تھی اور ہاتھ بھی لکھنے سے عاجز و قاصر ہو جاتے تھے، تو اندریں حالات اگر حاذق نقی صاحب کے ہاتھ ہی کام نہ کریں اور تحیر و فرماندگی غالب آجائے اور آپریشن خود بخود بلا قصد اور بلا ارادہ ہی ناکام ہو جائے، تو یہ امر بعید از قیاس نہیں اور اس کو ارادی جرم بھی قرار نہیں دے سکتے، لہٰذا دونوں فریق کو سچا سمجھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

رہ گیا نقی صاحب کا یہ دعویٰ کہ اصحابِ ثلاثہ خود آجائیں، تو بھی علاج میں بخل نہیں کروں گا، تو ہمیں اس پر بھی اعتراض کی چنداں ضرورت نہیں، صرف ان کی مجبوری اور معذوری دکھلانے سے غرض ہے اور جن کے نام سُن کر عقل و خرد اور اعضاء ساتھ چھوڑ جائیں، خود ان کی آمد پر حال کیا ہو گا ؟ وہ تو بیان سے بھی باہر ہے اور وہم و گمان سے بھی بالاتر ہے۔

۳۔ سیّد نعمت اللہ الجزائری نے انوارِ نعمانیہ جلد رابع ص۱۱۸ پر لکھا ہے کہ علاقہ قزوین میں ایک دیہات ہے جہاں شیعہ اپنے تشیع میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان پر ایک شخص کا گزر ہوا، جس کا نام عمر تھا، جب انہیں اس کا نام معلوم ہوا تو انہوں نے اس کو خوب مارا پیٹا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ اسے محض نام کی وجہ سے مار پڑی ہے تو اُس نے کہا میرا نام عمر نہیں بلکہ عمران ہے، تو انہوں نے پھر پٹائی شروع کر دی اور کہا،

ھٰذہ اشد من الاول فانہ عمر و فیہ حرفان من عثمان فھو احق بالضرب - یہ تو پہلے کی نسبت بھی پٹائی کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ عمران عمر کی نسبت زیادہ شدید ہے، کیونکہ عمر بھی اس میں ہے اور مزید برآں یہ الف نون عثمان کے نام سے اس میں آگئے ہیں۔ وکذا فی مجالس المومنین جلد اوّل ص۸۵

دیکھا علامہ صاحب عمر کے نام سے کس قدر تمہارے شیعہ ممتحنین کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ اس نام والے کی کیا درگت بناتے ہیں اور عمران والا نام بتلانے پر بھی خلاصی نہیں ہوتی اور یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ ہو سکتا ہے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد کا نام ہو یا حضرت مریم کے والد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا جان کا یا بقول بعض اہل تشیع جناب ابو طالب کا اصلی نام ہو، بلکہ صرف اور صرف یہی سوجھتا ہے کہ اس کا نام عمر ہے اور مزید حصّہ عثمان کے نام کا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کا نام سنتے ہی شیعہ کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور ان کی سوچ و فکر کی ساری صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں تو ایسے میں اگر آنکھوں کے آپریشن کرنے والے خالص و مخلص شیعہ ہوں تو کتنے ہی اس قسم کے نام والے لوگوں کو آنکھوں سے ہی محروم ہونا پڑے گا۔ لہٰذا علامہ ڈھکو صاحب کا عذر ناقابلِ قبول ہے اور واقعات و حقائق سے اس کو دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ناموں میں کچھ رکھا ہے یا نہیں ؟

علامہ ڈھکو صاحب نے فرمایا: "ان اللہ کے بندوں کو کون سمجھائے کہ ناموں میں کیا رکھا ہے، مطلب مسمّٰی سے ہے نہ کہ اسم سے۔"

علامہ موصوف بڑے بھولے اور سادہ لوح ہیں یا بڑے شاطر رافضی ہیں، جس مذہب کے وہ مجتہد العصر اور حجۃ الاسلام ہیں، اس کا دارو مدار ہی ناموں پر ہے اور اس کے بانیوں کا سارا کاروبار ہی انہیں اسماء سے چلتا ہے، محبت کا اظہار ہو یا عداوت اور دشمنی کا ہر دو میں صرف اسماء پر ہی دارو مدار ہے جیسے کہ مشرکین عرب کا

حال تھا کہ بتوں کو انبیاء و اولیاء کرام کے نام دے دیئے اور ان کی پوجا پاٹ شروع کرلی اور بنی اسرائیل نے بچھڑے کو الٰہِ موسیٰ کا نام دے کر سجود و نیاز ادا کرنے شروع کرلئے ایسے ہی شیعہ حضرات نے چند لکڑیاں جوڑ کر اور سرخ و سفید اور نیلے پیلے کاغذ لگا کر اسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ قرار دے دیا۔ سفید گھوڑے کو امام پاک کا ذوالجناح اور سرخ رنگ چھڑکی ہوئی چادر کو آپ کی خون آلود چادر قرار دے دیا وغیر ذالک من الخرافات اور پھر ان کے ساتھ اصلی اشیاء کی طرح تعظیم و تکریم اور سجود و نیاز وغیرہ بجا لانا ایسے حقائق ہیں جو کسی چشم بینا سے مخفی نہیں ہیں، لہذا اظہارِ محبت میں بھی صرف ناموں پر دارو مدار رہا۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ

اسی طرح بغض و عناد، غیظ و غضب اور کینِ قلب کے اظہار کے لیے بھی شیعہ حضرات انہیں ناموں کا سہارا لیتے ہیں — قاضی نور اللہ شوستری مجالس المؤمنین جلد اوّل ص۸۷ پر رقمطراز ہیں: **ابولولو مجوسی کا عرس اور توہین فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ**

بالجملہ عوام و اوباشِ شہرِ کاشان در روز بست و ششم ذی الحجہ کہ روزِ قتل عمر است صورتے از خمیر میسازند و شکم اُورا از دوشاب سُرخ پر میگردانند و اُورا عمر نام می نہند آنگاہ اورا برداشتہ بحرکت در رقص درمیاورند و مقارنِ آں حرکت طبل و دہل وغیر آں از آلاتِ لہو بکار می بُرند و در طعن و لعن عمر مبالغہ بسیار بجائے آوردہ فریاد و ولولہ بسیار میکنند و از اول روز تا آخر باین کیفیت می گذارند چوں شب در رسد و میخواہند کہ از سرِ مزار بابائے مذکور (ابولولو مجوسی) بخانہائے خود مراجعت کنند بعضے ازاراذل و اوباش کارد ے یا خنجرے بر شکم آں صورت میزنند تا دوشاب از شکم او بیروں آید پس آں جماعت آں دوشاب را از جہت اظہار آنکہ بخون عمر تشنہ ایم میخورند۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کاشان کے عوام اور اوباش ذوالحجہ کی چھبیس تاریخ کو جو کہ حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے قتل (شہادت) کی تاریخ ہے۔ اس میں آٹے کا ایک مجسّمہ تیار کرتے ہیں اور اس کے پیٹ کو سُرخ دوشاب اور شیرہ سے پُر کرتے ہیں اور اس مجسمے کا نام عمر رکھتے ہیں، پھر اس مجسّمے کو ہلاتے ہیں اور اٹھا کر وجد و رقص کرتے ہیں

اور اسی دوران ڈھول طبلے اور دیگر آلاتِ لہو استعمال کیے جاتے ہیں اور (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) پر حد سے زیادہ سب و شتم اور لعن طعن کرتے ہیں اور ساتھ ہی فریاد اور زاری اور آہ و بُکا کرتے ہیں اور صبح سے شام تک تمام دن اسی حال میں گزارتے ہیں۔ جب رات کی تاریکی چھانے لگتی ہے اور گھروں کی طرف واپسی کا ارادہ کرتے ہیں اور بابائے مذکور یعنی ابولولو مجوسی کی قبر سے رخصت ہونے لگتے ہیں، تو ان میں سے بعض اراذل اور اوباش چھری یا خنجر لے کر اس مجسّمہ کے پیٹ میں گھونپ دیتے ہیں تا آنکہ وہ سُرخ دوشاب اور شیرہ اس مجسّمہ کے پیٹ میں سے باہر نکلنے لگتا ہے، پھر وہ اس کو عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کا خون سمجھ کر پیتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہم ان کے خون کے پیاسے ہیں۔

تبصرہ: علامہ ڈھکو صاحب ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ شیعہ مذہب میں ناموں پر دارو مدار ہے یا نہیں؟ اگر خود مجسمے بنا کر اور ان کا نام عمر رکھ کر غصّہ نکالا جا سکتا ہے، تو بنے بنائے مجسّمے جو ان ناموں کے ساتھ موسوم ہوں اور خود بخود چل کر آ جائیں اور فیس کے حصول کے ساتھ ساتھ دل کی بھڑاس اور غیظ و غضب نکالنے کا موقع بھی مل سکے تو اس سنہری موقعہ کو ہاتھ سے گنوانا بہت بڑا تکلیف دہ امر ہوگا اور ناقابلِ برداشت خسارہ۔

نیز قاضی شوستری صاحب نے صرف کاشان کے اوباش اور عوام کا ذکر کیا ہے، تو یہ محض تفنن ہے اور استہزائی انداز، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کاشان کیا سارے جہان میں، جہاں جہاں بھی شیعہ ہیں عوام ہوں یا خواص یا اخص الخواص وہ سبھی اس رذیل حرکت اور کمینگی میں برابر کے حصّہ دار ہیں۔ آخر شوستری صاحب ہی بتلائیں کہ کاشان کے علماء اور خواص اور حکّام ایسے اوباشوں کو کیوں لگام نہیں دیتے تھے اور انہیں ہر سال ایک مجوسی کو بابا شجاع الدّین کا لقب دے کر اور اس کی فرضی مزار پر عرس منانے کی اجازت کیسے دی جاتی تھی، وہ مجوسی تو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی پاداش میں مدینہ منوّرہ میں ہی قتل ہو گیا تھا، اس کا مردار کاشان کیسے پہنچ گیا اور وہ شجاع الدّین کیسے بن گیا اور اس کی تعظیم و تکریم کی اجازت کیسے مل گئی اور ہر سال یہ ناٹک رچانے کا موقعہ ان اوباشوں

کو کیسے مل گیا۔ اگر شیعہ کو یہاں موقع ملے تو کاشان والوں سے بھی بڑھ کر حرکات بد کا مظاہرہ کریں۔ اگر ان کے اندرونی تلاطم کا اظہار نہیں ہو رہا ہے تو صرف اہل السنت کی شدید مزاحمت کے ڈر سے اور کبھی کبھار کہیں نہ کہیں رؤسا تے شیعہ علانیہ اس بغض و کینہ کا اظہار کر بھی لیتے ہیں جیسے کہ چند سال قبل حسو بلیل ضلع جھنگ میں ایسی ہی کمینہ حرکت اور رذالت کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا علامہ ڈھکو صاحب کی یہ شاعری بالکل غلط ہے اور خلافِ واقعہ ہے کہ ؎

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا !
غواص کو گوہر کی طلب ہے نہ صدف کی

علامہ موصوف نے حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ کے لطیفہ پر سخت برہمی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں کے دیدہ سے شرم و حیاء کا آخری قطرہ بھی ڈھلک گیا ہے، جب ہی تو تہمت اور الزام تراشی میں ذرا جھجک محسوس نہیں ہوئی، حالانکہ آپ نے تو بعض لوگوں کی آپ بیتی بیان فرمائی اور نقل و حکایت تو کفر کی ہو تو بھی کفر نہیں ہوتی اور اس پر فردِ جرم عائد نہیں ہو سکتی، تو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے حق میں اس دریدہ دہنی کا کیا جواز تھا؟ ہاں البتہ مومن کی ذات دوسروں کے لیے مانندِ آئینہ ہوتی ہے، تو علامہ موصوف کو اپنی شکل ان کے آئینہ میں نظر آئی اور وہ واقعی ایسی ہی ہے، کیونکہ جو ایسے محسنینِ اسلام اور مقربانِ بارگاہِ رسالت و ولایت کے حق میں سب و شتم اور لعن و طعن سے کام لیں تو ان کے دیدہ میں شرم و حیا کے قطرات ہو ہی کیسے سکتے ہیں؟

علامہ موصوف نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں ہر مذہب و ملت اور ہر نام کے لوگ شفایاب ہوئے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی حکیم اور ڈاکٹر کے ہاتھوں سبھی مریض شفایاب نہیں ہوتے۔ ایسا مسیحائی کا دعویٰ کرنا سراسر غلط اور خلافِ واقعہ و نفس الامر ہے تو اگر حاذق علی شاہ صاحب کے ہاں علاج کے لیے آنے والوں میں چند ایک شفایاب نہ ہوتے ہوں، تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں، البتہ شفایاب نہ ہونے

والوں میں بالعموم وہی لوگ ہیں، جن کے نام خلفاء ثلاثہ والے ہوں اور تقی صاحب نے دیدہ دانستہ بھی ان کے خلاف یہ کارروائی نہ کی ہو، ناچاری اور بے بسی میں ہو گئی ہو تو محلِ تعجب نہیں اور ڈھکو صاحب کے استفسار پر اگر شاہ صاحب نے ایسے فرما دیا تو بھی ہمیں ان کی صداقت پر اعتراض نہیں، کیونکہ ان کے جذبات نیک ہوں گے مگر جب ہوش و خرد اور حواس و اعضا ہی وہ نام سن کر معطل ہو جائیں تو اس میں وہ بہر حال معذور ہوں گے۔ آخر کچھ بشری تقاضے بھی تو ہوتے ہیں، جیسے ہم کچھ نمونے بد حواسی کے عرض کر چکے ہیں۔

علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ ان کے دیدہ سے حیاء کا آخری قطرہ بھی ڈھلک چکا ہے، اسی لئے ان واجب الاکرام ساداتِ عظام پر تہمت تراشی اور الزام سازی میں انہیں ذرہ بھر جھجک محسوس نہیں ہوئی، جن کے متعلق پیغمبرِ اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ارشاد ہے، اکرموا اولادی الصالحون للہ والطالحون لی۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز ساداتِ کرام کا جتنا ادب بجا لاتے تھے، وہ ہر چشمِ بینا والے پر روزِ روشن کی طرح واضح اور آشکارا ہے، حتیٰ کہ وہ سادات جو اپنے اسلاف کے مذہب و مسلک سے برگشتہ ہو گئے اور آباؤ اجداد کی سیرت و کردار اور روش و رفتار کو ترک کر دیا، تو ان کے متعلق بھی فرماتے تھے کہ ان کو قرآن مجید کی منسوخہ آیات کی مانند سمجھو، نہ ان کی توہین و تحقیر جائز ہے نہ ان کی تقلید اور اتباع ہی درست ہے، لیکن یہ بتلانا کہ فلاں آیت منسوخ ہے اور ناقابلِ عمل، ان علماءِ کرام کا فرض ہے جو وارثانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے بھی اسی فرض کو ادا کرتے ہوئے یہ رسالہ لکھا اور اس فریضہ کو باحسن طریق ادا فرمایا اور ان ساداتِ کرام کو بھی اپنے آباؤ اجداد کا راستہ بتلایا اور عام اہلِ اسلام کو بھی صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا، کسی سید زادے کو اسلاف کی راہ بتلانا اور انحراف و عدول سے باز رہنے کی تلقین کرنا اور اپنے منصب و مقام کے خلاف اور غیر شائستہ حرکات پر تنبیہ کرنا صحیح خدمت اور اخلاص و نیاز کا

کامل اظہار ہے، اس کو شرم وحیاء کے خلاف قرار دینا یا تہمت تراشی اور الزام سازی قرار دینا سراسر غلط ہے۔ نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ضمن میں آپ کی سادات کرام سے دردمندانہ اپیل اور اپنے اخلاص ونیازمندی کا اظہار آپ کے الفاظ میں ملاحظہ کر لیں، تو آپ ہمارے اس قول کی تصدیق کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

اہل تشیع کا ساداتِ کرام کے ساتھ ادب و نیازمندی کا نمونہ

علامہ موصوف نے ساداتِ کرام کے واجب الاکرام والاحترام ہونے اور ان کے ساتھ اخلاص ونیاز کا بڑا دعویٰ کیا ہے۔ ذرا ان کی کتابوں میں جو ادب واحترام کے نمونے موجود ہیں، ان کا مشاہدہ کرتے چلیں۔ قاضی نور اللہ شوستری نے اپنی کتاب مجالس المومنین جلد اوّل ص۵۷۲ پر کہا ہے ؎

اذا العلوی تابع ناصبیا　　بمذهبه فما هو من ابیه
وانّ الکلب خیر منه طبعاً　　لان الکلب طبع ابیه فیه

یعنی جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرزند ہو کر سنّی مذہب کا پیروکار ہو تو وہ اپنے باپ کا نہیں ہے اور اس علوی اور سیّد سے تو کتّا بہتر اور برتر ہے، کیونکہ کتّے کے بچّے میں باپ کی خصلت اور طبیعت موجود ہوتی ہے۔

بتلائیے علامہ صاحب! یہی ادب و احترام ہے ساداتِ کرام واجب الاحترام والاکرام کا کہ ان کے حلالی ہونے کا بھی انکار کر دیا اور انہیں کتّے سے بھی بدتر قرار دے دیا۔ معلوم ہوا کہ تمہارے آنسو مگرمچھ والے اور دانت ہاتھی والے ہیں، اور محبّت صرف دعوؤں کی حد تک ہے اور ادب و احترام صرف کلام اور الفاظ کی حد تک اور بس۔

قبل ازیں کاملیہ شیعہ کا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر کفر کا فتویٰ کہ انہوں نے امامت وخلافت بلا فصل کا دعویٰ نہ کر کے کفر کا ارتکاب کیا اور واقفیہ بشیریہ کا حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے بعد والے ائمہ کرام پر کفر کا فتویٰ اور ان کے

نسب پر ردّ وقدح اور انکار واعتراض گزر چکا ہے۔ علاوہ ازیں ازواجِ مطہرات پر اعتراض کرنا تمام سادات پر بھی اعتراض ہے اور سیّد السادات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اور حضرت صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما کے نسب وحسب پر اعتراض بھی تمام سادات اور سیّد السادات صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کے مترادف ہے، تو وہ کس منہ سے ادب ونیاز کا دعویٰ کر سکتے ہیں ؎

اِتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

جن موجودہ شیعہ نظریات کے حامل سادات کو وہ سادات کرام کہتے ہیں اور واجب التعظیم والتکریم قرار دیتے ہیں، ان سب کے آباؤ اجداد دو تین پشت سے اوپر اہل السنّت والجماعت نظریہ وعقیدہ پر تھے۔ لہٰذا خود ہی بتلائیے کیا یہ سادات کرام ہیں؟ جبکہ تمہارے فتوے کے مطابق سُنّی سیّد حلالی نہیں ہے اور وہ کتّے سے بھی بدتر ہے، تو جب ان کے آباؤ اجداد سیّد ہی نہیں تھے تو اُن کی یہ اولاد سادات کرام کیسے بن گئی اور واجب الاکرام والاحترام کیونکر ٹھہرے؟

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین جلد اوّل ص۸۲ پر اپنے خواجہ حسن بن جعفر دُوریستی کا کلام نقل کیا ہے ؎

بغض الولی علامة معروفة　　کتبت علی جبهة اولاد الزنا
من لم یوال من الانام ولیه　　سیّان عند الله صلّی او زنی

یعنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا بغض معروف علامت ہے جو اولادِ زنا کی پیشانیوں پر لکھا جا چکا ہے اور ساری مخلوق میں سے جو شخص بھی علی ولی کی موالات نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے یہ دونوں عمل برابر ہیں کہ نماز پڑھے یا زنا کرے۔

اور کوئی شیعہ اہل السنّت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے ائمہ کرام علیہم الرضوان کا محب نہیں سمجھتا، کیونکہ اُن کے نزدیک حبِّ علی اور حُبِّ عمرؓ ایک دل میں یکجا ہو ہی نہیں سکتیں جیسے کہ نعمت اللہ محدّث جزائری انوارِ نعمانیہ جلد اوّل، ص۱۱۹ پر

تصریح کرتا ہے :

والعجب العجیب من جماعة المخالفین کیف احبوا علیًا وعمر وکیف جمعوا بین حبّ علی وعمر فی قلب واحد مع ان حبہما مما لایجتمعان ابدًا کما سیاتی تحقیقہٗ۔

جماعت مخالفین سے عجیب تعجّب ہوتا ہے کہ انہوں نے کیسے حضرت علی اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) دونوں سے محبت رکھی ہوئی ہے اور حضرت علی و حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کی محبّت کو کس طرح ایک دل میں جمع کر رکھا ہے، حالانکہ ان دونوں کی محبت ان امور سے ہے جو کبھی جمع نہیں ہوسکتے جیسے کہ عنقریب اس کی تحقیق آتی ہے۔

پھر اس موعود تحقیق کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ شیخ صالح جزائری نے شیخ بہاء الدّین عاملی کی طرف ایک ناصبی (سُنّی) کے یہ اشعار لکھ کر ان کا جواب اشعار میں ہی طلب کیا۔ سنّی نے کہا تھا ؎

اھوٰی علیا امیرالمومنین ولا	ارضٰی یسب ابی بکر ولا عمر الخ

یعنی میں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے محبّت رکھتا ہوں اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو سبّ و شتم کرنا پسند نہیں کرتا، تو اس کے جواب میں شیعہ کے عالم شیخ بہاء الدین نے درج ذیل اشعار لکھے ؎

یا یہا المدعیٰ حب الوصی ولم	تسمح بسب ابی بکر ولا عمرًا
کذبت واللہ فی دعوٰی محبتہ	تبت یداك ستصلیٰ فی غد سقرًا
فکیف تہوٰی امیرالمومنین وقد	اواك فی سب من عاداہ مفتکرًا
فان تك صادقا فیما نطقت بہ	فابرء الی اللہ ممن خان او غدرًا
لکن ابلیس اغواکم وصیرکم	عمیا وصمًّا فلا سمعًا ولا بصرًا

ترجمہ: اے علی وصی کی محبّت کا دعوٰی کرنے والے اور نہ گوارا کرنے والے ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی سبّ و شتم کو۔

بخدا تو نے اُن کے دعوائے محبّت میں جھوٹ بولا ہے۔ ہلاک ہوں تیرے ہاتھ اور عنقریب

داخل ہوگا تو دوزخ کی دھکتی ہوئی آگ میں۔

تو کیسے امیر المومنین سے محبت رکھ سکتا ہے، حالانکہ میں تجھے دیکھتا ہوں، اُن کے معاندین کی سب میں متفکّر اور پس و پیش کرنے والا۔

اگر تو اپنے دعوے میں سچّا ہے تو برآت کا اظہار کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خیانت اور بدعہدی کرنے والوں سے۔

یہ دعوائے محبّت نہیں، بلکہ حقیقت میں ابلیس نے تمہیں گمراہ کر دیا ہے اور تمہیں اندھا بہرا کر دیا ہے، پس نہ تمہارے کان ہیں اور نہ آنکھ۔

فائدہ: جزائری کی اس تحقیق سے واضح ہوگیا کہ اہل السنّت ان کے نزدیک ناصبی ہیں اور انہیں شیطان نے گمراہ کر رکھا ہے اور وہ حق دیکھنے اور حق کو سننے سے محروم ہیں اور ہلاکت ان کا مقدّر ہے اور وہ دوزخ کی دہکتی آگ کا ایندھن ہیں اور جو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہما کو سبّ و شتم اور تبرّیٰ نہ کرے، وہ محبِّ علی نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ دشمنِ اہلِ بیت کرام اور دشمنِ علی ولی ہے۔

اب اس پس منظر میں دیکھا جائے تو عوام اہل سنّت تو در کنار، پوری تیرہ صدیوں کے سادات لپیٹ میں آگئے۔ موجودہ سادات کرام تو ڈھکو صاحب کی نگاہ میں واجب الاکرام والاحترام ہیں، لیکن ان کے دو تین پُشت سے تمام آباؤ اجداد جو کہ خالص سُنّی تھے، ان تمام سادات کرام کا جو ادب پایا گیا اور ان کی جو توقیر و تعظیم کی گئی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ شیخ بہاؤالدین ان کو جہنّم واصل کر رہے ہیں، اندھے بہرے اور گونگے قرار دے رہے ہیں اور ابلیس کے چیلے وغیرہ وغیرہ، اور خواجہ شیعہ حسن ڈھکو بستی ان کو اولاد زنا قرار دے رہے ہیں اور ان کی نمازوں کو زنا کے برابر۔

عند الشیعہ مخالفین اولادِ شیطان ہیں

اگر ابھی عرقِ انفعال کی کوئی ادنیٰ بوند کسی شیعی کی پلک سے اٹھی نظر آرہی ہو تو

ہم اسے شیعہ کے شیخ صدوق کی علل الشرائع کا مطالعہ کراتے ہیں تاکہ یقین ہو جائے کہ شیعہ کے اتنے بڑے محدثین کی آنکھوں میں تو کجا ان کی پلکوں پر بھی حیاء کا قطرہ تو دور کی بات ہے' ادنیٰ بوند بھی نظر نہیں آتی۔ آپ نے عنوان یہ قائم کیا ہے۔

باب ان علۃ محبۃ أھل البیت علیھم السلام طیب الولادۃ وان علۃ بغضھم خبث الولادۃ۔ یعنی محبّت اہلِ بیت کی علتِ ولادت اور خمیر کی پاکیزگی اور طہارت ہے اور ان کے بُغض کی علت ولادت اور خمیر کا خبث اور ناپاکی ہے۔ پھر اس عنوان کے تحت نو عدد روایات ذکر کی ہیں۔ ان میں سے صرف دو روایتیں ذکر کرتا ہوں۔

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں شیطان کو انسانی شکل میں رکوع و سجود اور زاری کرتے دیکھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی اس کا ابلیس لعین ہونا معلوم ہوا تو آپ اسے قتل کرنے کے لیے دوڑے' اس نے کہا میں قیامت تک مہلت حاصل کیے ہوئے ہوں' مجھے تم قتل نہیں کر سکتے اور تمہیں تو مجھے قتل کرنا بھی نہیں چاہیے دکیونکہ تمہارا تو خدمت گزار ہوں اور ادنیٰ سپاہی)

مالك تريد قتلي فوالله ما ابغضك احد الا سبقت نطفتي الى رحم امه قبل نطفة ابيه ولقد شاركت مبغضيك في الاموال والاولاد وهو قول الله في محكم كتابه وشاركهم في الاموال والاولاد۔ قال النبي صلى الله عليه وسلم صدق يا علي لا يبغضك من قريش الا سفاحي ولا من الانصار الا يهودي الخ

ترجمہ: تمہیں کیا ہے کہ میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہو بخدا کوئی شخص تم سے بغض نہیں رکھتا مگر میرا نطفہ سبقت لے جا چکا ہوتا ہے' اس کی والدہ کے رحم کی طرف اس کے باپ کے نطفہ سے قبل اور البتہ تحقیق میں حصہ دار ہوں تمہارے ساتھ بغض رکھنے والوں کے مالوں میں اور اولادوں میں اور یہی قول ہے اللہ تعالیٰ کا اپنی محکم کتاب میں اور شریک ہو جا ان کے ساتھ ان کے اموال میں اور اولاد میں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: اے علی! اُس نے سچ کہا ہے نہیں بغض رکھتا تمہارے ساتھ قریش میں سے کوئی مگر زنا سے پیدا ہونے والا اور نہ انصار سے مگر یہودی الخ

فائدہ ۱: اس روایت میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض رکھنے والوں کو اور ان کی اولاد کو بھی شیطان کی اولاد قرار دیا گیا ہے اور اس کے نطفہ سے تخلیق پانے والے کہا گیا ہے اور قبل ازیں معروضِ خدمت ہو چکا کہ اہل السنّت بھی اُن کے نزدیک آپ کے مبغضین میں ہیں اور ان میں سادات کرام بھی ہیں تو ان سب پر کیا فتویٰ عائد ہوگا۔

فائدہ ۲: نیز جب ان کا حال یہ ہے تو اُن کی اولاد سیّد کیسے ہو گئی اور واجب الاکرام کیسے بن گئی؟

فائدہ ۳: علاوہ ازیں اس خدمت کو ذکر کر کے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بچنے کی امید کیسے ہو سکتی تھی اور اس قول سے شیطان ان کے اقدامِ قتل کو غیر موزوں اور نامناسب کیسے قرار دے رہا تھا' بلکہ اس سے تو استحقاقِ قتل میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ بغض رکھنے والوں کی پیدائش کا موجب ہے' لہٰذا اسے قتل کرنا زیادہ ضروری ٹھہرا' لیکن اس نے اس کارستانی کو قتل سے بچاؤ کے لیے پیش کیا ہے ع یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

فائدہ ۴: کئی سنیوں سے شیعہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں' حالانکہ از روئے نصِ قرآن اور تصدیقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب اہلِ بغض کی اولاد میں شیطان حصہ دار ہو جاتا ہے' تو پھر ان سے کوئی شیعہ اور محب و موالی پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر پیدا ہوتے ہیں اور مشاہدہ اس پر گواہ ہے تو ماننا پڑے گی کہ اصل خدمت اس کی یہ تھی' جس کو قتل سے تحفظ کے لیے وسیلہ بنا رہا تھا کہ اہل بغض کی اولاد میں شامل ہو کر ان کی ماہیت بدل دیتا ہوں اور وہ مومن موالی بن کر پیدا ہوتے ہیں' بکر

سوال: یہ ہے کہ جب شیطان خود حضرت امیر علیہ السلام کا دشمن ہے تو پھر اس کے نطفہ سے متولد ہونے والے کیسے محب ہو سکتے ہیں؟

جواب: یہ غلط ہے کہ شیطان حضرت امیر المومنین کا دشمن ہے، بلکہ محب اور نیاز مند ہے، اگر کامل شیعہ نہیں اور مومن و موالی نہیں تو قالی بھی نہیں، بلکہ محبِ صادق ہے اعتبار نہ ہو تو شیخ صدوق کو گواہ پیش کرتا ہوں۔

(۲) عن المسعودی رفعه الی سلمان الفارسی مرابلیس لعنه الله بنفر رالی، فقالوا له فانت من موالیه و شیعته فقال ما انا من موالیه ولا من شیعته ولکنی احبه وما یبغضه احدٌ الا شارکته فی الاموال والولد الخ (ص۵۹)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابلیس لعین کا گزر ایسی جماعت پر ہوا جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان میں تنقیص کر رہے تھے جب اس نے جوابی کارروائی کی تو انہوں نے دریافت کیا کہ آیا تو آپ کے موالی اور شیعہ سے ہے تو اس نے کہا: میں ان کے موالی اور شیعہ سے نہیں ہوں، لیکن مجھے ان سے محبت ضرور ہے اور جو ان سے بُغض رکھتا ہے میں اس کے مال اور اولاد میں حصّہ دار بن جاتا ہوں۔

لہٰذا واضح ہوگیا کہ وہ محب ہے اور صرف تقیہ کرنے والا محب بھی نہیں، بلکہ سرِ محفل حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں تنقیص کرنے والوں کو للکارنے والا محب ہے جس نے اس بھری محفل میں کہا مسؤۃ لکم تسبّون مولاکم علی بن ابی طالب تم پر افسوس کہ تم کتنے بُرے لوگ ہو کہ اپنے مولیٰ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو سبّ و شتم کر رہے ہو۔ جب انہوں نے دریافت کیا کہ تجھے کیا خبر کہ وہ ہمارے مولیٰ ہیں تو اُس نے کہا تمہارے نبی کے اس قول سے من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ اللّٰھمّ وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہٗ جب انہوں نے اس محبِ صادق کی زبانی مزید شان حضرت امیر علیہ السلام کی سننا چاہی تو اس نے کہا: اسمعوا منی معاشر الناکثین والقاسطین والمارقین ہاں مجھ سے ان کی شان سُنو اے عہد کو توڑنے والو! جور و جفا سے کام لینے والو اور اطاعتِ امام سے نکل جانے والو! میں نے بارہ ہزار سال جنّوں میں رہ کر اللہ کی عبادت کی، وہ

ہلاک ہو گئے تو تنہائی سے گھبرا کر بارگاہِ الوہیت میں شکایت کی، اُس نے ملائکہ میں شامل کر دیا تو بارہ ہزار سال پہلے آسمان میں عبادت کی۔ اسی دوران شعاعیں بکھیرتا ضیا پاشیاں کرتا ایک نور ہمارے قریب سے گزرا تو سبھی ملائکہ اس نور کے لئے سجدہ ریز ہو گئے۔ فخرت الملائکة لذالك النور سجدًا اور کہنے لگے سبّوحٌ قدّوسٌ یہ نور ملک مقرّب کا ہے یا نبی مرسل کا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی: ما ھٰذا نورُ ملك مقرّب ولا نبی مُرسل ھٰذا نور طینة علی بن ابی طالب یہ نور کسی مقرّب فرشتہ یا نبی مُرسل کا نہیں، بلکہ یہ علی بن ابی طالب کی طینت اور خمیر کا نور ہے۔

الغرض وہ صرف محب ہی نہیں، بلکہ علانیہ اپنی عقیدت مندی کا اظہار بھی کرتا ہے اور ایسی ایسی شانیں بیان کرتا ہے جو عام محبّوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتیں، تو جو اس کی مشارکت کے بعد پیدا ہوں گے، یقیناً الولد سر لابیه ان میں محبّت کا جوہر موجود ہونا ضروری ہے، بلکہ بقول کسے ع پدر نتواند پسر تمام خواہد کرد ـــ اولاد آباؤ اجداد سے بڑھ جاتی ہے ـ تبھی تو وہ مومن موالی بنتے ہیں، لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم رہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قرآن مجید میں جگہ جگہ انہٗ لکم عدو مبین ۰ اور انّ الشیطٰن للانسان عدو مبین ۰ وغیرہ کہہ کر اسے حضرت آدم علیہ السلام کا اور پوری نسلِ انسانی کا کھلا دشمن قرار دے، مگر شیعہ اس کو محب تسلیم کریں اور قرآن کے برعکس محض اس کی زبان پر اعتماد کرتے ہوئے یہ عقیدہ اپنا لیں اور یہ نہ دیکھیں کہ جو خلیفہ اوّل کا دشمن تھا، وہ اس خلیفہ کا مخلص اور محب کیسے بن گیا؟ کیا اُس خلیفہ کی راہ اُس خلیفہ سے جُدا ہے؟ عجب نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر صورتِ النعانی میں ڈھل کر برسرِ محفل ایسے درس کا کیا معنیٰ اور اس کی محبت کے دعوے مقبول کیونکر ہو گئے ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حق میں شیعہ کی وریدہ دہنی

قاضی نوراللہ شوستری نے عدی بن حاتم کی طرف منسوب کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر اس کی یہ طنز و تشنیع نقل کی ہے ؎

کان ابی من طیی ثم ابو ابی   صحیحین لم ینزع عروقهم القبطا

یعنی میرا باپ قبیلہ طے سے تھا اور میرا دادا بھی دونوں صحیح النسب تھے، کسی قبطی نے ان کی رگوں میں اور شکل وصورت کو اپنی طرف نہیں کھینچا تھا۔

شوستری صاحب نے اس کی تشریح میں کہا: ومخفی نماند کہ قول عدی بن حاتم "صحیحین لم ینزع عروقهم القبطا" تعریض است بعبداللہ زبیر بآنکہ پدر وجداُو عربی قریشی صحیح الاصل نبودہ اند بلکہ از قبط بودہ اند وبزنا تولد نمودند۔ آرے عداوتِ اہلِ بیت ازچنیں ناکسے می آید ولنعم ما قیل ؎

ہر کرا ہست باعلی کینہ   درسخن حاجت درازی نیست
نیست در دستش آستین پدر   دامنِ مادرش نمازی نیست

(مجالس المؤمنین جلد اوّل، صـ۲۴۶)

اور یہ مخفی نہ رہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے اس قول میں کہ میرے والد اور دادا کا نسب صحیح ہے اور قبطی رگیں ان میں شامل نہیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما پر طنز و تشنیع ہے کہ اس کے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ) اور دادا (عوام) یہ صحیح الاصل عربی اور قریشی نہیں تھے، بلکہ قبطی نسل سے ہیں اور زنا سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں ہاں اہل بیت کی عداوت ایسے ہی ناکس اور نالائق لوگوں سے سرزد ہوسکتی ہے اور کیا خوب کہا گیا ہے:

جس کو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کینہ ہے، اس کے ساتھ سخن کو طوالت دینے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے ہاتھ میں باپ کی آستین نہیں ہے، اور اس کی ماں کا دامن پاک نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ کے والد حضرت زبیر بن العوام (رضی اللہ عنہما) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے ہیں، اگر وہ زنا سے پیدا ہوئے، تو یہ جرم کس کا تھا، حضرت زبیر کا یا حضرت صفیہ (رضی اللہ عنہما) کا اور جناب عوام صحیح الاصل نہیں تھے، تو ان کو داماد بنانے والے جناب عبدالمطلب تھے اور بہنوئی بنانے والے جنابِ ابوطالب تو اس انتخاب میں الزام کس پر عائد ہوگا؟

الغرض ہمیں صرف بطورِ مشتے نمونہ از خروارے علامہ ڈھکو صاحب کے اسلاف کا اہل بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وعلیہم وسلم کے ساتھ ادب و نیاز اور ان کے اکرام واحترام کا نمونہ پیش کرنا تھا، اس لیے اس قدر پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ سخن بسیار است۔

ڈھکو صاحب کچھ تو سوچیے، زبانی دعوے تمہارے کیا ہیں؟ اور حقیقی عقیدہ و نظریہ کیا ہے؟ کبھی اتنا تفاوت بھی زبانی اور قلبی عقیدوں میں ہوا کرتا ہے؟

علامہ موصوف نے فرمایا کہ پیغمبرِ اسلام کا فرمان ہے: اکرموا اولادی میری اولاد کی عزّت کرو۔ یہ فرمان بجا اور اس پر عمل بھی لازم، مگر آپ کے ہم مسلک لوگوں کا عمل عرض کیا جاچکا ہے۔ پہلے ان کی اصلاح کرلیں، اس کے بعد دوسروں کو نصیحت کریں۔ نیز یہ حدیث نظر سے گزری، مگر یہ تو نظر نہیں آئی ہوگی: اکرموا اصحابی فانهم خیارکم (مشکوٰۃ شریف ص) "میرے صحابہ کی عزّت کرو، کیونکہ وہ تم سب سے بہتر ہیں" ——— اور دعوا لی اصحابی (انوار نعمانیہ۔ ج۱ ص۱۰۰) "میری خاطر میرے صحابہ کو کچھ نہ کہو اور انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دو"۔

خدا لگتی کہیے یہود و نصاریٰ میں بھی کوئی ایسا بدبخت ہوگا جو اپنے نبی کے اصحاب کے حق میں ایسے کلمات استعمال کرے جو تم نے روا رکھے ہیں اور استعمال کیے ہیں، جن کے اخلاص اور کمالِ ایمان کا اللہ تعالیٰ گواہ ہے اور وہ بار بار ان سے راضی ہونے کے اعلان فرما رہا ہے اور اُس نے ان اصحاب کو غیظِ کفّار اور تسکین و

قرار مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام قرار دیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار، وغیر ذالک من الایات۔

فسق سادات کا اقرار

علامہ صاحب نے کہا کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: میری اولاد کی عزت وتکریم کرو، صالحین کی اللہ تعالیٰ کے لیے اور بدعمل اور راہِ شرع سے عدول کرنے والوں کی میری خاطر۔" مگر اس کو ذکر کرکے اور صحیح مان کر اور مقام استدلال میں بطورِ حجت وبرہان پیش کرکے ڈھکو صاحب نے اپنے مذہب کا صفایا کر دیا ہے، کیونکہ سادات تمام کے تمام اہل بیت کرام ہیں اور اہل بیت کرام تو سبھی پاک ومطہر ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا۔ اگر ان کو اہل بیت سے نکالو، تب بھی ان پر ظلم اور ان کو اہل بیت میں داخل مان کر پاک، طیب وطاہر اور معصوم نہ مانو تو اپنی جان اور مذہب پر ظلم۔ علامہ صاحب یہی آیت پڑھ پڑھ کر تم لوگوں نے ان شاہزادوں کو باور کرایا کہ گناہ سیدزادوں کے ٹخنوں کو بھی نہیں چھو سکتے، بلکہ ان کے جوتوں سے بھی نیچے رہ جاتے ہیں، لہٰذا جی بھر کر دادِ عیش دے لو اور جب غلط راہ پر ڈال چکے تو اب ان کو طالح اور فساق وفجار قرار دے رہے ہو۔ آخر آلِ رسول کے ساتھ اس ظلم وتعدی اور جور وجفا کا کیا جواز تھا؟ روزِ اول سے ہی انہیں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کیوں نہ سنایا اور بتلایا: اِنَّا جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ ہم نے تمہیں قبائل اور شعوب میں تقسیم صرف اس لیے کیا ہے کہ تم میں باہم تعارف اور پہچان ہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت وکرامت اسی کے لیے ہے اور سب سے بڑا مرتبہ ومقام اسی کا ہے جو سب سے زیادہ متقی وپرہیزگار ہے۔ اور انہیں یہ بھی بتلا دیا ہوتا کہ راہِ نبوت سے انحراف اور عدول حقیقت میں آلِ رسول اور اہل بیت کرام سے نکال دیتا ہے۔ گو نسبی تعلق قائم رہتا ہے، مگر روحانی اور قلبی

رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور دراصل فلاح ونجات اور اخروی عزت وکرامت کا دارومدار اسی تعلق پر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ۔ "اے نوح! تمہارا بیٹا، تمہاری اہل میں سے نہیں کیونکہ اس کے عمل درست نہیں ہیں۔"

اور آیت تطہیر کا مطلب بھی انہیں سمجھایا ہوتا کہ اہل بیت کرام پر خصوصی پابندیاں عائد کرکے اور عام امتیوں سے زیادہ تغلیظ وتشدید فرما کر اللہ تعالیٰ انہیں ان مجاہدات وریاضات کے ذریعے امتیازی مقام اور مرتبہ تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے نہ یہ کہ اس نے آلِ رسول کہلانے والوں کو برائیوں اور بداعمالیوں کی رخصت دے دی ہے کہ جو چاہو کرو، اب تم پلید نہیں ہو سکتے۔ العیاذ باللہ! یہ تو قانونِ قدرت، آئینِ فطرت اور شعائرِ اسلام کی تضحیک ہے، کیونکہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی!
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبالؒ)

بہرکیف چودھویں پندرھویں صدی میں ہی سہی، مگر حق کا اعتراف واقرار کرنا ہی پڑ گیا کہ سادات کرام کی تطہیر کا دارومدار صحیح عقائد اور صالح اعمال کے اپنانے پر ہی ہے نہ کہ محض اس عالی نسب پر، اگر شیعی علماء پہلے ہی یہ وضاحت کر دیتے تو ہو سکتا ہے بہتیرے سادات کا بھلا ہو جاتا اور وہ بھی عقائد صحیحہ اور اعمالِ صالحہ اپنا کر ظاہر وباطن کی طہارت حاصل کرتے اور نورٌ علیٰ نور بن جاتے اور قرآن مجید کا عملی نمونہ بن کر ہدایتِ خلق کے موجب بن جاتے ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا (اقبالؒ)

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت

علامہ موصوف کو حضرت شیخ الاسلام پر اعتراض کرتے وقت تو یاد آ گیا کہ اولاد

رسول کا اکرام واجب ہے، اگرچہ بدکار ہی کیوں نہ ہوں، مگر جب اپنے مذہب پر زد پڑتی نظر آتے، تو پھر اولادِ رسول خواہ صالح ہی کیوں نہ ہو، ان کی عزت و توقیر کی ضرورت نہیں رہتی جیسے کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ سُنّی العقیدہ سادات کو حلالی تسلیم نہیں کرتے، انہیں ابلیس کی اولاد قرار دیتے ہیں اور کتوں سے بھی بدتر تسلیم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب مزید حوالہ جات سماعت فرمائیں تاکہ پاکیٔ داماں کی حقیقت کھل جائے۔

۱۔ حسنی سادات نے امامت کا دعویٰ کیا اور اس کو حسینی حضرات میں محدود ماننے سے انکار کیا تو شیعہ اکابران کے اس اقدام کو حسد قرار دیتے ہیں، حالانکہ حسد ان کے نزدیک اصولِ کفر سے ہے۔ ملاحظہ ہو احتجاج طبرسی ص۳۷۴ مطبع جدید۔

فقيل له (لابي عبد الله) بنو الحسن لا يعرفون لمن الحق؟ قال بلىٰ ولكن يحملهم الحسد۔ حضرت ابو عبداللہ سے عرض کیا گیا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد نہیں جانتی کہ امامت کن کا حق ہے؟ تو آپ نے فرمایا کیوں نہیں، لیکن حسد دعوائے امامت پر برانگیختہ کرتا ہے۔

۲۔ حضرت حسن مثنّیٰ بن امام حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا: فقال هو والله أولىٰ باليهودية منكما ان اليهودي من شرب الخمر۔

امام ابو عبداللہ نے فرمایا کہ حسن مثنّیٰ تم دونوں (ابو یعقوب اور یعلی بن خنیس) کی نسبت یہودی ہونے کے زیادہ لائق ہے کیونکہ یہودی وہ ہے جو شراب پیے۔

اور اس سے بھی ترقی کرتے ہوئے کہا گیا ہے: لو توفي الحسن بن الحسن على الزنا والربا وشرب الخمر كان خيرا له مما توفي عليه۔ احتجاج ص۳۷۵

"یعنی اگر حسن مثنّیٰ زناکاری، سود خوری اور شراب خوری کی حالت میں مرتے تو وہ حالت اس سے بہتر ہوتی جس پر وہ اب مرے ہیں۔ گویا ان کبائر سے بھی بڑے گناہ پر بلا توبہ مر گئے ہیں" ـــــ کیسے ڈھکو صاحب! ان اقوال میں تو ان حسنی سادات کی بے ادبی نہیں اور احترام کا کما حقہٗ لحاظ رکھا گیا ہے نا؟

۳۔ امام جعفر صادق کی صادق کے لقب سے ملقب کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے احتجاج طبرسی ص۳۱۸ پر کہا ہے کہ ان کی اولاد میں پانچویں پشت میں جعفر کذّاب پیدا ہوگا جو از روئے کذب و افترا امامت کا دعویٰ کرے گا، پس وہ عنداللہ جعفر کذّاب اور مفتری ہوگا۔ اپنے باپ کا مخالف اور اپنے بھائی سے حسد کرنے والا ہوگا۔ یعنی امام مہدی کے چچا اور حضرت حسن عسکری کے بھائی جعفر کذّاب و مفتری ہیں اور حاسد کیونکہ انہوں نے امامت کا دعویٰ کیا تھا اور حکومتِ وقت سے تحقیق کروا کر ثابت کر دیا تھا کہ حضرت حسن عسکری کی کوئی اولاد نہیں۔ لہذا میں ان کے مال کا بھی اور منصبِ امامت کا بھی وارث ہوں، لہذا شیعی شریعت میں اس حسینی سید کے اکرام و احترام کا فریضہ ان القابات سے ادا کیا گیا ہے۔

۴۔ شیعہ تمام بنو ہاشم کو حاسد اور حضرت علی کی امامت کا منکر تسلیم کرتے ہیں اور ہاشمیوں میں دیگر اہل بیت کے علاوہ حسنی اور حسینی سادات بھی داخل ہیں۔ احتجاج طبرسی ص۳۹۸ پر مرقوم ہے کہ جب مامون نے حضرت علی رضا کو خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا تو بنو ہاشم کو جمع کر کے کہا: انی اريد ان استعمل الرضا علىٰ هٰذا الامر من بعدي فحسده بنو هاشم وقالوا أتولي رجلا جاهلا ليس له بصر بتدبير الخلافة؟

"میں ارادہ رکھتا ہوں کہ حضرت رضا کو اپنے بعد خلافت کا منصب سونپ دوں تو بنو ہاشم نے ان سے حسد کیا اور کہا کیا تو ایسے جاہل کو ولی امر بناتا ہے جس کو امورِ خلافت کے اندر کوئی بصیرت اور واقفیت نہیں ہے۔ الخ

حالانکہ حسد اصول و ارکانِ کفر سے ہے اور امام برحق کی امامت کا انکار عین کفر ہے اور قیامت کے دن روسیاہی کا موجب ہے۔ اصولِ کافی جلد دوم ص۲۸۹ پر مرقوم ہے:

قال ابو عبد الله عليه السلام اصول الكفر ثلاثة الحرص والاستكبار والحسد۔ کفر کے اصول تین ہیں: حرص، تکبر اور حسد ـــــ اور انکارِ امامت کے متعلق اصولِ کافی جلد اول ص۳۷۲ پر مرقوم ہے کہ سودہ بن کلیب نے امام جعفر صادق سے دریافت کیا کہ اس آیتِ کریمہ کا مطلب کیا ہے؟ ويوم القيامة ترى الذين كذبوا على الله وجوههم مسودة (قیامت کے دن دیکھو گے جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے) تو آپ نے فرمایا: من قال انی امام وليس

یا مام قلت وان کان علویا؟ وان کان علویا الخ" ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہیں ہم امام ہیں، حالانکہ وہ امام نہیں۔ ابن کلیب نے کہا اگرچہ وہ اولادِ علی میں سے ہی ہوں۔ تو آپ نے فرمایا ہاں اگرچہ اولادِ علی میں سے ہی ہوں" اور دوسری روایت میں ہے: وان کان فاطمیا علویا؟ قال وان کان فاطمیا علویا۔ اگرچہ وہ حضرت زہرا اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی اولاد سے ہی ہوں، تو فرمایا ہاں اگرچہ فاطمی علوی ہی کیوں نہ ہوں" اور ایک روایت میں ہے: عن ابی عبد اللہ علیہ السلام من ادعی الامامة ولیس من اھلھا فھو کافر جو فی الواقع امام نہ ہو اور امامت کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے۔

تو ان روایات کے مطابق حسنی اور حسینی سادات جنہوں نے امامت کا دعویٰ کیا، شیعہ مذہب میں ان کو روسیاہ اور کافر ماننا لازم ٹھہرا اور تمام حسنی سادات اور ہاشمیوں میں حسد میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کفر کا اہم رکن اور اصل الاصول تسلیم کرنا لازم ٹھہرا، مگر مجال ہے شیعہ کے ہاں ان کے احترام واکرام میں فرق آئے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم جو ٹھہرا "اکرموا اولادی" لعنت بریں عقیدہ باد ـــــ نیز کیا اولاد میں بناتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم داخل نہیں، مگر شیعہ نے ان میں سے تین کے بناتِ رسول ہونے کا ہی انکار کر دیا، حالانکہ وہ بیٹیاں نہ ہوتیں اور انہیں بناتِ رسول کہہ دیا جاتا تو حرج نہیں تھا، کیونکہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اُمّت کے رُوحانی باپ ہیں، مگر بیٹیاں ہونے کے باوجود ان کی اولادِ رسول ہونے کا انکار ان پر بھی ظلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر بھی ظلم اور بہتان اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توہین و تحقیر

تمّت بالخیر ھٰذا ما تیسر لھٰذا العبد الضعیف بحول اللہ وقوّتہ فی رد رسالة "تنزیہ الامامیة" ودفع تلبیسات مؤلفہ وقد وقع الفراغ من تسوید ھذہ الاوراق فی الساعة العاشرہ من لیلة الخمیس ثانی محرم الحرام ۱۴۰۷ھ وقد شرعت فی تالیف ھٰذہ التحفة الثمینة العظیمة صباح الیوم الاربعاء ثالث عشر من الشوال ۱۴۰۶ھ فالحمد للہ علیٰ احسانہ و امتنانہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وازواجہ امہات المومنین واولیاء الکاملین والواصلین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین